جرم و سزا

انسپکٹر نواز خان کی جرم و سزا پر مبنی تفتیشی کہانیاں
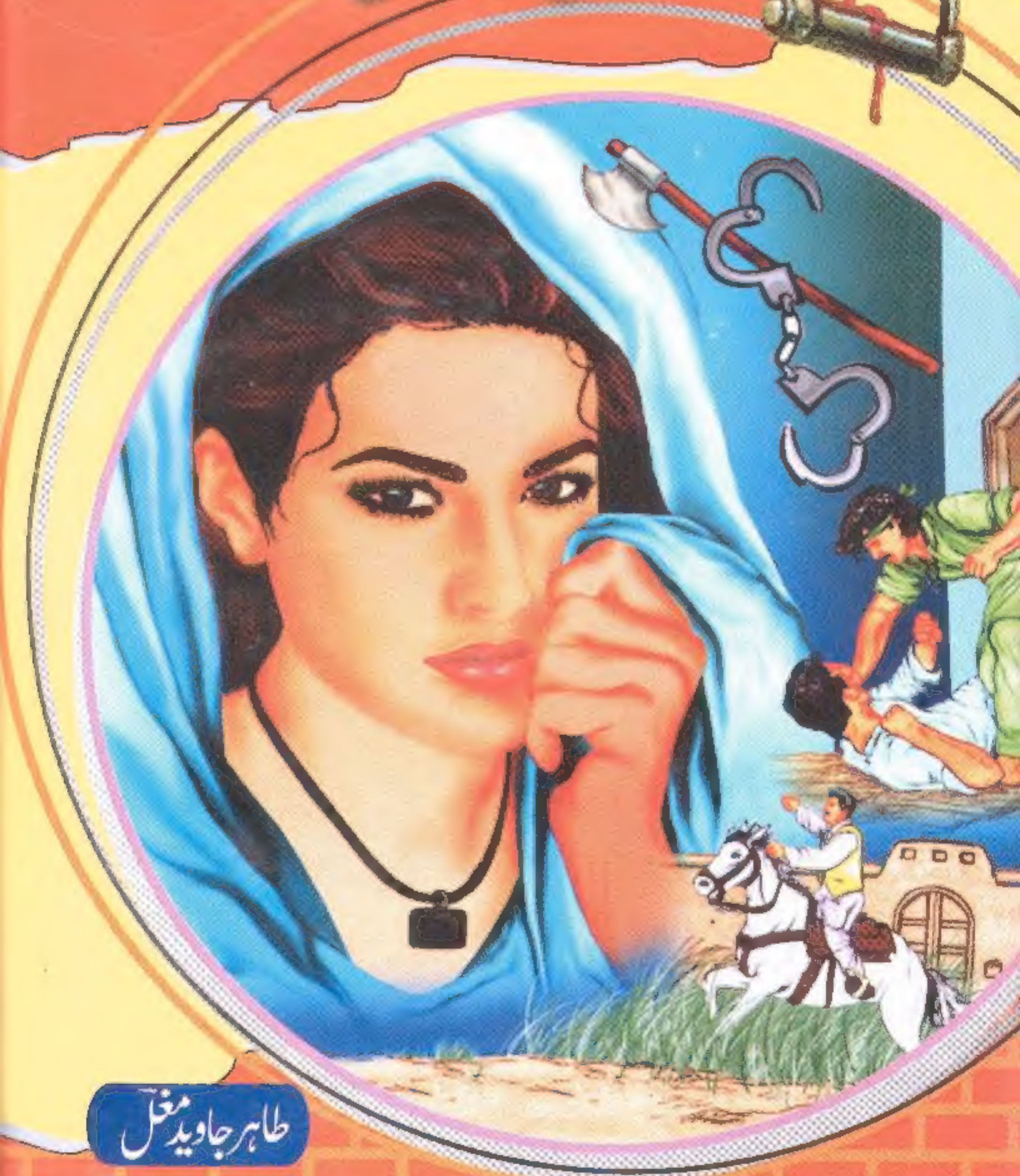
قانون، جنگل اور عورت

طاہر جاوید مغل

قانون جنگل اور عورت

طاہر جاوید مغل

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔فون: ۷۲۲۴۷۴۱۴

بار اول ـــــ ۲۰۱۰ء
مطبع ـــــ یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ـــــ عاطف رحمٰن۔ لاہور
قیمت ـــــ ۲۰۰ روپے

اسٹاکسٹ
علی بُک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

فہرست

قانون، جنگل اور عورت

قانون جب ایک مظلوم عورت کی خاطر جنگل میں داخل ہوا تو انسانوں کے قانون اور جنگل کے قانون میں تصادم ہو گیا۔
انسپکٹر نواز خان کو صرف قانون کی بالا دستی ہی قائم نہیں کرنا تھی بلکہ ایک موذی دشمن سے اپنی جان بھی بچانی تھی۔

آیئے پھر ڈاکوؤں کی بستی چلتے ہیں۔ یہ اس خاص ماحول اور علاقے کی کہانی ہے جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ یہ علاقہ چوروں، ڈاکوؤں اور پیشہ ور قاتلوں کا گڑھ تھا۔ سہارنپور تھانے کے دروازے پر ہر روز کوئی نہ کوئی کہانی دستک دیتی تھی۔ بلال شاہ ان دنوں میرے ساتھ تھا۔ وہ رات کے وقت عموماً میرے لئے کھانا لے کر آیا کرتا تھا۔ اس رات میں کافی دیر انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہیں آیا۔ سردیوں کا موسم تھا شاید دسمبر کا مہینہ رہا ہوگا۔ میں اپنے کمرے میں تنہا لیٹا کوئی دس بجے تک اس کا انتظار کرتا رہا پھر میری آنکھ لگ گئی۔ کمرے کا بیرونی دروازہ کھلا تھا۔ نہ جانے کس وقت بلال شاہ آیا اور مجھے جھنجھوڑ کر جگانے لگا۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ بلال شاہ کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ میں نے اس سے وقت پوچھا تو وہ بتانے لگا کہ صبح ہونے میں کچھ دیر باقی ہے۔ اس نے یہ بات ازراہِ مذاق کہی تھی لیکن یہ حقیقت تھی کہ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔

میں نے کہا۔ ''بلال شاہ، اس وقت کھانا لے کر آیا کرو گے تو پھر میں صبح ہی کھا لیا کروں گا۔''

بلال شاہ نے جھک کر میرے سامنے ٹرے رکھ دی، وہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی اہم واقعہ رُونما ہوا ہے۔ ٹرے میں تھوڑے سے خالی شوربے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

''کیا ہوا بلال شاہ؟'' میں نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

بلال شاہ کے پاس مجھے سنانے کے لئے دو اہم واقعات تھے۔ ایک سنجیدہ اور دوسرا قدرے مزاحیہ۔ تو ترتیب کے لحاظ سے پہلے سنجیدہ واقعہ سن لیجئے۔

ساڑھے آٹھ نو بجے کے قریب جب بلال شاہ میرے لئے کھانا لا رہا تھا۔ راستے میں

ایک شخص کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ یہ شخص کھیتوں میں کچھ پُراسرار انداز سے بیٹھا تھا۔ بلال شاہ کو جستجو ہوئی اور وہ اس کے قریب چلا گیا۔ وہ سہارنپور کے پٹواری کا بیٹا تھا اور کھالے کے کنارے بیٹھا اپنی قمیص دھو رہا تھا۔ (کھالا پانی کی اس نالی کو کہتے ہیں جو کنویں کا پانی کھیتوں تک لے جاتی ہے) بلال شاہ اگو نامی اس نوجوان کو دیکھ کر مشکوک سا ہو گیا۔ اتنے اندھیرے میں کھالے کے کنارے کپڑے دھونے سے اس کا کیا مقصد تھا۔ اگر وہ کچھ دھونا ہی چاہتا تھا تو کنویں پر جا سکتا تھا۔ یوں بھی اس نوجوان کا چال چلن کچھ درست نہیں تھا۔ وہ خاصا بددماغ اور ہتھ چھٹ مشہور تھا۔ بلال شاہ نے دعا سلام کے بعد وہاں سے کھسک جانا ہی مناسب سمجھا کیونکہ وہ اپنی لالٹین کی روشنی میں دیکھ چکا تھا کہ اگو ایک خون آلودہ قمیص دھونے میں مصروف ہے۔ بلال شاہ کو دیکھ کر اگو کا گھبرانا اور پھر قمیص کو چھپانے کی کوشش کرنا، ایسی باتیں نہیں تھیں جو آسانی سے نظرانداز کی جا سکتیں۔ مجھے بلال شاہ کی عقل مندی پر تھوڑا سا تعجب بھی ہوا۔ اس کا جلدی سے وہاں سے نکل آنا درست فیصلہ تھا۔ اگر اگو نے واقعی کوئی غیر قانونی کام کیا تھا تو اپنا پول کھلنے کے خوف سے وہ اس جگہ تنہا بلال شاہ کو نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔ بلال شاہ نے سوچا تھا کہ یہاں پہنچ کر فوراً مجھے اس واقعے سے آگاہ کرے گا، لیکن یہاں سے دوسرا واقعہ شروع ہوا جسے میں نے مزاحیہ بتایا ہے اور جس کی وجہ سے بلال شاہ کو میرے تک پہنچنے میں اتنی دیر لگی۔

ہوا یوں کہ بلال شاہ جب گھر سے کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا تو ایک کتے نے اسے گھیر لیا۔ یہ جگہ قصبے کے جوہڑ اور مسجد کے درمیان واقعہ تھی۔ دونوں طرف اونچی اونچی گھاس تھی۔ درمیان میں راستہ سا بنا ہوا تھا۔ رات کے وقت یہاں آمدورفت نہ ہونے کے برابر ہوتی تھی اور اس رات تو خاص طور پر بڑی سردی تھی۔ بلال شاہ جب اس راستے کے عین درمیان پہنچا تو ایک دیوہیکل کتے نے اسے خوش آمدید کہا۔ یہ آوارہ کتا نہ جانے کہاں سے چہل قدمی کرتا آدھمکا تھا۔ بلال شاہ کو دیکھ کر وہ غرایا۔ اس سے آگے کا ذکر بلال شاہ سے سنیئے۔

''جب میں نے کتے کی بُری نیت دیکھی تو فوراً نیچے بیٹھ گیا۔ سیانے لوگ کہتے ہیں کہ کتا دیکھ کر غرائے تو فوراً نیچے بیٹھ جاؤ...... اور واقعی سچ کہتے ہیں اگر میں بیٹھ نہ جاتا تو کتا ضرور میری ٹانگ کو چکھتا۔ میں بیٹھ گیا اور کتا میرے سامنے کھڑا دُم ہلاتا رہا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں مسلسل مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے سوچا ابھی چلا جائے گا، لیکن وہ بھی شاید سارے کاموں سے فارغ ہو کر آیا تھا۔ اطمینان سے میرے سامنے بیٹھ گیا جیسے کہہ رہا ہو ایسے تو ایسے

ہی سہی۔ سردی میں میرا جسم اکڑا جا رہا تھا، لیکن جونہی میں اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کرتا کتا بھی کھڑا ہو کر دُم ہلانے لگتا۔ وہ ایک دو قدم میری طرف بڑھتا اور میں پھر بیٹھ جاتا۔ (اس سے پہلے بھی میرے ایک جاننے والے کے ساتھ اس طرح کا واقعہ پیش آیا تھا) میں نے بڑی دعائیں مانگیں کہ کوئی خدا کا بندہ ڈنڈے لاٹھی سمیت اِدھر آ نکلے اور اس مصیبت سے میری جان چھڑائے یا کوئی آوارہ کتا ہی اس طرف آ جائے جسے دیکھ کر یہ موذی اپنی جگہ سے ہلے، لیکن کوئی دعا قبول نہیں ہوئی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر تھوڑی دیر اور اسی طرح بیٹھا رہا تو اکڑ کر مر جاؤں گا۔ پھر ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی میں نے آپ کے کھانے میں سے ایک روٹی نکال کر کتے کی طرف پھینکی۔ وہ دو لقموں میں روٹی کھا گیا۔ یہ دیکھ کر میں نے ایک ساتھ دو روٹیاں اس کی طرف پھینکیں اور جب وہ کھانے لگا میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا، لیکن ابھی چند قدم ہی گیا ہوں گا کہ وہ میری طرف لپکا۔ مجبوراً میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس دفعہ سالن میں سے بوٹیاں نکال کر اسے رشوت دی، لیکن وہ یہ رشوت بھی ہضم کر گیا اور ٹلا پھر بھی نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''قصہ مختصر کرو، آخر اس کا انجام کیا ہوا؟''

بلال شاہ نے ایک سرد آہ بھری اور تب میں نے دیکھا کہ اس نے تہبند کی جگہ گرم اونی چادر باندھ رکھی ہے۔ وہ خجالت سے ہنسا اور پھر میرے پاس بیٹھتا ہوا بولا۔

''چوہدری صاحب! وہ ظالم میری دھوتی کھینچ کھینچ کر مجھے اٹھاتا رہا۔ مجبوراً میں نے دھوتی کھول کر اس کے حوالے کر دی۔ پھر زمین پر بیٹھے بیٹھے میں آگے کو کھسکنے لگا اور کھیت میں گھس کر دوسری طرف نکل گیا۔''

میں نے بلال شاہ کو کئی دفعہ کہا تھا کہ اس طرف سے نہ آیا کرے، لیکن وہ مانتا نہیں تھا۔ یہی بات آج اسے شرمندہ کر رہی تھی۔ بہر حال سوچنے کی بات یہ تھی کہ نورے پٹواری کا بیٹا اگو اگر واقعی اپنی خون آلودہ قمیص دھو رہا تھا تو اس نے کیا گل کھلایا تھا۔ اگر اس نے کسی کو قتل یا زخمی کیا تھا اور یہ واقعہ سہارنپور یا اردگرد کے کسی گاؤں میں ہوا تھا تو صبح تک اس کی خبر ہونا لازمی تھی، لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ لالٹین کی مدھم روشنی میں بلال شاہ کو صرف شبہ ہی ہوا ہو۔ اطلاع اہم ضرور تھی لیکن ایسی بھی نہیں تھی کہ میں اسی وقت وردی پہن کر اکرم عرف اگو کو ڈھونڈنے چل پڑتا۔ بلال شاہ کے واپس جانے کے بعد میں کافی دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا۔ عموماً پولیس والے خواہ مخواہ کی مصیبت مول نہیں لیا کرتے۔ بعض اوقات تو وہ اپنے علاقے میں ہونے والے نہایت سنگین قسم کے واقعات سے بھی جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن میں اپنے آپ کو کبھی ایسی ''چشم پوشی'' پر آمادہ نہیں کر سکا۔ یوں بھی ان دنوں میں

کچھ زیادہ مصروف نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر میں مصروف ہوتا تو بلال شاہ کو نظر انداز کر دیتا۔ ہاں ایسا ہو سکتا تھا کہ میں خود اس معاملے پر اتنی توجہ نہ دیتا جتنی میں نے دی۔

رات تو سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی، لیکن صبح مجھے اس بات سے فکر لاحق ہوئی کہ رات بلال شاہ کو اکیلے واپس نہیں جانا چاہئے تھا۔ اگر اگو مجرم تھا اور وہ اس کی طرف سے مشکوک ہو گیا تھا تو عین ممکن تھا وہ بلال شاہ کے گھر پہنچتا اور صبح بلال شاہ کی گردن کٹی ہوئی ملتی۔ میں نے تصور میں بلال شاہ کی بیوی کو اس کی لاش پر بین کرتے دیکھا۔ ''چھوٹے کے ابا۔ تجھے کہا تھا یہ کام چھوڑ دے۔ اب کون تیرے سات بچوں کا سہارا بنے گا۔'' ذہن کہیں سے کہیں بھٹک رہا تھا۔ میں نے سر جھٹکا اور جلدی جلدی تھانے پہنچنے کی تیاری کرنے لگا۔

جس وقت میں تھانے میں داخل ہوا، بلال شاہ میرے کمرے کے سامنے بیٹھا کوئی دو گز لمبا گنا چوس رہا تھا۔ چاروں طرف چھلکے بکھرے پڑے تھے۔ اس کا بھگیاڑ جیسا منہ دھوپ کی تمازت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ میں نے کمرہ کھلوایا اور جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ دو عدد سنتری بمعہ ایک کانسٹیبل کے نورے پٹواری کے گھر بھیجے۔ قریباً دس بجے وہ اکرم عرف اگو کو تھانے لے آئے۔ وہ مضبوط جسم کا چھبیس ستائیس سالہ نوجوان تھا۔ رنگ گندمی اور چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ اس کا چہرہ اس کی پریشانی کی چغلی کھا رہا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لئے کرسی دی۔

''چوہدری صاحب، خیریت تو ہے؟'' وہ لرزاں آواز میں بولا۔

''ہاں اگو خیریت ہی ہے۔'' میں نے اس کے سراپا کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ پھر اچانک میری نظر ایک جگہ پر پڑی اور جم کر رہ گئی۔ میں نے اطمینان سے کہا۔ ''اگو تو نے قمیص تو شاید بدل لی ہے، لیکن بنیان وہی ہے جو تو کل پہنے ہوئے تھا۔''

''کیا مطلب جی؟'' وہ شدید گھبراہٹ میں بولا۔ اس کا لہجہ مجھے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔

میں نے اس کے کھلے گریبان کو انگلی سے تھوڑا سا اور کھولا۔ قمیص کے نیچے سے اس کی میلی کچیلی بنیان جھانک رہی تھی۔ اس کے گلے کے قریب ہلکا سا سرخ دھبہ نظر آ رہا تھا۔ ''ذرا یہ قمیص اُتارو۔'' میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ کچھ پس و پیش کے بعد اگو نے قمیص اُتار دی۔ بنیان پر تین چار جگہ ایسے ہی دھبے نظر آ رہے تھے۔ دیکھا گیا ہے کہ اگر قمیص پر کسی گیلی شے سے داغ پڑ جائے تو اس کا اثر نیچے پہنے ہوئے کپڑے پر بھی ہوتا ہے۔ اگو کے ساتھ بھی یہ کچھ ہوا تھا۔ اس کی قمیص کے دھبے بنیان پر منتقل ہوئے تھے اور یہ بنیان چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ

اگو سے کوئی جرم سرزد ہوا ہے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بھئی، اب تم کیا چاہتے ہو؟''

اگو ہراساں لہجے میں بولا۔ ''چوہدری صاحب! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ لگتا ہے بلال شاہ نے آپ کو کوئی غلط اطلاع دی ہے۔ اس نے رات مجھے کھالے پر کپڑے دھوتے دیکھا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''تم خود ہی تسلیم کر رہے ہو کہ مجھے ملنے والی اطلاع غلط نہیں تھی۔''

اگو بولا۔ ''چوہدری صاحب، کھالے پر بیٹھ کر کپڑے دھونا کوئی جرم تو نہیں ہے اور اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں نے کسی کا خون کر دیا ہے تو آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہ خون...... یہ خون کسی بندے کا نہیں۔''

''تو کس کا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اگو اعتماد سے بولا۔ ''جناب میں نے ایک بکری ذبح کی تھی۔ وہ بیمار تھی۔ مالک نے کہا ذرا چھری پھیر دو۔ میں نے چھری پھیر دی۔ اس کا خون اچھل کر میرے کپڑوں پر گرا۔''

''بہت خوب۔'' میں نے کہا۔ ''بہانہ اچھا ہے، لیکن تمہارا کیا خیال ہے میں تمہارا شکریہ ادا کر کے جانے کی اجازت دے دوں گا...... سب سے پہلے تو تمہیں یہ بتانا ہو گا کہ وہ ذبح شدہ بکری کس کی تھی اور کہاں ہے؟ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔''

اگو بولا۔ ''چوہدری صاحب میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں...... ماسٹر کرم دین اپنی بیٹھک میں قصہ یوسف زلیخا پڑھتے ہیں۔ ہم تین چار دوست روز سننے جاتے ہیں۔ قصہ سن کر میں واپس آ رہا تھا کہ کھیتوں میں ایک آدمی بیٹھا نظر آیا۔ میں نے قریب پہنچ کر دیکھا۔ وہ کوئی مسافر تھا۔ اس کی گٹھڑی قریب ہی پڑی تھی۔ زمین پر ایک بیمار بکری لیٹی تھی۔ مسافر نے بتایا کہ وہ دور سے آ رہا ہے۔ راستے میں بکری نے کچھ کھا لیا ہے۔ امید نہیں کہ بچے گی اگر ہو سکے تو اسے ذبح کر دو......''

''اور تم نے اسے ذبح کر دیا۔'' میں نے بات کاٹ کر کہا۔ ''پھر تم کہو گے کہ مسافر ذبح شدہ بکری کندھے پر لاد کر آگے روانہ ہو گیا اور تم کھالے پر کپڑے دھونے بیٹھ گئے...... اچھی کہانی ہے اور مجھے پہلے سے پتہ تھا کوئی کہانی تمہارے دماغ میں کلبلا رہی ہے اسی لئے میں نے کہا تھا کہ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔''

''کیا مطلب؟'' اگو خوفزدہ ہو کر بولا۔

''مطلب یہ کہ اپنی یہ بنیان اُتار کر تم میرے حوالے کر دو......''

میرے کہنے پر اکو نے بمشکل بنیان اتاری۔ میں نے کانسٹیبل کو اسے حوالات میں بند کرنے کا حکم دیا تو وہ چیخنے چلانے لگا لیکن تھانوں میں ایسی چیخ و پکار کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اس کے جانے کے بعد میرا اسب انسپکٹر کہنے لگا۔

"نواز صاحب! مجھے تو اس معاملے میں کوئی جان نظر نہیں آتی۔ آپ خواہ مخواہ تفتیش کے چکر میں پڑ رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "فرزند علی! تمہارا مطلب ہے کہ ہوسکتا ہے اکو نے واقعی بکری ہی ذبح کی ہو، لیکن میں اتنا بے وقوف نہیں کہ اس کی بات پر یقین کرلوں۔ بکری ذبح ہونے سے پہلے تڑپتی ضرور ہے لیکن ہاتھا پائی نہیں کرتی اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اکو کی کل کسی سے زبردست ہاتھا پائی ہوئی ہے اور عین ممکن ہے یہ ہاتھا پائی مقتول سے ہی ہوئی ہو...... اکو کے جسم پر کئی جگہ تازہ خراشیں ہیں اور اگر میں غلط اندازہ نہیں لگا رہا تو اس کا بایاں کندھا اُترا ہوا ہے یا اس میں سخت موچ ہے۔ تم نے دیکھا تھا اس نے قمیص کتنی مشکل سے اتاری تھی؟"

فرزند علی کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ پھر وہ تو اکو کا کندھا چیک کرنے چل دیا اور میں سوچنے لگا کہ ملزم کے لواحقین سے کس طرح نبٹا جائے۔

☆======☆======☆

مجھے امید تھی کہ شام سے پہلے پہلے کسی واردات کی خبر آجائے گی اور اکو کی خون آلود بنیان کا معمہ حل ہوجائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ مجبوراً مجھے اکو کو شخصی ضمانتوں پر رہا کرنا پڑا۔ شاید رہا نہ ہی کرتا لیکن قصبے کا ایک بااثر زمیندار نورے پٹواری اور اس کے بیٹے کی حمایت کررہا تھا۔ اس زمیندار کا نام محبت علی تھا۔ زمیندار کے لفظ سے ایک بھاری بھرکم اور ادھیڑ عمر شخصیت ذہن میں آتی ہے لیکن محبت علی اس کے برعکس ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ عموماً سفید کُرتے اور تہبند میں ملبوس رہتا تھا، معمولی پڑھا لکھا بھی تھا۔ سیاہ چمک دار بالوں اور نوک دار مونچھوں نے جہاں اس کی وجاہت میں اضافہ کیا تھا وہاں اس کے چہرے کو بارعب بھی بنا دیا تھا۔ قصبے کے نواح میں اس کی وسیع حویلی تھی۔ سینکڑوں مزارعے اور ملازم تھے۔ اکرم عرف اکو بھی اس کے خاص آدمیوں میں شمار ہوتا تھا۔ چھوڑنے کو تو میں نے اکو کو چھوڑ دیا تھا، لیکن خون آلود بنیان ابھی میرے پاس ہی تھی۔ میں اتنی جلدی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اکو سے میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی لیکن اس نے اگر کوئی جرم کیا تھا تو اس کا پتہ چلنا ضروری تھا۔ عین ممکن ہے اس نے کسی کا خون ہی کردیا ہو۔ مقتول کے ورثاء ملزموں کے اثر ورسوخ کی وجہ سے خاموش ہو کر بیٹھ رہے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لاش غائب کردی گئی ہو اور لواحقین کو ابھی

پتہ ہی نہ چلا ہو۔ بہت سے امکانات تھے۔ دیکھا جائے تو یہ عام ڈگر سے قدرے ہٹا ہوا کیس تھا۔ عموماً جرم کا پتہ پہلے چل جاتا ہے اور پولیس کو مجرم تلاش کرنا ہوتا ہے، لیکن یہاں مجرم مل گیا تھا اور میرا شک مجھے جرم ڈھونڈنے پر مجبور کررہا تھا۔

دو تین دن کے انتظار کے بعد میرے پاس واحد راستہ یہی رہ گیا تھا کہ خون آلود بنیان کا لیبارٹری ٹیسٹ کرانے کی کوشش کروں۔ ان دنوں یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ یوں بھی سہارنپور ایک دور دراز تھانہ تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح میں نے یہ بنیان شہر پہنچادی۔ اس بنیان کی رپورٹ ٹھیک دسویں روز تھانے پہنچی۔ اس میں میرے شک کی تصدیق ہوئی تھی۔ کپڑے پر پائے جانے والے خون کے دھبے کسی بکری کے نہیں انسان کے تھے۔ یہ ایک نہایت اہم رپورٹ تھی لیکن اس رپورٹ کے ملنے سے چودہ گھنٹے قبل ہی میں ملزم اکرم کو دوبارہ گرفتار کرچکا تھا۔ اس گرفتاری کی وجہ وہ لاش تھی جو قصبے کے نواح سے ملی تھی۔ یہ غیر آباد زمین تھی۔ خشک نالے کے ساتھ دور تک جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

انہی جھاڑیوں میں ایک مسخ شدہ انسانی لاش ملی تھی۔ چار پانچ روز سے ان جھاڑیوں پر کوّے گدھ وغیرہ منڈلا رہے تھے۔ اس طرف بہت کم کسی کا جانا ہوتا تھا۔ پہلے تو لوگ یہی سمجھتے رہے کہ کوئی کتا یا گیدڑ یا پالتو جانور مرا پڑا ہوگا۔ پھر ایک روز قصبے کے کچھ لڑکے کھیلتے کودتے اُدھر جا نکلے۔ انہوں نے آکر بتایا کہ نالے کے کنارے جھاڑیوں میں ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔

اس لاش کو دیکھنا ایک پُر کراہت عمل تھا خدا ہر نظر کو ایسے بدنظاروں سے محروم رکھے۔ قصہ مختصر کوؤں چیلوں نے لاش پر بہت کم گوشت رہنے دیا تھا لیکن جو کچھ بھی موجود تھا وہ یہ بتانے کے لئے کافی تھا کہ متوفی کی موت سینے کے گھاؤ سے ہوئی ہے۔ کسی تیز دھار آلے خنجر یا چاقو وغیرہ سے اس کے دل کے مقام پر ضرب لگائی گئی تھی ہوسکتا ہے کچھ اور زخم بھی ہوں لیکن مُردار خور پرندوں کی چونچیں تمام شواہد ملیا میٹ کرچکی تھیں۔ متوفی کے گلے میں ایک تعویذ بھی تھا۔ اس کا جوتا اور بچے کھچے کپڑے بھی برآمد ہوئے۔ یہ تمام اشیاء اس کی لاش کے ہمراہ عام لوگوں کے ملاحظہ کے لئے رکھ دی گئیں۔

قریبی دیہات سے لوگ دوپہر تک لاش دیکھنے کے لئے آتے رہے۔ دوپہر کے وقت لاش پہچان لی گئی۔ کچھ افراد نے بتایا کہ یہ شخص نالے پار کے گاؤں کپور گڑھ کا ہے۔ کپور گڑھ کے چوہدری پران کپور نے اسے ملازم رکھا ہوا ہے۔ پران کپور کا نام میں اس سے پہلے بھی کئی بار سن چکا تھا۔ کسی شادی بیاہ میں ایک دفعہ ملاقات بھی ہوئی تھی، لیکن اس وقت شکل ذہن سے

اُتر گئی تھی۔ ویسے کہا جاتا تھا وہ بڑا ٹھیکے والا زوردار چوہدری ہے۔ اس علاقے میں چوہدری سہراب کے بعد سب سے زیادہ اثر ورسوخ اسی کا تھا۔ اب مجھے یاد آرہا تھا کہ اس کے ایک بیٹے نے مجھے اپنے گھر کھانے کی دعوت بھی دی تھی، لیکن میں نے مصروفیت کی وجہ سے انکار کردیا تھا۔ یہ کوئی ایک مہینہ پہلے کی بات تھی۔ بہرحال یہ موقع اس سے ملاقات کے لئے موزوں تھا۔ میں نے اپنے سب انسپکٹر فرزند علی کے ذریعے چوہدری پران کپور کو پیغام بھجوایا کہ اس کے ایک بندے کی لاش ملی ہے۔ اس دوران میں نے اگو کو دوبارہ گرفتار کرلیا تھا۔ چوہدری پران خود تو نہیں آیا، لیکن اس کا ایک بیٹا چند دوسرے آدمیوں کے ساتھ شام کے وقت سہارنپور پہنچ گیا۔ یہی لڑکا اس سے پہلے چوہدری کی طرف سے کھانے کی دعوت لے کر آیا تھا۔ اس کا نام گوپال تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔

لاش تھانے سے باہر ایک کھلی جگہ پر رکھی تھی۔ اردگرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ میں نے گوپال کو لاش دکھائی اور وہ دیکھتے ہی پہچان گیا کہ یہ ان کا آدمی ہے۔ لاش دیکھ کر ہم تھانے آبیٹھے۔ گوپال شکل وصورت اور حلیے سے ایک ''باؤ'' قسم کا نوجوان لگتا تھا۔ کچھ پڑھا لکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ پتاجی کی طبیعت ذرا خراب تھی اس لئے خود نہیں آسکے۔ میں نے لاش کے بارے پوچھا۔ تو وہ بولا۔

''انسپکٹر صاحب یہ ہمارے ہی آدمی کی لاش ہے۔ اس کا نام راجندر ہے۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ لڑکپن سے یہ پتاجی کے پاس رہا ہے۔ بڑا وفادار ملازم تھا۔ پتاجی کو اس کی موت کا بے حد افسوس ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''گوپال میاں! تم لوگوں کو کسی پر شک ہے؟''

میری توقع کے برعکس گوپال نے کسی پر شک کا اظہار نہیں کیا۔ کہنے لگا۔ ''انسپکٹر صاحب اردگرد کے پچاس دیہات میں آج تک کسی نے ہمارے آدمی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ سمجھ نہیں آئی راجندر کے ساتھ کیا ہوا ہے۔''

گوپال سے آدھ گھنٹے کی گفتگو میں مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ اس نے ایک بھی پتے کی بات نہیں کی۔ حتیٰ کہ میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ایک مشکوک آدمی کئی دن سے زیرِحراست ہے۔ ہوسکتا ہے اس واقعے میں اس کا ہاتھ ہو۔

گوپال کی رگِ تجسس تب بھی نہیں پھڑکی۔ حالانکہ اسے کہنا چاہئے تھا کہ میں مشکوک شخص کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ تو مدعی سُست گواہ چست والی بات تھی۔ یوں لگتا تھا گوپال اور اس کے ساتھیوں کو اپنے آدمی کی موت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ لاش اس حد تک بگڑ چکی

تھی کہ اب اس کے پوسٹ مارٹم سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے متوفی کے جسم کے چند ٹکڑے احتیاط کے طور پر محفوظ کرالئے۔ گوپال اور اس کے ساتھی لاش لے کر چلے گئے۔ میں ایک بار پھر وہیں کھڑا رہ گیا جہاں تھا۔ اس کا مطلب تھا جھاڑیوں سے برآمد ہونے والی لاش اور حوالاتی اگو میں کوئی تعلق نہیں تھا۔ صبح تک میں اسے پھر رہا کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا جب مجھے خون آلود بنیان کے کیمیائی تجزیئے کی رپورٹ ملی۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے ایک ماہر انگریز سرجن کے مطابق یہ انسانی خون تھا۔ میرا سویا ہوا تجسس ایک دفعہ پھر بیدار ہوا۔ گوپال کپور کا بیان تھا کہ متوفی راجندر دس گیارہ روز سے غائب تھا۔ اکرم عرف اگو بھی ٹھیک بارہ روز پہلے کھیت میں اپنی قمیص دھوتا پایا گیا تھا۔ یہ بھی ظاہر تھا کہ مرنے والے کو تیز دھار آلے کی ضرب آئی ہے۔ کسی لاٹھی یا گولی نے اسے نشانہ نہیں بنایا تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ اگو کی بنیان پر پایا جانے والا خون راجندر کا ہی ہو۔

میں نے اپنی ملازمت کے دوران کبھی مذہب یا ذات برادری کو اپنے فرض کے آڑے نہیں آنے دیا۔ میں نے ہمیشہ مجرم کی تلاش کی، یہ کبھی نہیں دیکھا کہ جرم کرنے والا ہندو، مسلمان یا عیسائی ہے..... اپنا ہے یا بیگانہ۔ اس کیس میں بھی ایک مسلمان کے ملوث ہونے کا خدشہ تھا، لیکن میں سچ کو بے نقاب کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

اگلے روز میں ایک اے ایس آئی کے ساتھ چوہدری پران کپور سے ملنے چل دیا۔ گھوڑوں پر سوار ہم بعد دوپہر کپور گڑھ پہنچے۔ پران کپور کو ہماری آمد کی اطلاع ہوگئی۔ اس نے گاؤں سے باہر ہمارا استقبال کیا۔ وہ ایک اونچا لمبا بارعب شخص تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں اس کی ٹھوڑی پر دونوں طرف لٹک رہی تھیں۔ ماتھے پر تلک تھا اور سر پر پگڑی۔ اس کی آواز بھی اس کی طرح بھاری بھرکم تھی۔

وہ مجھے لے کر اپنی شاندار حویلی میں آگیا۔ حویلی کی سجاوٹ بناوٹ میں کسی حد تک شہری پن کی جھلک پائی جاتی تھی جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ چوہدری نے اپنی اولاد کو بُری بھلی تعلیم دلوائی تھی۔ اس کے بیٹے سے تو میں پہلے ہی مل چکا تھا بیٹی سے صحن میں ملاقات ہوگئی۔ وہ گھاس والے لان میں ایک آرام کرسی پر بیٹھی آگے پیچھے جھول رہی تھی۔ چہرہ کسی رسالے کے پیچھے چھپا ہوا تھا، لیکن شیشے کی تپائی پر رکھے ہوئے اس کے سفید گلابی پاؤں بتارہے تھے کہ لڑکی خوبصورت ہوگی۔ اس نے ہمارے قدموں کی چاپ سن کر بھی رسالہ چہرے سے نہیں ہٹایا۔ جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یا تو وہ رسالے میں بُری طرح غرق ہے یا اس نے ہمیں حویلی میں داخل ہوتے وقت دیکھ لیا ہے۔ ہم اس کے نزدیک سے گزرتے ہوئے اندر

داخل ہو گئے۔ چوہدری کی بیٹھک عام سائز کے تین کمروں سے کچھ ہی چھوٹی ہوگی۔ فرش پر دبیز قالین تھا۔ آرائش کا قدیم اور جدید سامان نظر آ رہا تھا۔ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ حیران کیا وہ ایک توپ تھی...... جی ہاں ایک مکمل توپ...... وہ زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن بالکل صحیح حالت میں تھی۔ دو چار پائیوں جتنی جگہ کے چاروں طرف سنہری زنجیر لگی ہوئی تھی۔ اندر توپ پڑی تھی۔ اطراف کے دو پہیے بڑے اور پہلا چھوٹا تھا۔ نیچے فرش پر چار چار کی ڈھیریوں میں بارہ عدد گولے پڑے تھے۔ چوہدری صاحب نے میری دلچسپی دیکھتے ہوئے بتایا کہ یہ اصلی توپ ہے اور سو سال گزر جانے کے باوجود ابھی تک قابلِ استعمال ہے۔ پھر وہ مجھے توپ کا تاریخی پس منظر بتانے لگا۔ اس کے کسی دادے پردادے نے یہ توپ مرہٹوں سے چھینی تھی اور یادگار کے طور پر اس خاندان کے پاس محفوظ چلی آ رہی تھی۔

چوہدری پران کپور سے گفتگو کرنے کے بعد میں خاصا متاثر ہوا۔ واقعی وہ ایک زوردار چوہدری تھا۔ ہماری گفتگو کے دوران بیٹھک کے دروازے پر مسلح ملازم سر جھکائے دست بستہ کھڑے رہے۔ پلکیں جھپکنے اور سانس لینے کے سوا کسی نے جنبش تک نہیں کی۔ تعارف کے مرحلے سے گزر کر میں جلد ہی اصل موضوع پر آ گیا۔ میں نے لاش کا ذکر کیا تو چوہدری نے لاپرواہی سے ہاتھ ہلایا۔

''نواز صاحب! آپ پریشان نہ ہوں۔ ہمیں متوفی کے بارے میں کسی پر شک نہیں ہے، نہ ہی ہم کوئی کیس کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ ''چوہدری صاحب! بات شک کرنے یا نہ کرنے کی نہیں۔ میرے اندازے کے مطابق متوفی راجندر کو چاقو یا چھرا گھونپ کر ہلاک کیا گیا ہے یہ ہر طرح سے ایک پولیس کیس ہے۔ اس لئے تفتیش ضروری ہے۔''

چوہدری پران نے مونچھوں کو بل دیا۔ ''ٹھیک ہے تھانیدار! تم اگر کاغذوں کا پیٹ بھرنا ہی چاہتے ہو تو میں بتاتا ہوں...... دراصل میرے آدمی نے خودکشی کی ہے۔ یہ میرا وفادار ملازم تھا اور میں اس پر ہر طرح کا اعتماد کرتا تھا۔ روپیہ پیسہ عام اس کے ہاتھوں میں رہتا تھا۔ کچھ روز پہلے میرا بیٹا گوپال شہر سے آیا اس نے فصلوں کی آمدن کا حساب کتاب چیک کیا۔ حساب میں کوئی چالیس ہزار روپے کا فرق آیا۔ ان چالیس ہزار میں سے تیس ہزار روپے آمدن کی مد میں درج نہیں کئے گئے تھے اور دس ہزار روپے فرضی خرچ میں ڈال دیئے گئے تھے اور اس کا ذمے دار راجندر تھا۔ پوری تحقیق کرنے کے بعد میں نے اسے اپنے پاس بلایا اور سخت سرزنش کی۔ میں نے کہا کہ ایک ہفتے کے اندر حساب پورا کر دو ورنہ میں پولیس میں دے دوں گا۔

راجندر پریشانی کے عالم میں میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ پھر دس گیارہ روز اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ آخر اس کی لاش ملنے کی اطلاع آئی۔ میرے ایک کارندے کا کہنا ہے کہ گاؤں سے نکلتے وقت راجندر بہت پریشان تھا اور اس نے کہا تھا کہ اب موت ہی مجھے ذلت سے بچا سکتی ہے۔''

چوہدری پران کپور کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے آدمی کی موت کو خودکشی ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔ مجھے اس رویے کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میرے نزدیک اس کی تین ہی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ نمبر ایک متوفی نے واقعی خودکشی کی تھی۔ نمبر دو، اس قتل میں چوہدری پران یا اس کے خاندان کا اپنا ہاتھ تھا، نمبر تین، جن لوگوں نے راجندر کو قتل کیا تھا ان سے چوہدری پران کی مفاہمت ہو گئی تھی اور چوہدری اب پولیس کو بیچ میں نہیں لانا چاہتا۔

میں بظاہر چوہدری پران کی باتیں سن رہا تھا، لیکن میرا ذہن انہی سوچوں میں گم تھا۔ دفعتاً مجھے صحن کی طرف سے چیخ و پکار کی آواز آئی۔ چوہدری کی طرح میں نے بھی اٹھ کر کمرے سے باہر جھانکا۔ صحن کا منظر میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ چوہدری کی بیٹی جو تھوڑی دیر پہلے کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی اب نہایت غصے کے عالم میں ایک ادھیڑ عمر شخص کو پیٹ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی چھڑی تھی اور مار کھانے والا زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ لڑکی کی عمر انیس بیس سال رہی ہوگی اور اس کے بال شانوں پر لہرا رہے تھے اور پُرکشش چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ اس کے غضب کا نشانہ بننے والا کوئی گھریلو ملازم تھا وہ ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگ رہا تھا۔ یہ ایک نہایت تکلیف دہ منظر تھا لیکن چوہدری پران نے اسے دیکھ کر ایک بلند قہقہہ لگایا اور لاپرواہی سے کہا۔

''ہماری بیٹی کو آج پھر غصہ آ گیا ہے۔''

وہ ہمیں لے کر واپس بیٹھک میں آنے کا ارادہ کر رہا تھا، لیکن مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے ذرا غصے سے کہا۔ ''چوہدری صاحب! آپ اپنی بیٹی کو منع کیجئے۔ جسے وہ مار رہی ہے اس کی عمر آپ سے کم نہیں ہے۔''

یک لخت چوہدری پران کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آئے وہ بولا۔ ''معاف کرنا تھانیدار، یہ ہمارا گھریلو معاملہ ہے پولیس کیس نہیں۔'' میں اس کا طنز سمجھ رہا تھا۔

پھر میں نے دیکھا کہ ادھیڑ عمر شخص کو مارتے مارتے لڑکی کے ہاتھ کی چھڑی ٹوٹ گئی۔ ایک ملازم تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے سر جھکا کر ایک دوسری چھڑی اپنی مالکہ کی خدمت میں پیش کر دی۔ لڑکی کا سینہ غصے میں بُری طرح ڈوب ابھر رہا تھا۔ پھر اس نے نئی چھڑی کو گھما

کر پودوں میں پھینک دیا اور بڑبڑاتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ ادھیڑ عمر شخص زمین سے اٹھ کر کپڑے جھاڑنے لگا۔

اس منظر نے مجھے رنجیدہ کر دیا تھا۔ میں زیادہ دیر چوہدری پران کے پاس نہ بیٹھ سکا۔

تھوڑی دیر بعد میں اپنے اے ایس آئی کے ساتھ حویلی سے باہر نکل رہا تھا۔ گھوڑوں پر سوار ہو کر ہم واپس سہارنپور کی طرف چل دیئے۔ ابھی گاؤں سے باہر نکلے ہی تھے کہ میری نظر ایک شخص پر پڑی۔ وہ سر پر ایک گٹھڑی اٹھائے لنگڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ میں فوراً پہچان گیا یہ وہی شخص تھا جسے تھوڑی دیر پہلے چوہدری پران کی خوبرو بیٹی پیٹ رہی تھی۔ شاید مار کے دوران اس کی ٹانگ میں کوئی شدید چوٹ لگی تھی۔ اس سے چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ میں نے گھوڑا اس کے پاس روکا اور پوچھا کہ اسے کہاں جانا ہے؟ اس نے ایک قریبی گاؤں کا نام لیا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ گھوڑے پر بیٹھنے کو کہا۔ پہلے تو وہ ایک تھانیدار کے ساتھ بیٹھنے سے ڈرتا رہا لیکن جب میں نے اس کی ہمت بندھائی تو وہ بمشکل تیار ہو گیا۔

راستے میں میں اور اے ایس آئی اس سے باتیں کرتے رہے۔ جلد ہی وہ کھل گیا۔ وہ اس خاندان کا ایک وفادار ملازم تھا لیکن ان دنوں اس سے کچھ اچھا سلوک نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو واقعہ پیش آیا تھا اس نے اس کا دل دکھ و رنج سے بھر دیا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت ایسی تھی کہ بہت جلد وہ ہمیں اپنا غمخوار سمجھنے لگا۔ روانی میں اس کے منہ سے کچھ ایسی باتیں بھی نکل گئیں جو ہمارے لئے انکشاف سے کم نہیں تھیں۔

اس نے بتایا کہ اس کی بیوی کو بچہ ہونے والا ہے۔ اس کی بیماری کی اطلاع پر وہ اپنے گھر جا رہا تھا۔ اس نے آج صبح جانے کی اجازت مانگی تھی لیکن دوپہر کی اجازت ملی تھی۔ اب دوپہر کی بھی سہ پہر ہونے والی تھی وہ جلدی جلدی تیار ہو کر روانہ ہو رہا تھا کہ چھوٹی بی بی یعنی چوہدری کی بیٹی بیلا نے اسے ایک اور کام بتا دیا۔ وہ یہ کام کر کے واپس لوٹا تو وہ بولی کہ چائے بنا کر لاؤ۔ وہ چائے بنا کر لایا۔ جلدی میں جب وہ بیلا کو چائے دینے لگا تو وہ چھلک کر اس کی رانوں پر جا گری۔ اس پر بیلا سیخ پا ہو گئی۔ اس نے چھڑی اٹھائی اور اسے پیٹ ڈالا۔ اس نے بتایا کہ ملازم مردوں اور عورتوں کو پیٹنا بیلا کا روز کا معمول ہے۔ وہ لاڈ پیار سے بگڑی ہوئی بے حد مغرور اور خودسر لڑکی ہے۔

چوہدری پران اور اس کے بیٹوں کے متعلق بھی ادھیڑ عمر شخص نے کئی باتیں بتائیں۔ لیکن ان میں چغلی کا انداز نہیں تھا۔ وہ سادہ لوح شخص اپنے طور پر اپنے مالکوں کی شان، دبدبے اور بڑائی کی تعریف ہی کر رہا تھا۔ چوہدری کے متعلق اس نے بتایا کہ انہیں "نازو"

سے جنون کی حد تک عشق ہے۔

"کون نازو؟" میں نے پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ نازو کوئی لڑکی ہو گی لیکن نبی بخش (ادھیڑ عمر شخص) کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔ وہ بولا۔

"نازو ایک گھوڑی ہے جی..... آپ نازو کو نہیں جانتے؟ وہ آپ ہی کے گاؤں میں تو ہے۔ چوہدری محبت علی کی ملکیت ہے۔ لاکھوں میں ایک گھوڑی ہے۔ سنا ہے چوہدری پران نے اسے ایک میلے میں دیکھا تھا۔ انہوں نے محبت علی سے سودا کرنا چاہا۔ تیس ہزار تک قیمت لگائی لیکن محبت علی نہیں مانا۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ چوہدری پران نے سوگند کھائی تھی کہ وہ اس گھوڑی پر ایک دفعہ ضرور سواری کریں گے۔"

گھوڑی، چوہدری پران، محبت علی..... بہت سے خیالات میرے ذہن میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ راجندر کا قتل بھی اس گھوڑی کا شاخسانہ ہو۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میں یہ گھوڑی دیکھ چکا ہوں۔ مجھے سواری کے جانوروں سے کوئی بہت زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ پھر بھی اچھی چیز نظر کو بھاتی ہے اور ذہن پر نقش ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں نے اکرم عرف اکو کو شبے میں پکڑا تھا تو چوہدری محبت علی تھانے میں اس کی ضمانت دینے آیا تھا۔ وہ جس گھوڑی پر آیا تھا وہ سفید داغوں والی ایک کمیت گھوڑی تھی۔ ایال سیدھے اور آنکھیں نہایت روشن تھیں۔ میری نظر کتنی ہی دیر اس کی ہموار کمر اور خوبصورت ٹانگوں سے الجھتی رہی تھی۔ شاید میں نے گھوڑی کے متعلق محبت علی سے کوئی سوال بھی کیا تھا..... تو اس کا مطلب تھا وہی نازو تھی جس کی لگن نے چوہدری پران کی نیند حرام کر رکھی تھی۔

نبی بخش میرے پیچھے بیٹھا مسلسل باتیں کر رہا تھا۔ "چوہدری محبت علی تو اس گھوڑی پر جان چھڑکتا ہے جناب۔ ایک دفعہ اس کے کسی ملازم نے گھوڑی کو چھڑی مار دی تھی۔ محبت علی نے چارہ کاٹنے والے ٹوکے میں دے کر اس کا بازو ہی کٹوا دیا تھا۔ اگر کبھی گھوڑی بیمار ہو تو شہری ڈاکٹر اسے دیکھنے آتا ہے۔ دو دو سائیس اور دو دو نوکر ہر وقت گھوڑی کے پاس رہتے ہیں۔

نبی بخش کی باتیں نہ جانے کب تک جاری رہتیں لیکن پھر اس کا گاؤں آ گیا۔ میں نے اسے گھوڑے سے اُتار دیا۔ وہ گٹھڑی تھام کر لنگڑاتا ہوا چل دیا۔ اتنے میں ایک لڑکا اور لڑکی بھاگ کر آئے۔ لڑکی نے جلدی سے نبی بخش کی گٹھڑی تھام لی۔ لڑکے نے اسے لنگڑاتے دیکھا تو آہستگی سے اپنا کندھا سہارے کے لئے پیش کیا۔ میرے خیال میں وہ اس کا بیٹا اور بیٹی تھے اپنے باپ کے لئے کتنا احترام تھا ان کے دل میں اور پھر میری نگاہ میں وہ منظر بھی

گھوم گیا جب یہی شخص گھاس پر لوٹنیاں کھا رہا تھا اور ایک بے رحم ہاتھ اسے پیٹ رہا تھا...... ہر شخص کسی چار دیواری میں قابلِ صد احترام ہوتا ہے ہم یہ نہیں سوچتے کہ جس شخص کو چوراہے میں ذلیل کر رہے ہیں وہ کسی کا محترم ہوگا۔ کوئی بیوی اسے سرتاج کہتی ہوگی۔ کوئی بیٹی اسے ابا جان کہتی ہوگی۔ کسی ننھی منی بہن کے لئے وہ بھائی جان ہوگا...... ہم کچھ نہیں سوچتے۔

☆======☆======☆

وہ ایک تاریک رات تھی۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں نے سردی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں لیٹا چوہدری پران اور چوہدری محبت کے معاملے پر غور کر رہا تھا۔ مجھے شک ہو رہا تھا کہ چوہدری پران کا آدمی راجندر محبت علی کی گھوڑی کھولنے کی کوشش میں ہلاک ہوا تھا۔ چوہدری پران کا کہنا تھا کہ اس نے خودکشی کی ہے، لیکن یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی کہ اسے اتنی دور آ کر خودکشی کرنے کی کیا ضرورت۔ اس نیک کام سے وہ اپنے گاؤں میں بھی فارغ ہو سکتا تھا لیکن اگر ایسا ہوا تھا تو چوہدری پران نے اپنے آدمی کے قتل سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی۔ وہ آسانی سے اپنے دشمن یعنی محبت علی پر قتل کا الزام لگا سکتا تھا...... سوچوں کا تانا بانا پھیلتا جا رہا تھا۔ اچانک کچھ آوازیں سن کر میں چونک گیا۔ ایسی آوازیں دیہات میں اسی وقت سنائی دیتی ہیں جب کوئی مصیبت آتی ہے۔ چور ڈاکو گھس آتے ہیں، کہیں کوئی لڑائی ہوتی ہے یا نہر وغیرہ کا بند ٹوٹ جاتا ہے۔ میں اچھل کر بستر سے نیچے آیا اور ہولسٹر سے ریوالور نکال کر صحن کی طرف لپکا۔ گلی میں پہنچا تو مجھے ایک جانب روشنی دکھائی دی۔ کہیں آگ لگی ہوئی تھی۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تھا تو آگ چوہدری محبت علی کی بلند و بالا حویلی میں لگی تھی۔ میں نے اپنا گھوڑا کھولا اور سوار ہو کر تیزی سے حویلی کی طرف لپکا۔ ابھی میں حویلی سے نصف فرلانگ دور تھا کہ سرپٹ دوڑتے گھوڑوں کی آواز آئی۔ پھر آواز کا رخ یک دم تبدیل ہو گیا۔ گھڑ سوار کسی گلی میں مڑ گئے تھے۔ چند قدم آگے مجھے پندرہ بیس دیہاتی نظر آئے گھڑ سواروں نے یقیناً انہیں دیکھ کر ہی رخ بدلا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی لوگوں نے پکار کر بتایا کہ بھاگنے والے اس گلی میں گئے ہیں۔ میں نے بلا تاخیر گھوڑا اس جانب موڑ دیا۔ اس وقت یکے بعد دیگرے سات آٹھ فائر ہوئے۔ میں نے دو گھڑ سواروں کو خوف کے عالم میں واپس لپکتے دیکھا۔ انہوں نے مجھے چیخ کر کہا۔ ”آگے نہ جاؤ، ڈاکو رائفلوں سے مسلح ہیں انہوں نے کئی آدمی ہلاک کر دیئے ہیں۔“ یہ ایک روح فرسا خبر تھی لیکن ڈر کر رک جانا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ میں نے ریوالور ہاتھ میں لیا اور گھوڑے پر ذرا جھک کر تیزی سے اندھی گلی میں لپکا۔ گلی کے اختتام پر مجھے چند ہیولے نظر آئے۔ چار افراد زمین پر پڑے تھے۔ ایک آدمی

جو شدید زخمی تھا ٹانگوں پر زور دے کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکوؤں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ میں چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اترا۔ لڑکھڑانے والے شخص کو سہارا دیا۔ اس کی دونوں ٹانگوں پر گولیاں لگی تھیں۔ زخمی کو ایک بند دروازے کے سامنے ڈال کر میں نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا اور ایک خوفزدہ صورت نظر آئی۔ یہ ایک نوجوان تھا اس نے ایک ہاتھ میں لاٹھی اور دوسرے میں لالٹین اٹھا رکھی تھی۔ میں نے اس سے لالٹین جھپٹی اور زمین بوس افراد کا معائنہ کرنے لگا۔ دو افراد موقع پر ہلاک ہو گئے تھے ایک معمولی زخمی ہوا تھا۔ چوتھے شخص کو دیکھ کر میں بری طرح چونکا۔ وہ بلال شاہ تھا۔ وہ ایک مرے ہوئے شخص پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ اس دفعہ وہ کام آ گیا ہے...... لیکن پھر اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے لالٹین اوپر اٹھا کر دیکھا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

اس دوران گلی کے کچھ اور دروازے کھل گئے۔ جلد ہی وقوعہ پر لوگوں کا ہجوم نظر آنے لگا۔ مرنے والوں کے ورثاء لاشیں پہچان کر چیخنے چلانے لگے۔ کچھ لوگ ڈاکوؤں کے تعاقب کا مشورہ دے رہے تھے...... لیکن میں جانتا تھا سہارنپور کی تاریک رات میں ڈاکوؤں کو ڈھونڈنا سمندر میں گرا ہوا سکہ تلاش کرنا تھا۔ یہ علاقہ اگر ڈاکوؤں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا تو اس کی کچھ وجہ تھی۔ یہاں کا چپہ چپہ پناہ گاہ اور گوشہ گوشہ گھات تھا۔

چوہدری محبت علی کی حویلی میں بھڑکنے والی آگ مدھم پڑ چکی تھی لیکن روشنی ابھی برقرار تھی۔ ڈاکوؤں سے مایوس ہو کر لوگ حویلی کی طرف لپکے۔ میں جب گھوڑا دوڑاتا ہوا وہاں پہنچا تو چوہدری کے آدمی اور ارد گرد کے لوگ آگ پر پوری طرح قابو پا چکے تھے۔ آگ حویلی کے صرف ایک حصے تک ہی محدود رہی تھی۔ میں حویلی میں داخل ہوا تو محبت علی کہیں نظر نہیں آیا۔ دو تین کمرے بھسم ہو گئے تھے۔ جلے ہوئے شہتیروں اور لکڑی کے دروازوں سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد محبت علی بھی آ گیا۔ اس نے بتایا کہ ڈاکو حویلی سے کچھ بھی لے جانے میں ناکام رہے ہیں۔ تمام دروازے مقفل اور پہرے دار چوکنے تھے۔ جاتے جاتے وہ مایوسی اور غصے میں حویلی کے ایک کمرے میں جلتی ہوئی لالٹین پھینک گئے تھے جس سے آگ بھڑکی۔

اس علاقے میں اس قسم کے واقعات روزمرہ کا معمول تھے لیکن سہارنپور میں تھانہ ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی ہی کوئی واردات ہوتی تھی۔ اس دفعہ کی واردات خاصی سنگین تھی۔ دو افراد کی ہلاکت کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اپنی طرف سے تو بلال شاہ بھی مر گیا تھا لیکن خوش

قسمتی سے اسے گولی نہیں لگی تھی۔ ہر معاملے میں آگے بڑھ کر ٹانگ اڑانا بلال شاہ کا محبوب مشغلہ تھا۔ کئی دفعہ اس کی زبردست درگت بنی تھی۔ کئی مرتبہ مرتے مرتے بچا تھا لیکن باز آنا اس کی فطرت میں نہیں تھا۔

اس بار میں نے اسے سرزنش کی کہ اسے کیا ضرورت تھی سارے گاؤں کا ماما بننے کی۔ خالی ہاتھ ڈاکوؤں کے پیچھے بھاگنے سے اسے کون سا وکٹوریہ کراس مل جاتا۔ بلال شاہ میری جھاڑ سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔ مجھے شک ہوا کہ وہ کوئی اہم بات جانتا ہے۔ اسے کوئی اہم بات معلوم ہونے کی دو ہی نشانیاں ہوتی ہیں۔ یا تو میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بلند آواز سے بولنے لگتا تھا یا عین کمرے کی دہلیز پر اسے ٹھوکر لگتی تھی اور وہ کسی چیز پر گرتے گرتے بچتا تھا۔ لیکن اس کے ''خبر باز'' ہونے کی ایک اور علامت بھی تھی۔ اگر وہ کوئی اہم اطلاع پیٹ میں لئے ہوتا تھا تو میری جھاڑ سن کر بھی اسے غصہ نہیں آتا تھا اور اس وقت یہی خاص علامت ظاہر ہو رہی تھی۔

میں نے بات بدل کر کہا۔ ''ویسے شاباش ہے یہ تیری بہادری کہ اتنی سردی میں لحاف سے نکل کر ننگے پاؤں بھاگتا چلا گیا۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''خان صاحب! جوتی تو میری راستے میں اُتری تھی لیکن جوتی گم ہونے کا مجھے غم نہیں۔''

''کیوں مسجد سے اٹھائی تھی؟''

''نہیں جناب! بس پیسے پورے ہو گئے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے سگریٹ مٹھی میں دبا کر ایک طویل کش لیا اور بولا۔ ''ایک اہم اطلاع ہے آپ کے لئے۔''

''اب بتاؤ بھی کہ جوتے کے پیسے لو گے؟''

وہ آگے کو جھک کر بولا۔ ''خان صاحب! چوہدری محبت علی نے آپ سے کہا تھا ناکہ ڈاکے میں اس کا کوئی نقصان نہیں ہوا...... اس نے غلط کہا تھا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''جناب! اس کی گھوڑی چوری ہو گئی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟''

بلال شاہ نے ایک طویل کش سے چوتھائی سگریٹ پھونک کر کہا۔ ''خان صاحب!

چوہدری محبت کے پاس ایک گھوڑی ہے۔ بڑی اعلیٰ نسل کی... نازو نام ہے اس کا''

''ہاں ہاں میں اس کے بارے میں جانتا ہوں۔'' میں نے بلال کی بات کاٹی۔ ''تم آگے بتاؤ۔''

بلال شاہ بولا۔ ''کل رات جب چوہدری کی حویلی میں ڈاکو پڑے۔ میں بھی جاگ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شور سن کر میں فوراً گلی میں آ گیا۔ چوہدری کی حویلی سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آٹھ دس گھڑسوار سرپٹ بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ اندھیرے میں کچھ پتہ نہیں چلتا تھا وہ کون لوگ ہیں۔ جب وہ میرے قریب سے گزرے تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ گاؤں کے آدمی نہیں بلکہ ڈاکو ہیں۔ ان کے درمیان مجھے ایک خالی گھوڑی بھی نظر آئی۔ اس وقت مجھے بالکل پتہ نہیں چلا کہ یہ چوہدری محبت علی کی گھوڑی ہے۔ یہ تو میں نے بعد میں سوچا۔ مجھے شک سا ہو رہا تھا۔ آج صبح میں نے اس بات کا پتہ چلانے کی کوشش کی۔ تھان کا ایک ملازم میرا دوست ہے میں نے اس کو کریدا۔ اس نے بتایا کہ اسے صحیح بات کا تو علم نہیں لیکن تھان کا وہ حصہ جہاں گھوڑی بندھی ہوئی تھی بند پڑا ہے۔ گھوڑی کا سائیس بھی کہیں نظر نہیں آتا۔'' بلال شاہ نے رک کر ایک اور گہرا کش لیا۔ پھر ایک آنکھ دبا کر بولا۔ ''خان صاحب! مجھ سے لکھوا لیں۔ چوہدری کی گھوڑی چوری ہو چکی ہے۔''

اگر مجھے پہلے سے یہ ساری بات معلوم نہ ہوتی تو شاید میں اتنی جلدی بلال شاہ کی بات پر یقین نہ کرتا لیکن اب میرا ذہن بلال شاہ کی تائید کر رہا تھا۔

اگر واقعی چوہدری محبت کی گھوڑی چوری ہوئی تھی تو گاؤں کے دو افراد کے قاتلوں کا سراغ لگانا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا گھوڑی چوری کرنے کے لئے چوہدری پران کپور کے آدمی آئے تھے اور چوہدری پران کپور ہی دہرے قتل کا بڑا مجرم تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ بلال شاہ کی اطلاع اس کیس کو اتنا آسان کر دے گی۔ عین ممکن تھا کہ چوہدری پران نے اپنے آدمی بھیجنے کی بجائے کسی بدنام ڈاکو کی مدد لی ہو لیکن کچھ بھی تھا اصل مجرم تو پران ہی قرار پاتا تھا۔ میں نے ایک آدمی چوہدری محبت کو بلانے کے لئے بھیجا۔ پتہ چلا کہ وہ قصبے سے باہر ہے۔ اس روز میں چوہدری کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہیں آیا۔ اگلے روز میں ایک چھاپہ مار پارٹی کے ساتھ چوہدری پران کی طرف روانہ ہوا۔

شام سے کچھ پہلے ہم کپور گڑھ پہنچے۔ چوہدری تپاک سے ملا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی نظر نہیں آتی تھی۔ ایک لمحے کے لئے تو میں نے سوچا کہ کہیں گھوڑی کی چوری میں کوئی اور شخص تو ملوث نہیں لیکن پھر بہت جلد مجھے یہ خیال ذہن سے جھٹکنا پڑا۔ موجودہ

حالات جس شخص کی طرف اشارہ کر رہے تھے وہ صرف اور صرف پران تھا۔ میں لمبی چوڑی تمہید کے بغیر ہی اصل موضوع پر آ گیا۔ میری بات سن کر چوہدری کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ وہ غصے سے بولا۔

"تھانیدار! یہ وہ گھر ہے جہاں انگریز بہادر بھی سر جھکا کر آتے ہیں اس حویلی میں تو کیا اس گاؤں میں بھی کبھی کوئی پولیس والا وارنٹ لے کر داخل نہیں ہو سکا۔ تم مجھ پر قتل اور چوری کا الزام لگا رہے ہو۔"

مجھے پتہ تھا چوہدری ایسے ہی بھڑکے گا لیکن میں اس علاقے سے جنگل کا قانون ختم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ درندوں سے آنکھیں چار کئے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سے پہلے یہاں کے لوگ چوہدری سہراب کا حشر دیکھ چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک چوہدری کی حویلی میں بیٹھ کر اس پر قتل کا الزام لگانے کے بعد بھی میں زندہ تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"چوہدری صاحب! میں یہ نہیں کہتا کہ یہ واردات آپ کی ایماء پر ہوئی ہے لیکن کچھ آدمیوں کو پہچانا گیا ہے اور وہ اسی گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا لیکن خطا گیا۔ چوہدری کا چہرہ اور بھی سخت ہو گیا۔ وہ غصے سے بولا۔

"انسپکٹر! پہلے میرے خلاف کوئی ثبوت ڈھونڈ لو پھر یہاں آنا اگر میرے گاؤں کے کسی باشندے پر اس واردات کا الزام ثابت ہو گیا تو میں اپنے ہاتھوں سے اس کی گردن اُڑا دوں گا۔"

مجھے چوہدری کی بات سے اندازہ ہو گیا کہ اس نے یہ واردات پیشہ ور ڈاکوؤں سے کروائی تھی لیکن کچھ بھی تھا گھوڑی تو اسی کے پاس موجود تھی اور گھوڑی برآمد ہونے سے سارا کیس صاف ہو سکتا تھا۔

میں نے چوہدری سے کہا۔ "ٹھیک ہے اب میں آپ کے پاس ثبوت لے کر ہی آؤں گا۔"

کپورگڑھ سے واپسی کے بعد میں سیدھا چوہدری محبت کی حویلی پہنچا۔ خوش قسمتی سے وہ واپس آ چکا تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا اور آنکھیں بے خواب تھیں۔ وہ مجھے اپنی بیٹھک میں لے گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہاں شراب پی جاتی رہی ہے۔ ادھ جلے سگریٹوں کے ٹکڑے چاروں طرف بکھرے پڑے تھے۔

میں نے کہا۔ "چوہدری صاحب! میرا خیال ہے اب تک آپ کو اپنی گھوڑی کے گم

ہونے کا پتہ چل گیا ہو گا؟"

"کون سی گھوڑی؟" محبت علی نے خمار آلود لہجے میں کہا۔

"وہی آپ کی چہیتی گھوڑی نازو۔"

"اچھا وہ۔" محبت نے ہاتھ لہرایا۔ "وہ گم کب ہوئی ہے۔ اسے تو میں نے خود گولی ماری ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں؟" میں تقریباً اچھل پڑا۔

"ہاں انسپکٹر۔" محبت علی نے ہچکی لے کر کہا۔ "اس بیچاری کو پرسوں ایک باؤلے کتے نے کاٹ لیا تھا۔ اس پر بھی اثر ہو گیا۔ آج وہ زیادہ بیمار ہو گئی، مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہ گئی......بس میں نے گولی مار دی۔"

مجھے چوہدری کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "آپ مجھے دکھائیں گے اس کی لاش؟"

"ہاں ہاں دیکھ لو اس بدنصیب کو۔" چوہدری ڈگمگاتا ہوا اٹھا۔ وہ صاف طور پر بہک رہا تھا۔ میرے آگے چلتا ہوا وہ صحن میں پہنچا اور پھر وہاں سے طویلے میں۔ میں نے دیکھا کہ تین چار آدمی کچی زمین کو کھود کر ایک گڑھا بنا رہے ہیں۔ گڑھے کے قریب ہی ایک گھوڑی مُردہ پڑی تھی۔ میں اسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ ہلکے سرخ رنگ کی ایک نہایت خوبصورت گھوڑی تھی۔ گردن کے قریب ایک خوبصورت سفید داغ تھا......لیکن اب یہ داغ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس پر خون پھیلا ہوا تھا۔ یہ خون گھوڑی کی کنپٹی سے برآمد ہوا تھا۔ وہاں گولیوں کے دو زخم تھے اور ان پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ محبت علی گھوڑی کے قریب بیٹھ گیا اور خاموشی سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ موقعے پر موجود تمام افراد بالکل خاموش تھے۔ جانور کی موت نے ان پر گہری افسردگی طاری کر رکھی تھی۔ گڑھا مکمل ہو چکا تھا۔ تھوڑی سی تراش خراش کے بعد کھدائی کرنے والے باہر نکل آئے۔ سات آٹھ آدمیوں نے مل کر گھوڑی کو آرام سے گڑھے میں اُتار دیا۔ حویلی کے پچھواڑے میں لالٹینوں کی مدھم روشنی میں یہ ایک عجیب منظر تھا۔ چوہدری محبت علی پر رقت طاری تھی۔ اس نے آنکھوں میں امڈنے والے آنسوؤں کو اپنی چادر سے صاف کیا۔ پھر وہی چادر اُتار کر گھوڑی کے اوپر پھیلا دی۔ ایک دوسرے شخص نے بھی اپنی گرم چادر گھوڑی کے مردہ جسم پر ڈال دی۔ تب تدفین کا عمل شروع ہوا۔ چوہدری یہ منظر دیکھے بغیر میرے ساتھ بیٹھک میں واپس آ گیا۔

میرا ذہن کسی گہری سازش کی خبر دے رہا تھا۔ گھوڑی کو چوری کیا گیا تھا۔ عین ممکن تھا

کہ اسے چوہدری پران نے گولی ماری ہو لیکن بات پھر وہی مدعی سست اور گواہ چست والی تھی۔ چوہدری محبت کہہ رہا تھا گولی اس نے خود ماری ہے اور اس کی گھوڑی بیمار تھی۔ اب بات مجھ پر واضح ہو رہی تھی۔ دو پرانے حریف پولیس کو بیچ میں لائے بغیر ایک دوسرے سے بدلے چکا رہے تھے۔ ایک طرح سے وہ پولیس کو بے وقوف بنا رہے تھے لیکن میں اب مزید بے وقوف بننا نہیں چاہتا تھا۔ یہ صرف دو چوہدریوں کا معاملہ نہیں تھا۔ اس سے کئی دوسرے انسانوں کی زندگی بھی متاثر ہوئی تھی۔ صرف تین روز پیشتر تھانے سے چند فرلانگ دور دو افراد گھوڑی چوروں کی فائرنگ کا نشانہ بن چکے تھے۔ تین افراد شدید زخمی ہوئے تھے اور اب چوہدری محبت صاف انکار کر رہا تھا کہ اس کی گھوڑی کو چوری یا ہلاک کیا گیا ہے۔ اس کا رویہ اس بات کی خبر بھی دے رہا تھا کہ وہ چوہدری پران پور کے خلاف جوابی کارروائی سے باز نہیں آئے گا۔

میں اور محبت علی آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ شاید غم غلط کرنے والے سیال کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''چوہدری محبت! یہ کھیل اب ختم ہونا چاہیے۔ اپنے معاملات اب قانون کے سپرد کر دو۔ میں جانتا ہوں تم اور چوہدری پران آگ اور خون کا کھیل کھیل رہے ہو۔''

محبت علی نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر بولا۔ ''تم کچھ نہیں جانتے تھانیدار۔''

''میں سب کچھ جانتا ہوں چوہدری محبت۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم راجندر کے قاتل ہو۔ اکرم عرف اکو کے ہاتھوں اسے قتل کرانے والے تم ہی تھے۔''

چوہدری محبت خمار آلود نگاہوں سے مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔ ''مجھے کیا ضرورت تھی اس کے خون سے ہاتھ رنگنے کی؟''

''تمہیں ضرورت تھی چوہدری محبت'' میں نے یقین سے کہا۔ ''اس لیے کہ وہ چوہدری پران کا آدمی تھا اور تمہاری گھوڑی چوری کرنے کے لیے تمہاری حویلی میں داخل ہوا تھا۔ تمہیں بروقت اطلاع ہو گئی۔ تمہارے آدمیوں نے اس کا پیچھا کیا۔ بالآخر نالے کے کنارے جھاڑیوں میں اسے تمہارے پالتو غنڈے اکو نے جا لیا اور چھری سے حملہ کر کے ہلاک کر دیا۔ بعدازاں جب وہ رات کے اندھیرے میں ایک کھیت میں بیٹھا اپنی خون آلود قمیص دھو رہا تھا، میرے ایک کارندے نے اسے دیکھ لیا۔''

چوہدری محبت بولا۔ ''تم خیالی گھوڑے دوڑا رہے ہو۔ یہ باتیں فرضی ہیں تھانیدار۔''

میں نے کہا۔ ''اور یہ بھی فرضی ہے کہ تمہاری چہیتی گھوڑی چوری ہوئی تھی اور چوہدری پران نے اس پر سواری کرنے کے بعد اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے تاکہ تم اس کی لاش پر آنسو بہا سکو۔ نہیں چوہدری یہ باتیں فرضی نہیں ہیں۔ اس رات چوہدری پران کے آدمیوں نے تمہاری حویلی میں اسی لیے آگ لگائی تھی تاکہ تمہاری ''نازو'' کو اغوا کیا جا سکے۔ جب تمہارے طویلے اور حویلی کے رکھوالے آگ بجھانے کی کوششوں میں مصروف تھے پران کے آدمی نہایت صفائی سے گھوڑی کھول کر لے گئے تھے۔ کیا تم ان باتوں سے انکار کر سکتے ہو؟''

چوہدری محبت خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اٹھ کر الماری سے بوتل نکالی اور گلاس بھرنے لگا۔ شراب کی شدید طلب اسے ہر احتیاط بالائے طاق رکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ایک طویل اور تلخ گھونٹ لے کر وہ بولا۔

''تم ہوشیار آدمی ہو تھانیدار۔ تمہاری زیادہ تر باتیں ٹھیک ہیں۔''

''تو غلط کون سی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نازو کو گولی میں نے خود ہی ماری ہے۔'' وہ آنکھیں بند کر کے بولا۔

''لیکن کیوں؟''

''میں اس کے لیے مجبور تھا تھانیدار۔ وہ اب میری سواری کے قابل نہیں رہی تھی وہ جوٹھی ہو چکی تھی۔ چوہدری پران اس پر سواری کر چکا تھا۔ اپنی ضد پوری کرنے کے بعد اس نے نازو کو [illegible] کے راستے پر چھوڑ دیا تھا۔ آج دوپہر وہ تنہا حویلی کے دروازے پر پہنچ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں...... آنسو تھے شاید...... شاید وہ بھی اپنے انجام سے آگاہ ہو چکی تھی۔

''چوہدری محبت نے اشک بار نگاہوں سے اپنے لرزاں ہاتھ کو دیکھا اور شرابی لہجے میں بولا۔

''اس ہاتھ سے...... اس ہاتھ سے میں نے اپنی پیاری نازو کو گولی سے اڑا دیا......''

میں خاموشی سے بیٹھا اس روایتی چوہدری کے عجیب جذبوں اور خود ساختہ معیاروں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے میں نے کہا۔

''چوہدری محبت! اس کا مطلب ہے تم یہ بات بھی مانتے ہو کہ کپور گڑھ کے راجندر نامی شخص کا قتل تم نے کیا۔''

نشے کے باوجود نوجوان چوہدری کے حواس قائم تھے۔ اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نہیں تھانیدار! نہ تو میں نے یہ قتل کیا ہے اور نہ تم ثابت کر سکتے ہو۔ لاکھ کوشش کر لو تمہیں ایک گواہ ایسا نہیں ملے گا جو اس کیس کو دو پیشیوں تک بھی چلا سکے۔ میں تمہیں ایک اور بات بتا دوں۔ ہو سکتا ہے تم اکو پر چنگیز خانی حربے آزماؤ اور اسے تشدد کے ذریعے زبان کھولنے پر

مجبور کرو۔ اول تو وہ زبان کھولے گا نہیں اور اگر کھولے گا بھی تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس کے اقبالی بیان سے چوہدری محبت کا کچھ بگڑنے والا نہیں......"

میں جانتا تھا اگر مجھے چوہدری محبت یا چوہدری پران جیسے افراد پر ہاتھ ڈالنا ہے تو نہایت احتیاط اور منصوبہ بندی سے کام لینا ہوگا۔ لہٰذا میں نے چوہدری محبت کی باتوں سے مشتعل ہوکر سخت زبان استعمال کرنے سے گریز کیا۔

دوسری طرف مجھے یہ خطرہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ محبت علی اپنی گھوڑی کا انتقام لینے کے لیے چوہدری پران کے خلاف کارروائی کرے گا۔ اس سے معاملات جو اب تک قابو میں تھے بہت بگڑ سکتے تھے۔ میں نے چوہدری محبت سے کہا کہ وہ اس قسم کے کسی بھی خیال سے باز رہے۔ اس سے نہ صرف اس کے جرائم میں اضافہ ہوگا بلکہ ہوسکتا ہے ایسی آگ بھڑکے جو اس کے بھرے پرے گھر کو جلا کر راکھ کردے۔ میں کافی دیر اس کے پاس بیٹھا اسے قانون ہاتھ میں لینے کے نقصانات سے آگاہ کرتا رہا۔ بہرحال وہ مسلمان تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہندو کے فتنہ پرور ذہن کا شکار ہو۔

☆======☆======☆

صبح کے پانچ بجے کا وقت تھا۔ بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دستی گھڑی دیکھی اس وقت کون ہوسکتا ہے۔ میری چھٹی حس مجھے خطرے سے خبردار کرنے لگی۔ لالٹین کی بتی اونچی کرکے میں صحن میں آیا۔ دستک پھر ہوئی اور میں سمجھ گیا کہ ایسا بھاری ہاتھ والا مہمان بلال شاہ کے سوا اور کوئی نہیں۔ میں نے دروازہ کھولا۔ بلال کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ یہ کپور گڑھ میں پولیس کا مخبر تھا۔ راج نرائن نام تھا اس کا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ کمرے میں پہنچ کر راج نرائن نے بتایا کہ کپور گڑھ میں غضب ہوگیا ہے۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ چوہدری محبت علی اور اس کی گھوڑی کا چکر ہے۔ راج نرائن نے بتایا کوئی دو گھنٹے پہلے چوہدری محبت اپنے ایک ساتھی کے ساتھ چوہدری پران کی حویلی میں گھس گیا۔ اس نے چوہدری کی جوان بیٹی بیلا کو اٹھالیا اور مزاحمت کرنے پر بیلا کے ایک بھائی کو گولی مار کر شدید زخمی کردیا۔ جب گھر والوں کو اس حادثے کی خبر ہوئی وہ دونوں لڑکی کو لے کر دور نکل چکے تھے۔"

میں سمجھ گیا کہ اب زبردست خون خرابہ ہونے والا ہے۔ میں نے مخبر سے پوچھا۔ "اب کپور گڑھ میں کیا صورت حال ہے؟"

وہ بولا۔ "جناب! میں حویلی کے سامنے سے ہوکر آیا ہوں۔ وہاں بالکل خاموشی ہے لگتا

ہے اندر ہی اندر کوئی منصوبہ بن رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "چوہدری محبت کا کچھ پتہ چلا؟"

"جی ہاں۔" مخبر بولا۔ "ابھی جب میں آپ کی طرف آ رہا تھا۔ راستے میں مجھے کپور گڑھ کا ایک مزارع ملا۔ وہ گھوڑے پر سرپٹ بھاگا جا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ چوہدری محبت لڑکی کو اپنے ہی ڈیرے پر لے کر گیا ہے۔ وہاں اس نے کوئی ساٹھ ستر مسلح آدمی بھی جمع کر رکھے ہیں۔ وہ لوگ ہر قسم کے مقابلے کے لیے تیار ہیں۔"

یہ اطلاعات مجھے چکرا دینے کے لیے کافی تھیں۔ پولیس کی موجودگی میں دو پارٹیاں آپس میں کھلم کھلا مقابلہ کرتیں یہ مجھے کسی طرح منظور نہیں تھا۔ امن عامہ کے لیے یہ قتل عام زہر قاتل کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے فوراً وردی پہنی اور تھانے کی طرف لپکا۔ ایک مضبوط چھاپہ مار پارٹی کے ساتھ میں نے چوہدری محبت علی کے ڈیرے کا رخ کیا۔

اس کا ڈیرہ قصبے سے باہر برساتی نالے کے کنارے ایک باغ میں تھا۔ کوئی تین کوس کا فاصلہ تھا۔ جب ہم باغ کے سامنے پہنچے دن پوری طرح چڑھ چکا تھا۔ ابھرتے سورج کی کرنیں مالٹے اور سنگترے کے پودوں پر چمک رہی تھیں۔ بڑا خوبصورت منظر تھا لیکن میں اس منظر میں خون کی لالی دیکھ رہا تھا۔ آنے والے لمحے بڑے سنگین تھے چوہدری کا ڈیرہ بھی ایک چھوٹی موٹی حویلی ہی تھی۔ درختوں میں گھری ہوئی ایک نیم پختہ عمارت تھی۔ جس پر دیہاتی انداز کے پھول بوٹے بنے ہوئے تھے۔ اندر اور باہر خاموشی تھی۔ بالکل نہیں لگتا تھا یہاں افراد موجود ہوں گے۔ صرف دروازے پر رنگدار پگڑیوں والے دو افراد ٹہل رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر انہوں نے ادب سے سلام کیا۔ ہماری آمد کی اطلاع اندر بھجوائی گئی۔ چوہدری محبت نے دروازے پر آکر ہمارا استقبال کیا۔ وہ بالکل مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ باتیں کرتا ہوا ہمیں اندر لے آیا۔

میں نے چبھتے لہجے میں کہا۔ "چوہدری محبت! کیا بات ہے، آج صبح سویرے تم ڈیرے پر موجود ہو؟"

چوہدری نے کہا۔ "کچھ نہیں تھانیدار! کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

"کچھ یا صرف ایک؟" میں نے پوچھا۔

"ایک نہیں دو۔" اس نے کہا۔ "لو ان سے ملو۔" میں نے دیکھا سامنے کمرے میں دو افراد بیٹھے تھے۔ ایک تو موٹے سے پیٹ اور بڑے سر والا کوئی [illegible] نانہ دار لگتا تھا اور دوسرا کوئی پڑھا لکھا شخص تھا۔

میں رسماً سلام دعا کے بعد فوراً محبت علی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے کہا۔ ”تمہارے ان مہمانوں کے سامنے بات ہو گی یا کہیں اور؟“

محبت علی اطمینان سے بولا۔ ”اگر بہت جلدی میں ہو تو یہیں کر لو۔“

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”لڑکی کو میرے حوالے کر دو۔“

چوہدری محبت نے ایک طویل ہنکارا بھرا اور بولا۔ ”تم اتنی جلدی میں ہو کہ میں اپنے مہمانوں کا تم سے تعارف بھی نہیں کرا سکا...... یہ ملک کے مشہور تاجر اور کارخانے دار سیٹھ رام چند بھائی ہیں، اس کا اشارہ موٹے شخص کی طرف تھا۔ پھر اس نے دوسرے شخص کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ”یہ ہیں میاں احمد پرویز ضلع کی انتظامیہ کے ایک ذمے دار افسر...“

پھر وہ اس ذمے دار افسر کے کوائف ظاہر کرنے لگا اور میں ششدر کھڑا رہ گیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ ایسے بااختیار شخص سے ایسے قانون شکن چوہدری کی بیٹھک میں ملاقات ہو گی اور وہ بھی شراب اور سگریٹوں کی بو میں۔ میاں احمد پرویز مطمئن نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ اب میرا کچھ کہنا سننا فضول تھا۔ اگر لڑکی یہاں موجود بھی تھی تو میں محبت علی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میں واپس جانے لگا تو میاں احمد پرویز اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ درازی سے بولے۔

”تم ایک دیانتدار انسپکٹر ہو......لیکن میرا خیال ہے حقائق سے اچھی طرح باخبر نہیں۔ لڑکی بالغ ہے اسے اغوا نہیں کیا گیا۔ وہ اپنی مرضی سے محبت علی کی پناہ میں آئی ہے۔ محبت علی کورٹ میں اس کا ثبوت فراہم کرے گا...... میں چاہتا ہوں کہ اگر لڑکی کے وارث خواہ مخواہ جھگڑا بڑھانے کی کوشش کریں تو تم انہیں روکو۔ یہ تمہارا فرض بھی ہے اور میرا حکم بھی۔

میں نے کہا۔ ”جناب! میرا فرض کیا ہے یہ مجھے نہ بتائیے...... کیونکہ شاید میں اسے آپ سے بہتر سمجھتا ہوں باقی آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔“

محبت علی بھی پاس تھا بولا۔ ”بڑوں کا حکم ماننے میں ہی عزت ہے۔“

میں نے کہا۔ ”خدا کا حکم ماننے میں بھی عزت ہے...... جو نہیں مانتے ان کی رسی دراز ضرور ہوتی ہے لیکن وہ سزا سے بچ نہیں سکتے۔“

اس سے پہلے کہ احمد پرویز کی بااختیار زبان سے کوئی تلخ کلمہ ادا ہوتا میں ایڑیوں پر گھوم کر باہر نکل گیا۔ میرا دستہ خاموشی سے میرے حکم کا منتظر تھا۔ میں نے انہیں حویلی سے باہر مختلف جگہوں پر کھڑا کر دیا۔ اور ”حکم“ کے مطابق محافظت کے فرائض انجام دینے لگا۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ ڈیرے کی چھت پر بھی مسلح آدمی نظر آ رہے تھے سب کی نظریں شمال میں کپور

گڑھ کی طرف لگی تھیں۔ اس علاقے میں اس قسم کی مسلح لڑائیاں عام تھیں لیکن میں نے اب تک کوئی لڑائی نہیں دیکھی تھی۔

قریباً ایک گھنٹہ انتظار میں گزر گیا۔ کسی قسم کی ہلچل نظر نہیں آئی۔ پھر ڈیڑھ گھنٹہ بھی گزر گیا۔ میں حیران ہو رہا تھا۔ واقعہ اگر عورت کے اغوا کا ہو تو وارثوں کا ردعمل ظاہر ہونے میں کبھی اتنی دیر نہیں لگتی۔ وہ عزت بچانے کے لیے فوری طور پر مجرم تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں...... تو کیا وہ جان چکے تھے کہ ان کی لڑکی کی عزت محفوظ نہیں رہی اور اب اطمینان سے بدلہ لینے کی تیاری کر رہے تھے۔ یا پھر وہ محبت علی کی طاقت سے خوفزدہ ہو گئے تھے۔ یہ بات بھی تسلیم کرنے والی نہیں تھی۔ کیونکہ پران کپور، محبت علی کا ہم پلہ بلکہ کچھ زیادہ ہی زور آور تھا۔ پھر کیا وجہ تھی...... دفعتاً ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا اور میرے ہاتھ خود بخود گھوڑے کی لگام پر آ گئے۔ چوہدری محبت اگر کینہ پرور تھا تو چوہدری پران اس سے بھی زیادہ کینہ پرور اور قانون شکن تھا۔ کہیں...... کہیں وہ اس کے بیوی بچوں پر تو حملہ آور نہیں ہو گیا؟

یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں نے سب انسپکٹر فرزند علی سمیت آٹھ گھڑ سوار رائفل برداروں کو ساتھ لیا اور تیزی سے سہارنپور کی طرف بڑھا۔ دو کوس کا فاصلہ ہم نے پلک جھپکتے میں طے کیا۔ ابھی ہم قصبے سے ایک کوس دور تھے کہ فضا میں سیاہ دھوئیں کے مرغولے نظر آئے۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سب انسپکٹر نے میری طرف اور میں نے اس کی طرف دیکھا اور گھوڑوں کی رفتار اور تیز کر دی۔

اندھا دھند گھوڑے بھگاتے ہوئے ہم قصبے میں داخل ہوئے تو گلیوں میں لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ ہر چہرہ دھواں دھواں تھا۔ چوہدری محبت علی کی بلند حویلی سے نکلنے والے شعلے اب آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ لوگ چاروں طرف سکتے کے عالم میں کھڑے تھے۔ وہ جانتے تھے یہ آگ اب بجھائے نہیں بجھے گی۔ پوری حویلی دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے حویلی کے اندر سے تین گھوڑے رسہ تڑا کر نکلے۔ ایک تو چند قدم بھاگ کر زمین بوس ہو گیا اور دوسرے ہنہناتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ایک بھینس لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آگ میں بھسم ہوئی۔ تپش اتنی زیادہ تھی کہ نصف فرلانگ دور کھڑا ہونا بھی دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے ایک شخص سے چیخ کر پوچھا۔ ”چوہدری کا بال بچہ بچا کہ نہیں۔“

اس نے رقت آمیز انداز سے نفی میں سر ہلا دیا۔ یہ ایک روح فرسا خبر تھی لیکن سننے کے سوا میں کیا کر سکتا تھا۔

خدا خدا کر کے آگ کچھ مدھم ہوئی۔ ارد گرد کے گھروں والے اپنے مکان بچانے کے لیے بھاگے میں بھی لوگوں میں راستہ بناتا ہوا حویلی کے قریب پہنچا۔ سیاہ رنگ حویلی کے باہر دو لاشیں پڑی تھیں۔ شاید آگ لگنے کے فوراً بعد لوگوں نے ان دو بدنصیب عورتوں کو بچانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ آگ لگنے سے پہلے ہی دشمنی کی آگ میں جل چکی تھیں۔ دونوں عورتوں کے جسموں پر گولیوں کے نشان تھے۔ ایک عورت عمر رسیدہ تھی اور دوسری نوجوان۔ نوجوان عورت شاید چوہدری محبت کی بیوی تھی اس کا بالائی لباس پھٹا ہوا تھا۔ مجرموں نے اسے زبردستی لے جانے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام ہو کر گولی مار دی تھی۔ چوہدری کے دو چھوٹے بچے اندر ہی رہ گئے تھے۔

لوگوں نے بتایا کہ وہ کم از کم ڈیڑھ سو افراد تھے اور سب کے سب آتشیں اسلحے سے مسلح۔ ان میں خطرناک ڈاکوؤں کا ایک ٹولہ بھی تھا۔ ان ڈاکوؤں نے سروں پر سیاہ ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ آتے ساتھ ہی انہوں نے زبردست ہوائی فائرنگ کی اور پھر چوہدری محبت کی حویلی پر ٹوٹ پڑے۔ حویلی میں موجود اکا دکا آدمیوں نے ان کا مقابلہ کیا لیکن چوہدری پران اور اس کے ساتھی ہر رکاوٹ کو توڑتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔

پران کے ڈیڑھ سو ساتھیوں کا سن کر میں ششدر رہ گیا۔ مجھے کیا کسی کو بھی امید نہیں تھی کہ وہ اتنی طاقت سے جوابی حملہ کرے گا۔ اس کے مقابلے میں چوہدری محبت کی تو کوئی حیثیت نہیں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت اس کے پاس ساٹھ پینسٹھ آدمی تھے۔ ان میں سے بھی صرف بیس پچیس کے پاس رائفلیں اور ریوالور وغیرہ تھے۔ باقی کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے مسلح تھے۔ دفعتاً مجھے پھر خطرے کا احساس ہوا۔ وہ غضب ناک ٹولہ اب کہاں تھا۔ کہیں اب وہ لوگ ڈیرے کی طرف تو نہیں گئے تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ خشک نالے میں سے گزر کر دوسری طرف سے چوہدری کے ڈیرے کی طرف نکل گئے ہوں۔ میں نے ایک بار پھر اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور واپس ڈیرے کی طرف لپکا۔ سردیوں میں زرد سورج سرسوں کے زرد کھیتوں پر چمک کر ہر طرف موت کی زردی پھیلا رہا تھا۔ میں اور میرے پریشان حال ساتھی ان کھیتوں میں سے گھوڑے بھگاتے چلے گئے۔

ایک کانسٹیبل چلا کر بولا۔ ”وہ دیکھیے جناب!“

میں نے ذرا گردن نکال کر دیکھا اور میرے تمام خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ چوہدری محبت کے ڈیرے سے بھی دھوئیں کے گہرے بادل اٹھ رہے تھے۔ کھیتوں میں کام کرتے کسان اور مزدور ہاتھوں میں درانتیاں، کسیاں تھامے کبھی چوہدری کے ڈیرے کی طرف

دیکھتے تھے اور کبھی سہارنپور سے بلند ہونے والے دھوئیں کو۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ کچھ کھیت مزدور ننگے پاؤں قصبے کو بھاگے جا رہے تھے۔ عجب افراتفری کا عالم تھا۔ ابھی ہم ڈیرے سے کچھ دور ہی تھے کہ چھاپہ مار پارٹی کی باقی نفری ایک کنوئیں پر کھڑی نظر آئی۔

میں نے سب انسپکٹر سے چلا کر پوچھا۔ ”کیا ہوا تم یہاں کیوں کھڑے ہو اور یہ دھواں؟“

سب انسپکٹر نے کہا۔ ”خاں صاحب! چوہدری محبت کے آدمی اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ کسی کو خبر نہیں تھی کہ چوہدری پران اتنے آدمیوں کے ساتھ حملہ کرے گا۔ جناب وہ ڈیڑھ پونے دو سو کے قریب آدمی تھے اور تمام کے تمام آتشیں ہتھیاروں سے مسلح۔ ان میں خطرناک ڈکیت بھی تھے۔ چوہدری محبت اور اس کے ساتھیوں نے بھاگ جانے میں ہی خیریت سمجھی اور یہ انہوں نے ٹھیک کیا ورنہ شاید کوئی بھی زندہ نہ بچتا۔ جب وہ سب لوگ بھاگ گئے تو ہم چند آدمی کیا کر سکتے تھے۔ ان سب نے شراب چڑھا رکھی تھی اور طیش میں اندھے ہو رہے تھے۔ میں نے ساتھی عملے کو وہاں سے ہٹا لینا ہی مناسب سمجھا۔“

”اور وہ لڑکی جسے محبت علی نے اغوا کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے اس کا کچھ پتہ نہیں۔“

”میں بتاتا ہوں جی۔“ ایک نوجوان کاشتکار آگے بڑھ کر بولا۔ اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس کھیت میں کام کر رہا تھا۔ ایک گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا آیا۔ میں نے دیکھا اس پر چوہدری صاحب (محبت علی) سوار تھے ان کے آگے ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ رسی میں بندھے تھے۔ وہ چیخ رہی تھی۔ پھر وہ کسی طرح گھوڑے سے نیچے گر گئی۔ مٹی نرم ہونے کی وجہ سے اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر بھاگتی چوہدری صاحب گھوڑا موڑ کر اس کے سر پر پہنچ گئے۔ نیچے اُتر کر اُنہوں نے...... یہاں تک کہہ کے نوجوان خاموش ہو گیا۔ شاید اچانک ہی اسے احساس ہوا تھا کہ وہ قصبے کے سب سے بااثر شخص کے خلاف گواہی دے رہا ہے۔ اس پر کوئی بھی مصیبت آ سکتی تھی۔ اسے خاموش ہوتے دیکھ کر میں نے اسے تسلی دی اور یقین دلایا کہ اس کے بیان سے چوہدری کو فائدہ ہی پہنچے گا۔ وہ بولا۔ ”جناب عالی! چوہدری صاحب نے نیچے اُتر کر لڑکی کو تھپڑوں سے مارا...... اور پھر بالوں سے کھینچتے ہوئے دوبارہ گھوڑے پر لے گئے۔ لڑکی ”ہائے پتا جی ہائے پتا جی“ چلا رہی تھی۔“

☆======☆======☆

میں حیران و پریشان کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں؟ چوہدری محبت کے پیچھے جاؤں جو ایک نوجوان لڑکی کو اغوا کر کے لے جا رہا تھا یا پران کپور اور اس کے درندہ صفت ساتھیوں کو دیکھوں جو ایک پورے گھرانے کو برباد کر چکے تھے۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک بات آئی اور مجھے لگا کہ میری مشکل آسان ہو گئی ہے۔ عین ممکن تھا کہ پران کپور اور اس کا گروہ بھی اسی راستے پر گیا ہو جس پر محبت علی لڑکی کو لے کر جا رہا تھا اور یہ وہ راستہ تھا جو اونچے نیچے ٹیلوں سے ہوتا ہوا بتدریج گھنے جنگل میں گھس جاتا تھا۔ اس راستے پر گھوڑا ڈالنے سے پہلے زبردست سوچ بچار کی ضرورت تھی لیکن میرے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ یا تو مجھے تمام دیکھے اور ان دیکھے خطرات کو قبول کر کے جنگل کی طرف بڑھنا تھا یا خود کو اور اپنے ساتھیوں کو صحیح سلامت لے کر واپس سہارنپور تھانے جا بیٹھنا تھا۔

لیکن کیا اب میں اس حیثیت سے تھانے جا سکتا تھا جس حیثیت سے صبح وہاں سے اٹھ کر آیا تھا..... ہرگز نہیں۔ یہاں تعیناتی کے بعد تھوڑے سے عرصے میں میں نے سخت محنت اور جانفشانی سے سہارنپور تھانے کو کچھ وقار بخشا تھا، لیکن آج ہونے والی لوٹ مار اور خونریزی نے اس وقار کو مٹی میں ملا دیا تھا۔ تھانہ اور تھانے دار ایک بار پھر مشکل میں تھے۔ عین ممکن تھا کہ کل سے پھر سہارنپور کے لوگ پولیس والوں کو دیکھ کر مذاق اڑانے لگیں گے۔ اس کا مطلب تھا ایک بار پھر وہی دور لوٹ آئے گا جب سہارنپور کے تھانے دار کو مجرم گرفتار کرنے سے پہلے چوہدری سہراب جیسے لوگوں سے باقاعدہ اجازت لینا پڑتی تھی..... پولیس والے اغوا ہوتے تھے اور تھانے پر ہلے بولے جاتے تھے۔ نہیں اب میں یہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ یہ قانون اور جرم کی جنگ تھی۔ گناہوں کی اس تاریکی میں یہ سر دھڑ کی بازی تھی اور وہیں کھڑے کھڑے میں نے یہ بازی لگانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے بلند آواز سے عملے کو ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اعلیٰ افسروں نے مجھے اس دور دراز تھانے میں تعینات کرتے وقت خصوصی سہولتیں فراہم کی تھیں۔ میرا ساتھی عملہ خاص تربیت یافتہ تھا اور اس وقت کے حساب سے میرے پاس ہتھیار بھی جدید اور وافر تھے۔ میرے ساتھی میرا چہرہ دیکھ رہے تھے اور اندازہ لگا رہے تھے کہ میں کیا حکم دینے والا ہوں۔ ان میں کچھ کے چہروں پر دبا دبا جوش تھا اور کچھ جنگل میں گھسنے کے خیال سے ہراساں بھی دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے پریشان نظر آنے والے چہروں کو ایک طرف کیا اور انہیں ضروری ہدایت کے ساتھ سب انسپکٹر فرزند علی کی تحویل میں دے کر واپس تھانے بھیج دیا۔ اب عملے کے 20 افراد میرے ساتھ تھے۔ ان میں پندرہ رائفل بردار تھے۔ دو ہیڈ

کانسٹیبل اور تین حوالدار اس کے علاوہ تھے۔ میں نے اپنی پارٹی کا جائزہ لیا اور اللہ کا نام لے کر جنگل کی طرف رخ کر لیا۔ بلال شاہ میرے پہلو میں گھوڑا بھگا رہا تھا۔ وہ بار بار سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور بلال ہی نہیں باقی عملے کی سوالیہ نظریں بھی مجھ پر لگی تھیں۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ اگر لوگوں کے کہنے کے مطابق پران کپور اور اس کے ساتھیوں کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب تھی تو پھر بیس بائیس پولیس والے ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے، لیکن میرے ذہن میں دو باتیں تھیں۔ اول یہ کہ پران کپور سے مڈبھیڑ ہونے کی صورت میں مجھے اس سے ٹکر نہیں لینا تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ پران کپور سے ہمدردی ظاہر کروں اور لڑکی کی برآمدگی کے سلسلے میں اسے اپنا تعاون پیش کروں۔ باقی معاملے لڑکی برآمد ہونے کے بعد دیکھے جا سکتے تھے۔ دوسرا امکان یہ بھی تھا کہ پران کپور کے ساتھ سرے سے ملاقات ہی نہ ہو۔ اس صورت میں محبت علی چھاپہ مار پارٹی سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔

چمکیلی دھوپ میں بل کھاتے راستے پر ہم نے تیز رفتاری سے سفر جاری رکھا۔ جلد ہی ہمیں اس بات کا اشارہ مل گیا کہ پران کپور قریباً پچاس ساتھیوں کے ساتھ اس راستے سے گزرا ہے۔ یہ اطلاع دینے والا ایک لکڑہارا تھا جو ایندھن کی تلاش میں دور تک نکل گیا تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں سہارنپور سے قریباً بارہ کوس کے فاصلے پر سچے سائیں کا ٹیلا تھا۔ اس مقام سے ڈاکوؤں کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا اور دن کے وقت بھی کوئی اس طرف جانے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ جس وقت شام کے سائے لمبے ہوئے ہم سچے سائیں کے مزار سے قریباً پانچ کوس آگے نکل آئے تھے۔ اس جگہ درخت بہت گھنے تھے اور لگتا تھا کہ اصل جنگل شروع ہو چکا ہے۔ ہمارے گھوڑے بری طرح تھک چکے تھے۔ بلال شاہ کا گھوڑا تو خاصا بے دم ہو رہا تھا۔ یہ بھی اس کی ہمت تھی کہ اس نے بھاری بھرکم بلال شاہ کو بغیر گرائے یہاں تک پہنچا دیا تھا۔

یہاں پہنچ کر مجھے پہلی بار شک ہوا کہ ہم راستہ بھٹک گئے ہیں۔ میں اس سے پہلے بھی اس خطرناک جنگل میں داخل ہو چکا تھا۔ اس وقت کسی موقع پر بھی اتنے گھنے درخت ہمارے راستے میں نہیں آئے تھے۔ میں نے سامنے کے درختوں کی طرف دیکھا اور مجھے اندازہ ہوا کہ شاید کچھ آگے چل کر ہمیں باقاعدہ شاخوں کو کاٹ کر راستہ بنانا پڑے گا۔ بلال شاہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس سے پہلے وہ ان درختوں سے نہیں گزرے۔ سرما کی دھوپ تیزی سے غائب ہو رہی تھی۔ اگر ہم بارہ گھنٹے کی طویل رات خالی پیٹ ان درختوں میں نہیں گزارنا چاہتے تھے تو ہمیں جلد ہی واپسی کا سفر شروع کرنا تھا۔ درحقیقت ہم بڑی افراتفری میں روانہ ہوئے تھے اور اس قابل نہیں تھے کہ تادیر جنگل میں رہ کر مجرموں کا سراغ لگائیں۔ میں نے حوالداروں سے

مشورہ کیا ان کی رائے بھی یہی تھی کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔کل یا پرسوں کسی وقت پوری تیاری کے ساتھ پھر جنگل میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔

گھوڑے کسی حد تک اپنی سانسوں پر قابو پا چکے تھے۔ہم نے باگیں موڑیں اور مشرق کی طرف روانہ ہو گئے،لیکن جلد ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ جنگل سے نکلنا اب اتنا آسان نہیں رہا۔ہم واقعی راستہ بھول چکے تھے۔قریباً ایک کوس مشرق میں چلنے کے بعد ہم نے خود کو ایک بالکل نئی جگہ پر پایا۔بالکل سنسان جنگل تھا۔کانٹے دار جھاڑیوں کی کثرت تھی۔کہیں کوئی پگڈنڈی یا راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔بس کبھی کبھی کوئی گلہری یا جنگلی خرگوش تیزی سے بھاگتا ہوا نگاہوں کے سامنے سے گزر جاتا۔سورج کی الوداعی کرنیں درختوں سے چھن کر ہمارے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔میں جانتا تھا کہ اگر ایک آدھ گھنٹے کے اندر ہم راستہ ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہوئے تو پھر رات یہیں گزارنا ہوگی۔

دفعتاً مجھے ایک شک سا ہوا۔دائیں طرف جنتر کی گھنی جھاڑیاں تھیں۔مجھے لگا جیسے ہمیں کوئی دیکھ رہا ہے میں نے ساتھیوں کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود احتیاط سے گھوڑا اچلاتا جنتر کی طرف بڑھا۔ایک بار پھر پتوں میں حرکت پیدا ہوئی اور کسی کے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔اگر میرے کان دھوکا نہیں کھا رہے تھے تو بھاگنے والا جانور نہیں کوئی انسان تھا۔میں نے گھوڑے کو آواز کی سمت بڑھایا۔چند گز آگے جا کر میں پھر رک گیا۔میری نظریں چاروں طرف درختوں کا طواف کر رہی تھیں۔عقب میں آہٹ ہوئی۔میں نے دیکھا بلال شاہ بھی میرے پیچھے چلا آیا تھا۔ہم دونوں گہری نظروں سے کوئی آہٹ سننے کی کوشش کرتے رہے۔میرا ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر ریوالور پر آ گیا تھا۔جب سے ہم روانہ ہوئے تھے پہلا موقع تھا کہ مجھے ریوالور کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔یکا یک بلال شاہ پکارا۔

"وہ رہا خان صاحب۔"

میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا قریباً دس گز دور ایک تناور درخت کے پیچھے سے کوئی شخص نکل کر اندھا دھند مخالف سمت میں بھاگا۔میں نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی۔اس کا دبلا پتلا جسم سیاہی مائل تھا اور وہ صرف ایک لنگوٹی پہنے ہوئے تھے۔کسی چھلاوے کی طرح وہ درختوں میں گم ہوا۔میں اور بلال شاہ نے ایک ساتھ ایڑ لگائی اور گھوڑے اس کے پیچھے بھگا دیئے۔گھنے درختوں میں یہ ایک دشوار تعاقب تھا۔کئی جگہ ہمارے گھوڑے گرتے گرتے بچے۔شاخوں کی ضربوں نے ہمارے چہرے پر خراشیں ڈال دیں۔قریباً چار فرلانگ کے اندھا دھند تعاقب کے بعد اس شخص نے پانی کے ایک جوہڑ میں چھلانگ لگا دی۔درختوں

کے بیچوں بیچ یہ کوئی ایک ایکڑ کا جوہڑ تھا۔حالانکہ اس نے نہایت خاموشی سے چھلانگ لگائی تھی یعنی "ڈائیو" کی تھی لیکن میری نظر اس پر پڑ گئی تھی۔اب وہ سانس روکے پانی کے اندر بیٹھا تھا۔بلال شاہ گھوڑے سے چھلانگ لگا کر جوہڑ کے کنارے پہنچا۔اس کے ہاتھ میں دیسی ساخت کا ریوالور تھا اور نظریں پانی پر جمی تھیں۔وہ ایک موٹی سی گالی نکال کر بولا۔

"کتنی دیر گھسا رہے گا۔نکل باہر تیری ایسی کی تیسی۔"

بلال شاہ کو زیادہ غصہ اپنی چوٹوں کا تھا۔تیز رفتار تعاقب کے دوران ایک درخت کی شاخ عین اس کی آنکھ پر لگی تھی اور اس آنکھ کے نیچے ایک نیلگوں ابھار پیدا ہو چکا تھا۔اچانک ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا۔کہیں چھلانگ لگانے والا اندر ہی اندر دوسری طرف تو نہیں جا رہا۔میں نے گھوڑی کو موڑا اور چکر کاٹ کر تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف گیا۔ابھی میں راستے میں ہی تھا کہ کوئی شخص پانی سے برآمد ہو کر تیزی سے کنارے پر چڑھا۔اس وقت بلال شاہ نے بوکھلاہٹ میں دو فائر کئے،لیکن اتنی دور سے یہ فائر کیا کر سکتے تھے۔میں پوری رفتار سے گھوڑا بھگاتا ہوا اس شخص کے سر پر پہنچا۔اب وہ پانی سے نکل کر سر جھکائے درختوں کی طرف لپک رہا تھا۔میں نے چلتے گھوڑے سے چھلانگ لگائی اور اسے لیتا ہوا بھربھری زمین پر گرا۔اجنبی کے حلق سے ایک خوفزدہ آواز نکلی۔پھر وہ زور زور سے چلانے لگا۔مجھے اس سے ایسی بزدلی کی توقع نہ تھی۔میرا گھونسہ اٹھنے کا اٹھا رہ گیا۔اجنبی میرے نیچے بڑا ڈری ڈری آوازیں نکال رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح بچ کر نکل جائے۔میں نے اس کی لنگوٹی پر مضبوطی سے ہاتھ ڈال کر اسے کھڑا کر دیا۔اب بلال شاہ بھی ہمارے پاس آ گیا تھا۔اجنبی کوئی مقامی دکھائی دیتا تھا۔عمر کوئی پینتالیس سال رہی ہوگی۔چہرے کے بال خود رو گھاس کی طرح بے ترتیب تھے۔پیشانی پر جھریاں تھیں۔وہ ہاتھ جوڑ کر ہم سے معافیاں مانگ رہا تھا۔میں نے اپنے سامان سے ہتھکڑی نکالی اور احتیاطاً اسے پہنا دی۔ہتھکڑی پہن کر وہ بھوں بھوں کی آواز سے رونے لگا،وہ مقامی لہجے میں بار بار کہہ رہا تھا۔"میرا کوئی قصور نہیں۔"

☆======☆======☆

تاریکی گہری ہو چکی تھی۔ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ہم اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر کافی آگے نکل آئے تھے۔پہلے ہم نے خاموشی سے ان کا انتظار کیا۔پھر زور زور سے آوازیں دیں۔ہوائی فائر بھی کئے،لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔لگتا تھا عملہ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش میں کچھ اور دور نکل گیا ہے۔سردی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ہم نے جوہڑ سے ہٹ کر آگ

جلائی اور اس کے گرد بیٹھ گئے۔ وہ عجیب مخبوط الحواس شخص تھا۔ خوف سے اس کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے موت کے فرشتے کو دیکھتا ہو۔ اس کی زبان کھلوانے سے پہلے مجھے بڑی حکمت سے اس کا خوف دور کرنا پڑا۔ اس کی کہانی کچھ اس طرح ہے۔

"اس کا نام غوث بخش تھا۔ وہ جس گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ سہارنپور سے پندرہ کوس مشرق کی جانب تھا۔ آج سے دس سال پہلے اس غریب کاشت کار کو قتل کے ایک کیس میں پھنسایا گیا۔ پھنسانے والا پولیس کا ایک اے ایس آئی تھا۔ یہ اے ایس آئی اس کی جوان بیٹی پر نظر رکھتا تھا، لیکن غوث بخش نے اس کی شادی کسی اور جگہ کر دی۔ اے ایس آئی نے انتقام لینے کے لئے غوث بخش کو ایک کیس میں ملوث کر دیا۔ پولیس جب غوث بخش کو پکڑنے کے لئے اس کے گھر پہنچی تو وہ ڈر کر بھاگ نکلا۔ کوئی دو ماہ وہ مختلف جگہوں پر چھپتا رہا۔ بالآخر اس جنگل میں پناہ گزین ہو گیا۔ وہ کوئی جرائم پیشہ تو تھا نہیں کہ ڈاکو بن جاتا۔ نہ ہی کوئی پڑھا لکھا شخص تھا کہ قانون کا سامان کرتا۔ وہ ایک سیدھا سادا دیہاتی تھا۔ اپنی جان بچانے کے لئے اس نے مستقل طور پر یہیں بسیرا کر لیا۔ میں اور بلال شاہ یہ سن کر حیران ہوئے کہ پولیس کا خوف اس بیچارے کو دس سال سے اس جنگل میں ٹھہرائے ہوئے تھا۔ اس دوران وہ ایک بار بھی کسی بستی میں نہیں گیا۔ ہاں کبھی کبھار وہ کسی کھیت کھلیان تک جا پہنچتا تھا اور وہاں سے اناج چرا لیتا تھا۔

وہ ایک نفسیاتی مریض بن چکا تھا۔ دس سال میں آج پہلی بار پولیس کی وردی دیکھی تھی اور خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلا تھا۔ ایک عجیب ڈرامہ تھا جو اس جنگل میں ہمارے لئے قطعی غیر متوقع تھا۔ باتیں کرتے کرتے وہ اچانک بلک بلک کر رونے لگتا اور معافیاں مانگنے لگتا تھا۔ مجھے جہاں اس پر ترس آ رہا تھا وہاں اس نظام سے نفرت بھی ہو رہی تھی جو ایک انسان کو تعلیم کی روشنی سے محروم کر کے اتنا بے وقوف بنا دیتا ہے اور ایک شخص کو اختیار کی ٹوپی پہنا کر اتنا عقل مند اور جابر بنا دیتا ہے کہ اے ایس آئی خدا بن جاتے ہیں اور غوث بخش جنگلوں میں بھاگ نکلتے ہیں۔

میری زندگی میں یہ بات بار بار سچ ثابت ہوئی ہے کہ نیکی رائیگاں نہیں جاتی۔ اگر میں غوث بخش کی کہانی سن کر اس سے ہمدردی نہ کرتا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا تو وہ سراغ کبھی میرے ہاتھ نہ آتا جو مجھے بالآخر محبت علی تک پہنچانے کا سبب بنا۔ میں نے غوث بخش کی کہانی سنتے ہی اس کی ہتھکڑی کھول دی تھی۔ رات گئے تک اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ وہ بے قصور ہے۔ میں اسے شہر لے

جاؤں گا اور اس کے ساتھ پورا تعاون کروں گا۔

اگلے روز صبح سویرے ہم اپنے ساتھیوں کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ غوث بخش کو میں نے اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا کیونکہ بلال شاہ کے ساتھ اسے بٹھانے کا مطلب تھا ایک گھوڑے پر تین آدمیوں کو بٹھانا۔ غوث بخش میرے عقب میں بیٹھا تھا۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ ایک نہایت نفیس قسم کی خوشبو میرے نتھنوں میں گھس رہی ہے۔ ایسا ہی احساس مجھے کل رات سے دو تین دفعہ ہو چکا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید بلال شاہ نے کوئی خوشبو لگا رکھی ہے لیکن اس سے ایسی نفاست کی توقع فضول تھی۔ وہ تو ان لوگوں میں سے تھا جو عطر میں ڈوبا ہوا روئی کا تو نبہ لے کر کان میں اُڑس لیتے ہیں اور ایسی تیکھی دار خوشبو بکھیرتے ہیں کہ روح بے قرار ہو جاتی ہے۔ پھر میں نے اسے وہم سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا تھا، لیکن اب وہی خوشبو پھر نتھنوں میں گھس رہی تھی اور اس دفعہ اتنی واضح تھی کہ اسے جھٹلانا ممکن نہیں تھا۔ تو کیا اس جنگلی غوث بخش نے یہ خوشبو استعمال کر رکھی تھی۔ ناقابلِ یقین بات تھی۔ وہ تو شاید آٹھ دس مہینے سے نہایا بھی نہیں تھا۔ آخر ایک جگہ میں نے گھوڑا روک کر اس سے پوچھا۔

"غوث بخش یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے؟"

پہلے تو اس نے لاعلمی ظاہر کی، پھر چونک کر اپنی لنگوٹی میں ہاتھ ڈالنے لگا۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنی لنگوٹی میں سے ایک خوبصورت زنانہ رومال نکالا۔ خوشبو اسی رومال سے اٹھ رہی تھی۔ پیلے رومال پر خون کے سرخ دھبے بھی نظر آ رہے تھے۔

"یہ تجھے کہاں سے ملا؟" بلال شاہ نے ایسے پوچھا جیسے یہ اس کی بیوی کا رومال ہو۔

غوث بخش بولا۔ "سائیں! زمین پر پڑا ملا تھا...... مم میں نے چوری تو نہیں کیا۔"

میں نے نرم لہجے میں اس سے پوری بات دریافت کی۔ غوث بخش نے بتایا کہ کپڑے کا یہ ٹکڑا کل اسے جھاڑیوں میں پڑا ملا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے رومال فیشن ایبل عورتیں استعمال کرتی ہیں۔ اسے شک گزرا کہ یہیں کہیں نزدیک رومال والی بھی موجود ہے۔ وہ درختوں میں قدموں کے نشان ڈھونڈتا پھرتا تھا کہ ہم نظر آ گئے۔ وہ سمجھا کہ بالآخر پولیس اسے پکڑنے پہنچ گئی ہے اور وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ رومال، خوشبو، عورت میرے ساتھ ساتھ بلال شاہ کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ ہو نہ ہو یہ محبت علی اور اس لڑکی کا معاملہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم گھوڑے بھگاتے تیزی سے کل والی جگہ کی طرف بڑھ رہے تھے حسبِ توقع ہمارے ساتھی وہاں موجود نہیں تھے۔ شاید وہ کل رات ہی واپسی کا سفر اختیار کر چکے تھے۔ غوث بخش گھوڑے سے اُترا اور جلد ہی کھرا اٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس

معاملے میں اس کی مہارت حیرت انگیز تھی۔ ہمیں خشک پتوں پر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن وہ ہمیں لے کر بڑے اعتماد سے آگے بڑھ رہا تھا۔ کوئی ایک کوس اسی طرح چلنے کے بعد ہم نے وہی خشک نالہ پار کیا اور دائیں طرف مڑ گئے۔ ہم دونوں گھوڑوں پر سوار تھے اور غوث بخش پیدل چل رہا تھا۔ ایک جگہ رک کر وہ بولا۔

''سرکار میرا خیال ہے وہ عورت اور مرد اس سامنے ٹیلے پر چڑھے ہیں۔ اوپر درختوں کے بہت سے جھنڈ ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ کسی جھنڈ میں چھپے ہوں۔''

میں نے بلال شاہ سے پوچھا۔ ''کیوں نہ میں اکیلا اوپر جاؤں؟''

بلال شاہ جو لڑائی دنگے کا شوقین تھا تھوڑی سی بحث کے بعد راضی ہوگیا۔ میں نے ان دونوں کو درختوں کے درمیان ایک محفوظ جگہ چھوڑ دیا۔ پھر ریوالور چیک کرکے آہستہ آہستہ ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ یہ کچی مٹی کا ٹیلا تھا۔ دیہات میں ایسے ٹیلوں کو ''تھے'' بھی کہتے ہیں۔ جھاڑ جھنکاڑ کافی تھا۔ بھربھری زمین پر کثرت سے جانوروں کے پنجوں کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں کبھی کبھی مجھے ایک جوتے یا ننگے پاؤں کی جھلک بھی نظر آجاتی تھی۔ ننگا پاؤں لڑکی کا تھا اور میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک نہایت خوبصورت پاؤں تھا۔ اس سے پہلے میں یہ پاؤں ایک شیشے کی تپائی پر دیکھ چکا تھا۔ جب وہ اپنے باپ کی حویلی میں بڑی شان سے منہ کے سامنے رسالہ رکھے بیٹھی تھی۔ اب اپنے باپ کے گناہوں کی سزا اسے بھگتنا پڑ رہی تھی۔ ایک بپھرا ہوا چوہدری ایک گھوڑی کے بدلے اسے کانٹوں پر گھسیٹتا پھر رہا تھا۔

جوں جوں میں آگے بڑھ رہا تھا دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔

''چوہدری محبت'' میں نے بلند آواز سے اسے پکارا۔

میری تیسری آواز پر دائیں جانب جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور میں نے ایک دراز قد شخص کو ہاتھ میں تھری ناٹ تھری تھامے دیکھا...... وہ چوہدری محبت ہی تھا لیکن عجیب حلیے میں۔ کپڑے تار تار تھے ایک بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی اور بالوں پر گرد جمی تھی۔ وہ بڑے خونی انداز سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''خبردار، تھانیدار۔ میرے قریب نہ آنا'' وہ گرجا۔

میں نے اطمینان سے ریوالور ہولسٹر میں ڈالا اور بولا۔ ''محبت، میں دشمن بن کر نہیں دوست بن کر آیا ہوں۔ تمہارے بیوی بچوں کے قاتل تک پہنچنے کے لئے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''نہیں تھانیدار۔'' محبت پھر گرجا۔ ''مجھ سے پولیس والی کوئی چال نہ چلنا۔ میرے لئے تجھ میں اور چوہدری پران میں کوئی فرق نہیں۔''

میں دھیمے لیکن بااعتماد قدموں سے آگے بڑھتا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اب ہم دونوں میں صرف چار گز کا فاصلہ تھا۔ اس وقت میری نگاہ بیلا پر پڑی۔ اس کے دونوں ہاتھ عقب میں بندھے تھے اور وہ اوندھے منہ زمین پر پڑی تھی۔ اس کی سفید بوشرٹ اور دھاری دار پینٹ مٹی میں لت پت تھی۔ پاؤں ننگے تھے، لیکن وہ زخمی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ شاید اس کے رومال پر لگا خون محبت علی کے بازو کا تھا۔

محبت علی پھر گرجا۔ ''تھانیدار، کوئی مطالبہ نہ کرنا۔ میں اس لڑکی کو نہیں چھوڑوں گا۔ رک جاؤ۔ میرے سر پر خون سوار ہے، میں گولی چلا دوں گا۔''

اس وقت میں نے وہی حربہ آزمایا جس کے متعلق آپ عموماً کہانیوں میں پڑھتے ہیں یا فلموں میں دیکھتے ہیں۔ میں نے چوہدری کے عقب میں دیکھتے ہوئے زور سے کہا۔ ''ٹھہرو گولی نہ چلانا......'' چوہدری محبت نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا۔ میں یہی چاہتا تھا۔ چند لمحوں کے لئے اس کی توجہ مجھ سے ہٹی۔ میں نے تیزی سے حرکت کی اور دو قدم بھاگ کر چوہدری پر چھلانگ لگا دی۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں وہ ایک لمبا تڑنگا نوجوان چوہدری تھا...... عام دیہاتیوں کی طرح سخت جان اور اکھڑ، لیکن نہایت ذہین۔ یوں بھی اس وقت اُس پر وحشت سوار ہو رہی تھی۔ درحقیقت اس کی حالت ایک زخمی چیتے سے مختلف نہیں تھی۔ میں جانتا تھا اسے زیر کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا اور واقعی یہ ایک سخت مقابلہ ثابت ہوا۔ ہم دونوں اوپر تلے کچی زمین پر گرے۔ میرا ایک ہاتھ تھری ناٹ تھری پر تھا۔ زمین سے ٹکراتے ہی چوہدری نے ایک جھٹکے سے بندوق سیدھی کرنا چاہی لیکن میری گرفت مضبوط تھی۔ کشمکش کے دوران ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی داؤ آزماتا محبت علی کی بھرپور ٹکر میری پیشانی پر پڑی اور میں لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ بالکل یہی وار میں اس پر کرنے والا تھا، لیکن وہ پہل کر گیا اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ مدمقابل لڑائی بھڑائی کا ماہر ہے۔ اب میں اس سے دو گز کے فاصلے پر کھڑا تھا اور وہ بندوق سیدھی کر رہا تھا۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر خطرناک بات اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں مَیں نے فیصلہ کیا اور نہایت تیزی سے آگے بڑھ کر ایک بھرپور ٹھوکر بندوق والے ہاتھ پر رسید کی۔ میں جانتا تھا اس وار کے خطا ہونے کی قیمت کیا ہوگی۔ تھری ناٹ تھری کی گولی میرے جسم میں ناقابلِ مرمت روشن دان کھول سکتی تھی۔ ٹھوکر کا بھرپور اور بروقت ہونا ضروری تھا اور میری یہ دونوں

توقعات پوری ہوئیں۔اس سے پہلے کہ محبت علی کی انگلی لبلبی دباتی بندوق اس کے ہاتھوں سے نکلی اور قلابازیں کھا کر جھاڑیوں میں جا گری۔لڑائی کے دوران کسی شخص کے ہاتھ سے ہتھیار نکل جائے تو وہ بھونچکا رہ جاتا ہے لیکن چوہدری محبت علی کی پھرتی نے مجھے حیران کر دیا۔ایک لمحہ ضائع کئے بغیر وہ مجھ سے آٹکرایا۔میں نے نیچے گرتے گرتے اسے ٹانگوں پر اچھال دیا۔وہ چند گز ڈھلوان پر لڑھک کر پھر کھڑا ہو گیا۔اس دوران میں ریوالور نکال چکا تھا، لیکن محبت علی کی پھرتی ایک بار پھر کام دکھا گئی۔گولیوں کی پیٹی جو اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی، پھسل کر خود بخود اس کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔اس نے نہایت تیزی سے پیٹی گھمائی اور میرا ہاتھ جھنجھنا اٹھا۔ریوالور میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔میں نے ریوالور کی طرف لپکنا چاہا لیکن محبت نے نہایت وحشت کے عالم میں دوسری مرتبہ پیٹی گھمائی۔اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ''چانگر'' کی آواز نکلی میں نے نیچے جھک کر یہ وار بچایا۔تیسرا وار اس سے بھی تیزی کے ساتھ کیا گیا۔میں الٹے قدموں پیچھے ہٹا۔چوتھا وار میں نے اپنی کلائی پر روکا اور وزنی بیلٹ تھام لی۔میری بھرپور لات اس کے سینے پر پڑی وہ نیچے جھکا تو داہنے گھٹنے نے اس کا استقبال کیا۔دفعتاً محبت علی کی نظر اس جھاڑی کی طرف اٹھ گئی جہاں بیلا پڑی تھی۔تھوڑی دیر کے لئے ہم لڑکی کو بالکل فراموش کر گئے تھے اور اب وہ وہاں نظر نہیں آ رہی تھی۔

''بیلا۔'' محبت علی کی آواز ویرانے میں گونجی۔وہ بھاگ کر ٹیلے کی چوٹی پر پہنچا اور دوسری طرف نشیب میں دیکھنے لگا۔دور تک پھیلی ہوئی جھاڑیوں میں بیلا کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''بہت بُرا ہوا۔یہ بہت بُرا ہوا۔'' محبت علی بڑبڑایا۔''وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''کون کسے زندہ نہیں چھوڑیں گے؟'' میں نے محبت علی سے پوچھا۔

محبت علی نے چونک کر میری طرف دیکھا اور ایک بار پھر اس کے چہرے پر طیش کے آثار نظر آئے، لیکن اب ریوالور میرے ہاتھ میں تھا اور انگلی لبلبی پر۔محبت علی باغی لہجے میں بولا۔

''تھانیدار مجھے موت سے نہ ڈرا۔اب میرے لئے موت اور زندگی میں کوئی فرق نہیں۔میرا رہا ہی کون ہے جس کے لئے میں زندہ رہوں گا۔میں ڈیرے پر پران کپور اور اس کے غنڈوں کے للکارے سن چکا ہوں۔وہ میرے بیوی بچوں کو ہلاک کر کے میرے گھر کو راکھ کا ڈھیر بنا چکے ہیں۔اب تو میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہے پران کپور کی اذیت ناک موت۔''

چوہدری کی آنکھوں میں شعلے رقص کر رہے تھے۔میں نے کہا۔''محبت علی دیکھ لے، تُو نے میری بات نہیں مانی تھی اور انجام کیا ہوا۔ . . اب پھر میں تجھ سے کہہ رہا ہوں قانون کو ہاتھ میں نہ لے۔تیرا انتقام اب قانون کی ذمے داری بن چکا ہے۔قانون کی مدد کر قانون کی مدد کر۔''

چوہدری بدستور مجھے گھورتا رہا۔میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ ریوالور ہولسٹر میں ڈال لیا۔

بلال شاہ اور غوث بخش گھوڑے لے کر ٹیلے کے اوپر چڑھ آئے تھے۔محبت علی ایک درخت سے ٹیک لگائے ہمارے درمیان بیٹھا تھا۔اس کی حالت اس جواری کی سی ہو رہی تھی جو سب کچھ ہار کر اب خودکشی کا سوچ رہا تھا۔اس نے گھمبیر آواز میں کہا۔''تھانیدار! پچھلے چوبیس گھنٹے مجھ پر بہت بھاری گزرے ہیں۔میں اس لڑکی کو لے کر مسلسل بھاگتا رہا ہوں۔پران کپور اور اس کے آدمی شکاری کتوں کی طرح ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔وہ آٹھ آٹھ دس دس کی ٹولیوں میں بٹ کر اس سارے علاقے میں ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔کل رات یہاں سے چار پانچ کوس شمال کی طرف پران کپور کے آدمیوں نے مجھے گھیر لیا۔کوئی دو گھنٹے گولیاں چلتی رہیں۔میرا بازو بھی زخمی ہو گیا لیکن میں لڑکی کے ساتھ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ایک جگہ جنگلی سؤروں نے ہمیں گھیر لیا اور ایک جگہ شہد کی مکھیوں نے ہمارا پیچھا کیا۔بھاگتے ہوئے لڑکی کا پاؤں مڑ گیا اور مجھے اسے کندھے پر اٹھا کر دو گھنٹے پیدل بھاگنا پڑا اور وہ بھی شدید بھوک اور پیاس کے عالم میں۔''

میں نے کہا۔''محبت علی اپنا سب سے بڑا دشمن تُو خود ہے۔ایک گھوڑی کی خاطر تُو نے ایک کنواری لڑکی کو اغوا کیا۔اس اغوا کے بدلے تیرا گھر برباد ہوا اور اب اس لڑکی کو انتقام کا نشانہ بنانے کے لئے تُو جنگل جنگل بھاگ رہا ہے۔''

محبت علی نے طویل سانس لے کر اپنے الجھے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور بولا۔''تم ٹھیک کہتے ہو تھانیدار۔جب میں نے لڑکی کو اغوا کیا تھا تو اسے انتقام کا نشانہ بنانے کے لئے کیا تھا، لیکن اب نہیں......اب اس سے میری کوئی دشمنی نہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

وہ بولا۔''تھانیدار، اب وہ میرے دشمنوں کی دشمن ہے۔اس لئے مجھے اس سے کچھ نہیں لینا۔شاید یہ بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔میں تمہیں بتا سکتا ہوں مگر ہو سکتا ہے تم اس پر یقین نہ کرو۔''

"میں تمہارے اور پران کپور کے ہر پاگل پن پر یقین کر سکتا ہوں۔"

وہ تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "ہاں یہ پاگل پن ہی تو ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح میں نے اپنی گھوڑی کو گولی مار کر مارا تھا اسی طرح پران کپور اپنی لاڈلی بیٹی کو گولی سے اُڑا دے گا۔ اس کے پاگل کتے صرف میرے خون کے ہی نہیں بیلا کے خون کے بھی پیاسے ہیں۔ میں نے اس بے وقوف لڑکی کو بہت سمجھایا کہ اب تیرے اور میرے دشمن ایک ہو گئے ہیں لیکن بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ چلی گئی۔"

"کہاں چلی گئی؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

محبت علی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور دور نشیب میں انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"ان اونچے درختوں میں پران کپور کے آدمی موجود ہیں۔ بیلا انہی کی طرف گئی ہے۔"

یہ اطلاع ہمارے لئے بم کا دھماکہ ثابت ہوئی۔ میں نے کہا۔ "تو تمہارا خیال ہے وہ اسے گولی مار دیں گے۔" محبت علی نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں چلا کر بولا۔ "اور تم یہاں اطمینان سے کھڑے ہو۔"

"ہاں۔" محبت علی سکون سے بولا۔ "ہوگا وہی جو میں نے کہا ہے، لیکن اسی طرح ہوگا جیسے میں نے سوچا ہے۔ پہلے پران کپور کے شکاری اس ٹیلے تک آئیں گے۔"

اب مجھے اس کی بات سمجھ میں آرہی تھی۔ ظاہر تھا اگر وہ لوگ بیلا کو دیکھتے ہی ہلاک کر دیتے تو اس سے محبت علی کا ٹھکانہ کیسے پوچھتے۔ غالباً محبت علی کا خیال تھا کہ وہ پہلے بیلا کو بہلا پھسلا کر یہاں لائیں گے اور محبت علی کو گرفتار کرنے کی کوشش کریں گے۔ واقعی محبت علی ایک معاملہ فہم شخص تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "اگر تمہارا اندازہ درست ہے اور وہ لوگ بیلا کو لے کر یہاں پہنچنے والے ہیں تو ہمیں کہیں چھپنا چاہئے۔"

"بالکل خان صاحب۔" بلال شاہ جو اب سارے واقعے کو سمجھ رہا تھا آنکھیں گھما گھما کر قدرے پریشانی سے بولا۔

"تو پھر اٹھو۔ سوچتے کیا ہو۔" میں نے اس سے کہا۔ ہمارے ساتھ ساتھ محبت علی بھی کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کل کتنے آدمی ہیں۔

"کم از کم دس۔" اس نے جواب دیا۔ "ہم کل رات ان کے بہت قریب سے گزرے تھے۔"

میں نے ارد گرد نظر دوڑائی۔ چھپنے کی کوئی مناسب جگہ دکھائی نہیں دی۔ قریبی جھاڑیوں میں چھپنا کسی طرح خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہم چار آدمی تھے لیکن ہمارے پاس صرف دو

ریوالور تھے۔ محبت علی کی بندوق قریباً بیکار تھی کیونکہ رات کے مقابلے کے بعد اس کے پاس صرف دو گولیاں باقی بچی تھیں۔ میری نگاہ کچھ دور ایک بلند درخت پر پڑی۔ کافی گھنا درخت تھا۔ "السٹونیا" کی طرح لگتا تھا۔ اس کی شاخوں میں با آسانی چھپ کر بیٹھا جا سکتا تھا لیکن مسئلہ بلال شاہ کا تھا۔ اس کے لئے اوپر چڑھنا خاصا دشوار تھا۔ میں نے بلال شاہ سے کہا کہ وہ گھوڑے لے کر خشک نالے کی طرف نکل جائے اور کسی جگہ چھپ کر بیٹھا رہے۔ ہم جلد ہی اس تک پہنچ جائیں گے۔ بلال شاہ نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ وقت بہت کم تھا۔ پران کپور کے آدمی کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ سب سے پہلے غوث بخش بندر کی پھرتی سے اوپر چڑھ گیا۔ اس کے بعد محبت علی اور آخر میں مَیں درخت پر آ گیا۔ ہم نے خود کو حتی الامکان شاخوں میں چھپا لیا اور وقت کا انتظار کرنے لگے۔ بمشکل نصف گھنٹہ گزرا تھا کہ سامنے جھاڑیوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ میلے کچیلے سیاہ لباس میں ملبوس کم و بیش دس آدمی گھوڑے بھگاتے نمودار ہوئے اور ٹیلے پر پھیل گئے۔ وہ بلند آواز سے محبت علی کو للکار رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا ان میں مجھے پران کپور یا اس کا کوئی بیٹا نظر نہیں آیا۔ کافی دیر وہ ٹیلے پر اور گرد و نواح میں گھومتے رہے۔ انہوں نے درختوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا لیکن یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ کسی کی نظر ہم پر نہیں پڑی۔ کافی بھاگ دوڑ کے بعد وہ سب کے سب دھوپ میں بیٹھ گئے اور بیڑی کے کش لگانے لگے۔ بیلا بھی ان میں موجود تھی۔ اس کے ہاتھ اب کھلے ہوئے تھے۔ وہ ان لوگوں کے قریب بیٹھنے کی بجائے ایک درخت کے ساتھ کھڑی تھی۔ ان کی آوازیں صاف ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ایک شخص جو اس پارٹی کا انچارج معلوم ہوتا تھا۔ بلند آواز سے بولا۔

"آ جا ری۔ اپن کے پاس۔ اُدھر کھڑی ہو کے کیوں جان جلاتی ہے۔"

بیلا خاموش رہی۔ پھر ڈاکوؤں نے آپس میں نہ جانے کیا بات کی کہ سب کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ ان کا رویہ بیلا سے کچھ ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ شاید محبت علی کی بات ٹھیک ہی تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ڈاکوؤں کے انچارج نے اپنے ساتھیوں کو قریب بلایا۔ اس کی بارعب آواز سنائی دی۔

"وہ اُلو کے پٹھے زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے انہیں تلاش کرو۔ دو دو ہو کر چاروں طرف پھیل جاؤ....." پھر وہ اپنی بیہودہ زبان میں ساتھیوں کو میری اور محبت علی کی تلاش کے بارے میں ہدایت دینے لگا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ میری آمد سے آگاہ ہو چکا ہے لیکن اسے یہ پتہ نہیں تھا کہ میرے ساتھ دو اور افراد بھی ہیں۔ ظاہر ہے بیلا نے صرف مجھے

دیکھا تھا اور یہی اس نے ڈاکوؤں کو بتایا۔ ساتھیوں نے انچارج کی ہدایت پر عمل کیا۔ اب درخت کے نیچے بیلا کے علاوہ صرف تین افراد رہ گئے تھے۔ ان میں ایک انچارج تھا اور دوسرے اس کے خاص ساتھی معلوم ہوتے تھے۔ میں نے دیکھا ان تینوں کی آنکھوں میں شیطانی چمک دکھائی دے رہی تھی۔ ایک نے خانہ ساز شراب کی بوتل سامنے رکھی ہوئی تھی اور مسلسل چڑھا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اب نشے سے سرخ تھیں۔ پھر سب سے پہلے اس کی آواز سنائی دی۔

”چھوڑو یار! کیوں ہیرا برباد کرتے ہو۔“

انچارج بولا۔ ”راجن...... سردار کو پتہ چلے گا تو کتے کی موت مارے گا۔“

راجن شرابی لہجے میں بولا۔ ”ارے کاہے کو مارے گا۔ اس نے ہمیں حکم دیا ہے جہاں لونڈا یا لونڈیا ملے ختم کردو۔ اس کے لئے یہ سالی مرگئی...... بس فنش۔“

”مگر پھر بھی......“ انچارج گڑبڑایا۔

”اگر مگر کچھ نہیں...... لو یہ پیو۔“ راجن نے شراب کی بوتل زبردستی اس کے منہ سے لگا دی۔ اس نے دو تین تلخ گھونٹ پیئے۔ پھر ہونٹ پونچھ کر دزدیدہ نگاہوں سے بیلا کی طرف دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد بولا۔

”سسری ہے تو بڑی جوردار...... لیکن۔“

”پھر وہی لیکن۔“ جہاندیدہ راجن نے اسے گھورا۔ ”یہ جنگل ہے استاد یہاں جنگل کا قانون چلتا ہے۔ ہر جور آور کجور کو کھاتا ہے۔ سردار ہم کو کھاتا ہے۔ سردار کو شہر میں بیٹھے ہوئے بڑے بڑے افسر کھاتے ہیں تو ہم اسے کیوں نہ کھائیں جو ہمارے پنجے میں ہے۔ ہم حرامجادی کو گھر میں تو نہیں ڈال رہے۔ سردار کے حکم کے مطابق قتل ہی کر رہے ہیں...... بس ذرا......“

انچارج نے بوتل منہ سے لگائی اور خالی کر گیا۔ پھر وہ جھومتا ہوا اٹھا اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر بیلا کی طرف بڑھا۔ وہ چونکہ کچھ دور کھڑی تھی اس لئے ڈاکوؤں کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سن پائی تھی۔ انچارج کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ ذرا سی ٹھٹکی، لیکن اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔ وہ تو جان پر کھیل کر ان کی پناہ میں پہنچی تھی کہ وہ اس کے پتا کے دوست ہیں۔ اب وہ بھاگ کر کہاں جاتی۔ ہراساں نظروں سے دیکھتی رہی۔ انچارج نے بیلا کو سر سے پاؤں تک گھورا، پھر اس کی خوبصورت بانہوں کو دھیرے دھیرے تھام لیا۔ اس دوران راجن بھی لڑکھڑاتا ہوا اس کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے بیلا کے بالوں پر ہاتھ ڈال کر ایک جھٹکا دیا

اور وہ جیسے اڑتی ہوئی زمین پر جا گری۔ اب تینوں درندے اس کے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے...... ایک لمحے کے لئے میری نظروں میں وہ منظر گھوم گیا جب یہی لڑکی بڑی رعونت سے چھڑی لئے کھڑی تھی اور ایک عمر رسیدہ ملازم کو پیٹ رہی تھی۔ وہ اسی طرح زمین پر پڑا گڑگڑا رہا تھا۔ قدرت انسان کو کیسے کیسے منظر دکھاتی ہے۔ میں اس وقت بھی ظالم کا ہاتھ روکنے کے لئے آگے بڑھا تھا اور مجھے آج بھی بڑھنا تھا۔ کیونکہ مجھ پر قانون کی حفاظت کی ذمے داری تھی اور قانون ظالم پر بھی ظلم کی اجازت نہیں دیتا۔

”خبردار گولی ماردوں گا۔“ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

تینوں افراد نے چونک کر اوپر دیکھا اور ان کے چہرے خوف سے سیاہ ہوگئے۔ نادیدہ دشمن کا خوف بہت ہوتا ہے اور وہ تو رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ راجن نامی شخص نے بندوق اٹھانے کی کوشش کی۔ میرے ریوالور کی گولی اس کی گردن میں لگی اور وہ تڑپ کر نیچے گرا۔ ”خبردار بھون ڈالوں گا۔“ میں نے چلا کر کہا۔ اس وقت میں نے دیکھا، محبت علی نے درخت سے چھلانگ لگائی اور ڈاکوؤں کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کا چہرہ وحشت ناک ہو رہا تھا۔ پھر اس نے بندوق لاٹھی کی طرح تھامی اور دونوں افراد پر پل پڑا۔ یہ منظر دیکھ کر میں اور غوث بخش بھی نیچے اتر آئے۔ ہمیں دیکھ کر ایک ڈاکو تو بھاگ نکلا لیکن دوسرے کے سر پر محبت علی نے بندوق کا ایسا دستہ مارا کہ وہ سر پکڑ کر سجدے کی حالت میں گرا اور وہیں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ محبت علی نے اپنی بندوق سیدھی کی تا کہ اسے گولی مار سکے لیکن اس وقت اچانک چیخ و پکار اور گھوڑے دوڑنے کی آوازیں آئیں۔ شاید میرے ریوالور کے فائر نے باقی ڈاکوؤں کو متوجہ کرلیا تھا۔ وہ تیزی سے اس طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے بھاگ کر بیلا کا بازو پکڑا اور محبت علی کو دھکیلتا ہو [illegible] ف بڑھا۔ اس وقت ڈاکوؤں سے ٹکر لینا کسی طور سود مند نہیں تھا۔ ایک ریوالور کے [illegible] مسلح افراد کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ قریباً ایک فرلانگ درختوں میں بھاگنے کے بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ ڈاکو ہمارے پیچھے آرہے ہیں۔ ان کی ہوائی فائرنگ سے جنگل گونج رہا تھا۔ اس موقع پر غوث بخش نے بہت کام دیا۔ وہ جنگل کے چپے چپے سے واقف نظر آتا تھا۔ اس نے ہمیں ایسے راستوں پر ڈالا جہاں تیز رفتاری برقرار رکھی جا سکتی تھی۔ پھر بھی ڈاکوؤں سے ہمارا فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو وہ گھوڑوں پر سوار تھے، دوسرے بیلا کے پاؤں میں موچ تھی اور وہ ہمارے ساتھ تیز رفتاری سے بھاگ نہیں سکتی تھی۔ جلد ہی ڈاکو ہمارے قریب پہنچ گئے۔ ان کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ چاروں طرف پھیل کر آرہے ہیں۔ میں نے بھاگتے بھاگتے اپنے ریوالور کی گولیاں گنیں وہ

کل پندرہ تھیں۔ ان گولیوں سے ہم بمشکل پانچ منٹ خود کو ڈاکوؤں سے دور رکھ سکتے تھے۔
دفعتاً غوث بخش ہمیں لے کر دائیں طرف مڑ گیا۔ کوئی پچاس گز آگے وہی جوہڑ نظر آ رہا تھا
جہاں کل غوث بخش سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ نہ جانے وہ ہمیں کون سے راستے سے
لایا تھا۔ جوہڑ تک کا فاصلہ بہت کم محسوس ہوتا تھا۔ جوہڑ کے کناروں پر اور اس کے اندر
سرکنڈے اور خودرو گھاس کثرت سے اُگی ہوئی تھی۔ غوث نے لپک کر گھاس کی تین چار
ڈنڈیاں توڑیں۔ ان ڈنڈیوں میں نلکیوں کی طرح سوراخ تھے۔ غوث بخش نے ایک نلکی کا سرا
منہ میں دبا کر بتایا کہ ہم پانی کے نیچے بیٹھ کر ان نلکیوں سے کس طرح سانس لے سکتے ہیں۔

ہم نے پانی میں چھلانگ لگائیں اور غوث بخش کی ہدایت کے مطابق نلکیاں منہ میں دبا
کر بیٹھ گئے۔ نلکیوں کا بالائی سرا پانی سے باہر تھا اور چونکہ جھاڑ جھنکاڑ جوہڑ کے اندر بھی تھا اس
لئے ہماری موجودگی کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ دوسروں کا تو مجھے معلوم نہیں لیکن مجھے پانی کے
اندر سانس لینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اس طریقہ کے بارے میں مَیں نے پہلے بھی بہت
پڑھا اور سنا تھا لیکن ایک چیز کے بارے میں مجھے بالکل علم نہیں تھا اور وہ تھی جونکیں۔ جوہڑ کے
دلدلی پانی میں بیسیوں جونکیں موجود تھیں۔ جلد ہی میرے جسم کے ننگے حصوں میں جونکیں
چمٹ گئیں اور اطمینان سے "دعوت" اُڑانے لگیں۔ ہاتھ ہلانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
تھا۔ ایک ہاتھ نلکی پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے میں نے ایک سرکنڈے کو تھام رکھا تھا تاکہ پانی
اچھال کر جسم کو جوہڑ کی سطح پر نہ لے آئے۔ کانوں میں پانی کے ٹکراؤ کے سوا کوئی آواز سنائی
نہیں دیتی تھی لیکن میں جانتا تھا جوہڑ کے کنارے ہماری تلاش ہو رہی ہوگی۔ مجھے سب سے
زیادہ خطرہ اس ریوالور کا تھا جو میں پانی میں کودنے سے پہلے سرکنڈوں میں پھینک آیا تھا۔ اگر
ریوالور پر ڈاکوؤں کی نظر پڑ جاتی تو وہ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ ہم جوہڑ میں کودے ہیں۔ دوسری
پریشانی یہ تھی کہ پتہ نہیں میرے دوسرے ساتھی خود کو صحیح طرح چھپانے میں کامیاب ہوئے
ہیں یا نہیں۔ زیادہ پریشانی مجھے بیلا کی طرف سے تھی۔

اندازاً دس منٹ ہم اسی طرح پانی کے اندر بیٹھے رہے۔ آخر کار میں نے سر تھوڑا سا باہر
نکالا۔ مجھ سے صرف دو گز کے فاصلے پر ایک ڈاکو موجود تھا۔ خوش قسمتی سے اس کی نظر کا رخ
تھوڑا سا مختلف تھا۔ وہ کنارے پر کھڑا نظروں سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ میں بہ آہستگی پھر زیر
آب چلا گیا۔ اس دفعہ کوئی پندرہ منٹ بعد میں نے سر باہر نکالا۔ محبت علی جوہڑ کے بیچوں بیچ
کھڑا تھا۔ اس کے گھونگریالے بال بھیگ چکے تھے۔ سفید تہبند اور قمیص جسم سے چپکی ہوئی تھی۔
میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت غوث بخش اور بیلا ایک ساتھ پانی

سے برآمد ہوئے۔ غوث بخش نے اپنا دبلا پتلا سیاہ بازو بیلا کی گردن میں حمائل کر رکھا تھا۔
دراصل وہی بیلا کو ساتھ لے کر بیٹھا ہوا تھا اور ایسا کر کے اس نے یقیناً عقل مندی کا ثبوت دیا
تھا۔ بھیگی ہوئی بیلا خوف اور سردی سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ہم احتیاط سے چلتے ہوئے باہر
نکل آئے۔ ہماری پریشانی کا اندازہ کیجئے کہ جوہڑ سے نکلنے کے دو منٹ بعد تک جونک کا ایک
بچہ بیلا کے رخسار سے چمٹا اس کا خون چوستا رہا لیکن ہمارا دھیان نہیں پڑا۔ آخر میں نے اسے
بتائے بغیر یہ جونک اس کی جلد سے کھینچ لی۔

وقتی طور پر ہم محفوظ ہو چکے تھے اور اب مسئلہ بلال شاہ کو ڈھونڈنے کا تھا۔

☆======☆======☆

تلاش بسیار کے باوجود ہم بلال شاہ کو نہیں ڈھونڈ سکے۔ غوث بخش کے ساتھ میں دو دفعہ
خشک نالے کی طرف گیا لیکن بلال یا گھوڑوں کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ ہم بہت زیادہ چھان
بین بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ پران کپور اور اس کے آدمی بہرحال جنگل میں موجود تھے اور
محبت علی کے بقول پاگل کتوں کی طرح اسے تلاش کر رہے تھے۔ دوسرے چکر کے بعد جب
میں اور غوث بخش تھکے ماندے واپس آئے تو سائے ڈھلنے شروع ہو گئے تھے۔ محبت علی اور بیلا
سرکنڈوں کے درمیان ایک ہموار جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں اتھاہ سوچوں میں ڈوبے
ہوئے تھے۔ محبت کو اپنے بھرے پُرے گھرانے کی تباہی کا غم ستا رہا تھا اور بیلا غالباً اپنے
پیارے پتاجی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ پتا جو اسے جان سے عزیز رکھتا تھا لیکن اپنی
پگڑی کا شملہ اونچا رکھنے کے لئے اور اپنی جھوٹی انا کی خاطر وہ اس کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا۔
اس کے لئے چہیتی بیٹی زمین کے سینے کا بوجھ بن گئی تھی۔ اس لئے کہ وہ ایک دشمن کے ہاتھ
میں چلی گئی تھی۔

ہم تا دیر خاموش بیٹھے رہے۔ محبت علی اپنے گھرانے اور بیلا اپنے پتا کی سوچوں میں گم تھی تو
مجھے بلال شاہ کی پریشانی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا ہو لیکن ایک توقع یہ بھی
تھی کہ وہ کسی طرف نکل گیا ہو۔ میرا تجربہ تھا کہ ڈاکو گرفتار شدہ شخص کو فوراً ہلاک نہیں کرتے بلکہ
اس کی رہائی کے لئے سودے بازی کی جاتی تھی۔ لہٰذا بلال شاہ کے پکڑے جانے کی صورت میں
فوری خطرہ نہیں تھا۔ پھر بھی گمشدگی کی پریشانی اپنی جگہ تھی...... شام کے سائے آہستہ آہستہ تاریکی
میں ڈھل رہے تھے۔ سرکنڈوں کے درمیان آگ کے اس چھوٹے سے الاؤ کے گرد خاموشی زیادہ
گھمبیر ہوئی تو میں نے غوث بخش سے کہا کہ وہ کوئی بات سنائے۔ غوث بخش کہنے لگا۔
"سائیں...... گا کر سناؤں یا کہہ کر۔" میں ماحول کو ذرا تبدیل کرنا چاہتا تھا میں نے کہا "گا کر سنا

دو۔ لیکن اونچے سُروں میں نہیں، کہیں داد دینے کے لئے خودڈاکو یہاں نہ پہنچ جائیں۔"

غوث بخش نے مدھر سُروں میں ایک خودساختہ گیت چھیڑ دیا۔ مجھے شاعری کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں تھیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ تک بندی کے شعر تھے۔ شاید جنگل میں بیٹھ کر دس برس غوث بخش ایسے ہی شعر بنا تا رہا تھا۔ تاہم اس کے بولوں میں ایک عجیب طرح کا درد تھا۔ اس نے اپنی اس بیٹی کا ذکر کیا تھا جس کو وہ اپنی جان کے خوف سے مصیبتوں کے گھر (دنیا) میں تنہا چھوڑ آیا تھا۔ دنیا میں اس لڑکی کے سوا اس کا کوئی نہیں تھا۔ وہ جنگل کی تاریک راتوں میں بیٹھ کر اس کے بارے میں سوچتا تھا۔ اس کے ننھے منے بچوں کو پیار کرتا تھا۔ انہیں کندھوں پر بٹھا کر اپنی بستی کی گلیوں میں گھومتا تھا۔ غوث بخش نے اپنے شعروں میں بیٹی سے وعدہ کیا تھا کہ ایک دن وہ ضرور اسے دیکھنے پہنچے گا...... اس کے بچوں کو جی بھر کر پیار کرے گا...... وغیرہ وغیرہ۔

غوث بخش کی تانوں نے ماحول کو اور بھی گھمبیر کر دیا۔ میں نے ایک بار پھر موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ جب میں اور بلال شاہ اسے پکڑنے کے لئے بھاگے تھے تو وہ اسی جوہڑ میں کودا تھا لیکن اس وقت اس نے پانی کے نیچے چھپنے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی۔ یہی سوال میں نے غوث بخش سے کہا تو وہ بولا۔

"سائیں! مجھے شک ہو گیا تھا کہ آپ نے مجھے کودتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے سوچا دوسری طرف نکل کر بھاگ جاؤں گا لیکن آپ بھی گرو نکلے......" باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ جلد ہی محبت علی بھی اپنی سوچوں کے جزیرے سے نکل آیا۔ وہ گفتگو میں حصہ لینے لگا لیکن اس کی باتوں میں تپش بہت زیادہ تھی۔ وہ انتقام کے سوا اور کوئی بات نہیں کر رہا تھا لیکن دھیرے دھیرے میں اس کو حواس میں لے آیا۔ میں نے اس کا ارادہ پوچھا تو اس نے بتایا کہ ڈیرے سے بھاگنے کے بعد اس کا منصوبہ "ایران والا" کے پاس پہنچنے کا تھا۔

"ایران والا" کا نام سن کر میں چونکا۔ یہ نام غیر مانوس تھا لیکن لگتا تھا پہلے بھی کہیں سنا ہے۔ میرے پوچھنے پر محبت علی نے بتایا کہ وہ بلوچستان کا رہنے والا ہے۔ خاندانی دشمنی کی وجہ سے کچھ لوگ اس کے پیچھے ہیں۔ وہ قتل و غارت سے بچنے کے لئے بیوی بچوں کے ساتھ جنگل میں چھپا ہوا ہے۔ محبت علی نے بتایا کہ وہ اس کا دوست ہے۔ اس کا ٹھکانہ سچے سائیں کے مزار سے آٹھ کوس شمال کی طرف علاقے کے اندر ہے۔ وہ اس کے ٹھکانے سے تین چار کوس دور تھا جب کل رات پران کپور کے آدمیوں سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو وہ راستے سے بھٹک گیا۔

اس وقت محبت علی سمیت ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہم سچے سائیں کے مزار سے کتنی دور اور کس سمت میں ہیں۔ گھنے جنگل کی بھاگ دوڑ نے ہمیں تمام سمتیں بھلا دی تھیں۔ ہم جس طرح پران کپور کے گماشتوں میں گھر گئے تھے ضروری تھا کہ کوئی شخص ہمیں پناہ دیتا۔ ایسا شخص جو نہ صرف طاقت ور ہوتا بلکہ یہاں کی اونچ نیچ سے بھی اچھی طرح آگاہ ہوتا۔ اس صورتِ حال میں محبت علی کا یہ دوست ہمارا اچھا مددگار ثابت ہو سکتا تھا لیکن سوال پھر وہی تھا۔ پران کپور کے آدمیوں سے بچ کر اس تک کیسے پہنچا جائے۔ جب کہ ہمیں راستے کا بھی علم نہیں۔ اس موقع پر غوث بخش ایک بار پھر ہمارے لئے فرشتۂ رحمت ثابت ہوا۔ اس نے کہا۔

"سائیں! میں سب سمجھ گیا ہوں۔ جس جگہ آپ جانا چاہتے ہیں وہ یہاں سے صرف پانچ کوس کے فاصلے پر ہے۔ صبح تڑکے ہم چل دیں گے۔ مولا کرم کرے گا۔ ہم دوپہر سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔"

غوث بخش کا پُراعتماد لہجہ ہمیں حوصلہ بخش رہا تھا۔ جیسے تیسے ہم نے رات کاٹی اور علی الصبح اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسلسل فاقے کی وجہ سے نقاہت ہو رہی تھی۔ محبت علی کی حالت زیادہ پتلی تھی کیونکہ اس کے بازو کا زخم کافی خون اگل چکا تھا۔ غوث بخش نے رات ہی چند پتے رگڑ کر اس کے زخم پر لیپ کیا تھا اور اپنی بوسیدہ لنگوٹی سے پٹی پھاڑ کر باندھ دی تھی۔ بیلا کا پاؤں اب کچھ اچھا تھا اسے چلنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ آگ بجھا کر ہم شمال کی جانب روانہ ہو گئے۔ سب سے آگے غوث بخش تھا۔ اس کے پیچھے محبت علی، پھر بیلا اور آخر میں مَیں۔ میرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ نگاہیں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں کہ شاید کہیں بلال شاہ پر نظر پڑ جائے۔

☆======☆======☆

"کوئی ہے...... کوئی ہے؟" محبت علی وقفے وقفے سے پکار رہا تھا۔ بالآخر دائیں طرف ایک ٹیلے پر آہٹ ہوئی۔ ہم سب نے ایک ساتھ گھوم کر دیکھا۔ کوئی جانور تیزی سے ہماری طرف بھاگا آ رہا تھا۔ پھر اس کی آواز سنائی دی۔ وہ کتا تھا لیکن ایک بہت بڑا کتا۔ اس کا انداز نہایت خطرناک تھا۔ بیلا چیختی ہوئی محبت علی کے عقب میں ہو گئی۔ غوث بخش کی خوفزدہ آواز بھی سنائی دی۔ میں نے غیر ارادی طور پر ریوالور کتے کی طرف سیدھا کر لیا۔ وہ ہم سے صرف دس گز دور تھا جب کسی شخص نے کتے کا نام پکارا۔ وہ ہماری طرف بڑھتا بڑھتا تیزی سے گھوم گیا اور دُم ہلاتا اپنے مالک کی طرف چل دیا۔ کتے کا نام پکارنے والا شخص ٹیلے کے اوپر کھڑا تھا۔ اس نے پتلون اور رنگ دار کوٹ پہن رکھا تھا۔ ڈاڑھی اور سر کے بال بے تحاشہ بڑھے

ہوئے تھے۔ وہ ایک بیس بائیس سالہ نوجوان تھا۔ یہ تھی ''ایران والا'' سے میری پہلی ملاقات۔
محبت علی کو پہچان کر وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ اس سے بغل گیر ہوگیا۔ اب اس کے عقب میں کچھ اور افراد بھی نظر آرہے تھے۔ وہ سب مسلح تھے۔

ہمیں بڑی عزت اور گرم جوشی سے ٹیلے کے پار لے جایا گیا۔ یہاں لکڑی کے تختوں سے بنے ہوئے پندرہ بیس مکان نظر آرہے تھے۔ ایک نسبتاً کشادہ مکان ''ایران والا'' کا تھا۔
گھر کے اندر ''ایران والا'' کے بیوی بچے بھی موجود تھے لیکن مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ محبت علی نے جھوٹ بولا تھا۔ ''ایران والا'' درحقیقت ایک خطرناک ڈاکو تھا اور اس کے ساتھی تمام کے تمام چھٹے ہوئے بدمعاش تھے...... بہرحال میں اس وقت یہاں کوئی کچہری نہیں لگانا چاہتا تھا۔ ہماری اصل ضرورت محفوظ پناہ گاہ تھی۔

''ایران والا'' کے حکم پر ہمارے لئے فوراً خوردونوش اور آرام کا بندوبست کیا گیا۔
کھانے کے بعد آرام کا بندوبست بھی بہت اچھا تھا یا شاید طویل بھاگ دوڑ کے بعد ہمیں اچھا محسوس ہورہا تھا۔ محبت، بیلا اور غوث بخش لمبی تان کر سوئے۔ میں نے بھی چند گھنٹوں کے لئے آنکھ لگائی۔ جب میں جاگا تو رات ہوچکی تھی۔ لکڑی کے مکانوں میں کہیں کہیں چراغ جل رہے تھے۔ ایک سانولی سی لیکن خوبصورت لڑکی اندر آئی اور اس نے میرے ہاتھ میں ایک پائجامہ کرتہ تھمادیا۔ میں نے زندگی میں کبھی یہ لباس نہیں پہنا تھا۔ اس لئے کھڑا کپڑوں کو گھورتا رہا۔ عقب سے محبت علی نے آکر دوستانہ انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''پہن لے یار! یہاں کے لوگ تیری وردی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔''

میں نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں وہ میری وردی کو اچھی نظر سے کیوں نہیں دیکھتے۔ بہرحال تم یہ بتاؤ اب کیا ارادہ ہے۔ کیا تمہارا دوست ہمیں بحفاظت جنگل سے نکال سکتا ہے؟''

محبت علی کے چہرے پر پھر جنون کے آثار نظر آنے لگے۔ کرخت لہجے میں بولا۔ ''نہیں نواز خان ہمیں یہیں رہنا ہے۔ پران کپور اور اس کے کتوں کو ایسا سبق سکھانا ہے کہ ان کی آئندہ نسلیں بھی نہ بھولیں۔ اسی جنگل میں بہت جلد ہمارا آمنا سامنا ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''محبت علی! لگتا ہے تمہارے دوست نے تمہاری پیٹھ پر ہاتھ پھیرا ہے۔ لیکن میں پھر یہی کہوں گا، قانون کو ہاتھ میں نہ لو۔ بربادی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔''

''نہیں نواز خان، پران کپور نے جو کہانی شروع کی تھی وہ انجام تک پہنچ کر رہے گی۔''

اتنے میں ایک شخص نے آکر اطلاع دی کہ سردار ہمیں یاد کررہا ہے۔ ہم باہر آئے۔ مکانوں

کے درمیان ایک کھلی جگہ رقص و سرور کا انتظام کیا گیا تھا۔ ساز موجود تھے۔ کوئی نصف درجن لڑکیاں رنگین لباس پہنے ناچنے کو تیار تھیں۔ میں ان کی شکلوں سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان میں سے ایک بھی اُس بازار کی نہیں۔ وہ سب کی سب عام گھرانوں کی اغوا شدہ لڑکیاں تھیں۔ چاروں طرف ڈاکو کندھوں پر اسلحہ سجائے کھڑے تھے...... لیکن یہ محفل نشاط شروع نہ ہوسکی۔ صرف تین روز پہلے چوہدری محبت کے گھرانے پر قیامت بیت گئی تھی۔ وہ اس غم کو بھلا کر ناچ گانا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی ہدایت پر ''ایران والا'' نے ناچنے والیوں اور تماش بینوں کو تتر بتر کردیا۔ محبت علی کے پاس صرف ایک ہی موضوع تھا، پران کپور سے انتقام کا اور وہ اس نے پھر چھیڑ دیا۔ ''ایران والا'' میرے سامنے بات کرنے سے جھجک رہا تھا لیکن محبت علی کے کہنے پر اس نے اپنے چہرے کا نقاب اُتار دیا۔ اس نے تسلیم کرلیا کہ وہ ایک خطرناک ڈکیت ہے۔

اس نے کہا۔ ''محبت! تیرے دشمنوں سے تیرا یار ایسا انتقام لے گا کہ دیکھنے والوں کے پتے پانی ہوجائیں گے لیکن ہمیں ذرا صبر سے کام لینا ہوگا۔ کل کسی وقت بڑا سردار بھی یہاں پہنچ جائے گا۔ اس کے ساتھ قریباً 20 رائفلیں اور 30 آدمی اور ہمارے ساتھ مل جائیں گے۔ ہم ان حرام زادوں کو بکریوں کی طرح گھیر لیں گے۔ اگر ان میں سے ایک بھی بچ کر نکل گیا تو تیری یاری کی قسم اپنی گردن کاٹ لوں گا۔''

''ایران والا'' کی باتیں محبت علی کے لئے نہایت حوصلہ افزا اور پُرجوش تھیں۔ دونوں دوست زبردست خون خرابے کی منصوبہ بندی کرتے رہے اور میں خاموشی سے بیٹھا رہا۔ درحقیقت اس گروہ میں پہنچ کر محبت علی کو میری بالکل پرواہ نہیں رہی تھی۔ وہ صرف اپنے انتقام کا سوچ رہا تھا۔ ان کی طویل باتوں سے اکتا کر میں اٹھ گیا اور ٹہلتا ہوا کچھ دور درختوں میں آگیا۔ چودھویں کا چاند درختوں میں سے جھانک رہا تھا۔ میں نے دیکھا غوث بخش ایک پیڑ سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھا ہے۔ مجھے دیکھ کر چونک گیا۔ میں نے بیلا کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ میزبان کی بیوی کے پاس بیٹھی ہے۔ کہنے لگا۔

''سائیں! مجھے کھون خرابے کی بو آتی ہے، کیوں نہ ہم یہاں سے نکل جائیں۔''

میں نے کہا۔ ''غوث بخش تجھے اپنی بیٹی کے پاس پہنچنے کی جلدی ہے نا۔ میں ضرور پہنچاؤں گا لیکن ابھی نہیں۔''

''ابھی کیوں نہیں سائیں؟''

میں نے مسکرا کر ایک درخت کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ درخت دیکھ رہے ہو۔ اس پر ایک آدمی رائفل لئے بیٹھا ہے۔ ایسے ہی تین چار

آدمی ہمارے گرد اور موجود ہیں۔ ابھی ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے۔

☆======☆======☆

صبح ہم سو کر اٹھے تو پتہ چلا کہ بڑا سردار آچکا ہے۔ محبت کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔ ''اب دیکھنا نواز خان تماشہ۔'' وہ رائفل پر ہاتھ جما کر بولا۔ ایک آدمی کے ساتھ ہم بڑے سردار سے ملنے چل دیئے۔ چند مکانوں کے عقب سے گزر کر ہم ایک بڑے مکان کے سامنے پہنچے۔ یہ مکان ''ایران والا'' کے مکان سے بھی کچھ بڑا تھا۔ قریب ہی بہت سے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ دروازے پر ایک مسلح نگرانی موجود تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے اور پھر جیسے زمین نے ہمارے پاؤں جکڑ لئے۔ ایک لمحے کے لئے در و دیوار گھومتے محسوس ہوئے۔ ہمارے سامنے پران کپور اور اس کے بیٹے شان سے بیٹھے تھے۔ کپور گڑھ کے دس پندرہ آدمی اور بھی نظر آرہے تھے اور پھر میری نگاہ بڑے سردار کی طرف اٹھ گئی۔ یہ جھٹکا پہلے سے بھی شدید تھا۔ میں سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ میرے سامنے میراں شاہ بیٹھا تھا۔ اس وادی کا سب سے سفاک اور خطرناک ڈکیت۔ ''ڈاکوؤں کی وادی'' میں قارئین اس شخص کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔ اسی شخص نے مجھے کہا تھا۔ ''نواز خان مجھے ایک خوفناک بیماری ہے...... میں گوشت کھاتا ہوں۔'' اور پھر مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ کیسا گوشت کھاتا ہے۔ وہ انسان نہیں تھا انسان خور درندہ تھا اور وہ درندہ میرے سامنے بیٹھا اپنی عقابی نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ پھر اس کے حلق سے ایک طویل اور خوفناک قہقہہ برآمد ہوا۔ اس کے ساتھی حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ میراں شاہ اپنے پہلو میں بیٹھے ''ایران والا'' سے مخاطب ہوا۔

''او ایرانی! یہی ہیں میرے مہمان جنہیں ہماری مدد کی ضرورت ہے؟''

''ہاں بڑے سردار۔'' ''ایران والا'' بولا۔ اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

دوسری طرف پران کپور اور اس کے بیٹے بھی محبت علی پر بندوقیں تان چکے تھے۔

''ایران والا'' چلا کر بولا۔ ''بڑے سردار! یہ کیا ہو رہا ہے۔ تمہارے مہمان میرے دوست کی بے عزتی کر رہے ہیں۔''

پران کپور نے اپنی طویل مونچھوں کو ایک ہاتھ سے بل دیا اور میراں شاہ سے بولا۔

''میراں شاہ! یہی ہے وہ بدبخت جس نے بیلا کو اٹھایا ہے۔''

میراں شاہ کھڑا ہو گیا۔ ''یہ تو بڑا ہی اچھا ہوا۔ ہم دونوں کے دشمن ایک ہی چھت تلے جمع ہو گئے۔ آج خوب مزہ رہے گا۔'' ایک بار پھر اس نے خوفناک قہقہہ لگایا۔ ''ایران والا'' میراں شاہ کے آگے بھیگی بلی بنا کھڑا تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ یہی وہ ''ایران والا'' ہے جو

دور و نزدیک اپنی سفاکی اور پھرتی میں مشہور ہے اور جو صرف بائیس برس کی عمر میں جغادری ڈاکوؤں کا سردار کہلاتا ہے۔ میراں شاہ نے اسی کو حکم دیا کہ وہ میری اور محبت کی تلاشی لے اور ہم دونوں کے ہاتھ پشت پر باندھ دے۔ ''ایران والا'' کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔ اس نے بے چوں چراں ہدایت پر عمل کیا۔ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مل کر اس نے ہم دونوں کو غیر مسلح کیا اور ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔ میں نے دیکھا بیلا بھاگ کر ہماری طرف آرہی ہے لیکن پران کپور کے آدمیوں نے اسے راستے ہی میں روک لیا اور ایک طرف لے گئے۔ میری نظر مسلسل اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ دفعتاً میری نگاہ ایک اور چہرے پر پڑی۔ لگتا تھا آج قدرت مجھے حیران کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ تیسری بار مجھے اپنی نگاہوں پر دھوکا ہوا...... بلال شاہ بھی یہیں موجود تھا۔ وہ رسیوں میں جکڑا میراں شاہ کے عقب میں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر مار پیٹ کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ لباس بھی تار تار تھا۔ شاید پران کپور اور میراں شاہ وغیرہ اسے اذیت دے کر ہمارا پتہ پوچھتے رہے تھے۔ اب اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ خشک نالے کی طرف جاتے ہوئے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ میراں شاہ اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ قہقہہ لگا کر بولا۔

''انسپکٹر! تیرا موٹا مخبر تیرے بغیر بڑا اداس تھا۔ چلو آج اس کی اداسی بھی دور ہو جائے گی۔''

میں نے دیکھا کہ پران کپور کے آدمیوں نے میراں شاہ کے ساتھ والی نشست سنبھال لی اور دونوں سر جوڑ کر کوئی مشورہ کرنے لگے۔ یقیناً ہماری قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔

☆======☆======☆

وہ ایک خوفناک سزا تھی۔ سزا پانے والے وہی افراد تھے جنہوں نے جنگل میں بیلا کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ (تیسرا شخص راجن میری گولی سے وہیں ٹھنڈا ہو گیا تھا) میں نے دیکھا ان دونوں کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور ان کے سروں پر ایک ایک دستی بم تھا۔ دستی بموں کی سیفٹی پنز میراں شاہ کے ہاتھ میں تھیں۔ وہ زور سے پکار کر بولا۔

''تم دونوں نے پران کپور کی بیٹی کو بے عزت کرنا چاہا یہ جانتے ہوئے بھی کہ پران ہمارا جگری یار ہے لیکن میں تمہارے خون سے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا۔ میں نے تمہیں معاف کیا...... کون کہتا ہے میراں شاہ معاف نہیں کرتا۔ جاؤ چلے جاؤ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔''

قریباً چالیس گز دور کھڑے دونوں افراد تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور سروں پر موت تھی۔ دستی بم سر سے لڑھک جاتا تو اس کا پھٹنا یقینی تھا لیکن

وہ یہ موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ لرزتے قدموں کے ساتھ وہ نہایت احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ دور سے لگتا تھا جیسے دو عورتیں پانی سے لبریز مٹکے سروں پر رکھے تنگ پگڈنڈی سے گزر رہی ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کی رفتار بہت سُست تھی۔ میں نے تصور کی نگاہ سے دونوں کے خوف سے فق چہرے دیکھے...... وہ دونوں قریباً پانچ گز آگے گئے پھر ایک ساعت شکن دھماکہ ہوا اور میں نے جسموں کے ٹکڑے فضا میں اُڑتے دیکھے۔ وہ ایک لرزہ خیز منظر تھا۔ میراں شاہ اور اس کے ساتھیوں کے قہقہے اس منظر کو اور خوفناک بنا رہے تھے۔

......اور اب محبت علی کی باری تھی۔ دو آدمی اسے پکڑنے کے لئے آگے بڑھے۔ وہ کسی قدر سراسیمہ نظر آ رہا تھا۔ یقینی موت بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی کر دیتی ہے۔ میں نے کہا۔ ''چوہدری محبت! تجھے کہا تھا نا، قانون ہاتھ میں لے کر دشمنیاں نہ چکا...'' وہ صرف جبڑے بھینچ کر رہ گیا۔

اس وقت میں نے دیکھا بیلا ایک شخص کی گرفت سے نکل کر بھاگتی ہوئی آئی اور محبت علی کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ رو رہی تھی اور ساتھ ساتھ دونوں پکڑنے والوں کو طمانچے مار رہی تھی۔ اس کا رویہ ایک عورت کا رویہ تھا۔ وہ عورت جو اڑتالیس گھنٹے ایک مرد کے بس میں رہی تھی اور اس نے اس کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا، جو اپنی جان کی طرح اس کی جان کی حفاظت کرتا رہا تھا اور جو سخت بھوک پیاس کے عالم میں اسے دو گھنٹے کندھے پر اٹھا کر پیدل چلا تھا۔

''چھوڑ دو اسے یہ نردوش ہے۔'' وہ چلا رہی تھی۔

پھر دفعتاً سٹین گن کی تڑتڑ سنائی دی۔ میں نے بیلا کو لہرا کر گرتے دیکھا۔ پران کپور کا بیٹا چند گز دور سٹین گن لئے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے ناچ رہے تھے۔ ''چل حرام زادے...... چل۔'' وہ گن کا بٹ محبت علی کے سر پر مارتا ہوا بولا۔ دو تین آدمی اور آگئے اور محبت علی کو کھینچتے ہوئے ہجوم سے دور کھلے میدان میں لے گئے۔ پران کپور کا بیٹا بھی ان میں شامل تھا۔ پہلے والا عمل پھر دہرایا گیا۔ دستی بم کی سیفٹی پن کھینچ کر اسے محبت علی کے سر پر رکھ دیا گیا...... لیکن اگر پران کپور کا خیال تھا کہ وہ اپنے جانی دشمن کو لرزتے کانپتے اور عورتوں کی طرح چلاتے دیکھے گا تو اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ جونہی میراں شاہ کے آدمیوں نے اس کے سر پر بم ٹکایا اور پیچھے ہٹنے لگے۔ محبت علی کے حلق سے ایک غضب ناک غراہٹ نکلی اور اس نے چھلانگ لگا کر پران کپور کے بیٹے تک پہنچنا چاہا۔ اپنی کوشش میں تو وہ کامیاب نہیں ہوا لیکن عزت کی موت اس کے حصے میں آگئی۔ بم نیچے گرا اور اس کے پرخچے اُڑ گئے۔ میراں

شاہ کے دو کارندے بھی شدید زخمی ہو گئے۔

......اور اب بلال شاہ کی باری تھی۔ میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اس کا خوفزدہ چہرہ دیکھوں۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا شاید کلمے وغیرہ کے ورد میں مصروف تھا۔ زندگی میں پہلی بار میں موت کو اس قدر قریب اور خود کو اس قدر بے بس دیکھ رہا تھا۔ میراں شاہ مجھ کو سب سے آخر میں بلانا چاہتا تھا۔ شاید اس طرح وہ میرے عذاب میں اضافہ کر رہا تھا۔ چند منٹ کے اندر میں اپنی آنکھوں کے سامنے چار افراد کو دردناک موت کا شکار ہوتے دیکھ چکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں۔

بلال شاہ کی گلوگیر آواز سنائی دی۔ ''کہا سنا معاف کرنا خان صاحب۔'' مجھ میں جواب دینے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ دو آدمی بلال شاہ کو بازوؤں سے پکڑ کر کھلے میدان کی طرف چل دیئے۔ جب وہ بیلا کی لہولہان لاش کے قریب سے گزر رہے تھے ایک تیز آواز سنائی دی۔

''ہتھیار پھینک دو سائیں ورنہ گولی مار دوں گا۔'' سب نے چونک کر دیکھا۔ پران کپور کے عقب میں غوث بخش کھڑا تھا۔ وہی لنگوٹی والا دبلا پتلا غوث بخش جس کے چہرے پر لکھا تھا کہ یہ ایک کمزور، کم عقل اور بے ضرر شخص ہے۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور دونوں شہادت کی انگلیاں لبلبی پر تھیں۔ جب ہم یہاں آئے تھے وہ گھٹنے پیٹ سے لگائے سکڑا سمٹا گہری نیند سو رہا تھا۔ نہ جانے اس وقت وہ کہاں سے نکل آیا تھا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور سارا بدن غصے یا خوف سے لرز رہا تھا۔ اس کی لرزتی آواز آئی۔ ''تھانیدار صاحب کے ہاتھ کھول۔ اگر کسی نے ان سے جیادتی کی تو اچھا نہ ہوگا...... کھدا کی قسم میں نے کبھی چیونٹی بھی نہیں ماری لیکن آج میں قتل کر دوں گا۔ ہاں میں کھون کر دوں گا اس کا۔'' اس کا اشارہ پران کپور کی طرف تھا اور واقعی لگتا تھا وہ گولی چلا ڈالے گا۔ میراں شاہ نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور وہ میرے ہاتھوں کی بندشیں کھولنے لگے۔ جونہی میرے ہاتھ آزاد ہوئے میں چلا کر بولا۔

''میراں شاہ! اپنے آدمیوں کو قربانی کا بکرا کیوں بناتا ہے۔ آ میرے ساتھ فیصلہ کر لے۔ مجھے مار دے یا خود مر جا...... چل نکل میدان میں۔''

یہ وادی کے سفاک ترین ڈاکو کی انا پر ایک کاری ضرب تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا اسلحہ اتارا اور چھلانگ لگا کر میرے سامنے آگیا۔ میراں شاہ کا قد مختصر تھا اور جسم چوڑا چکلا۔ لیکن میں جانتا تھا اس بے ڈول جسم میں کتنی طاقت اور پھرتی بھری ہوئی ہے۔ سابقہ لڑائی کا تجربہ میرے سامنے تھا۔ بیلا اور محبت علی کی موت اور بلال شاہ کی درگت نے مجھے آگ بگولہ

کر رکھا تھا۔ میں نے شروع سے ہی میراں شاہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ درحقیقت میں نے اسے سنبھلنے یا کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ہاتھوں اور پاؤں کی ضربیں موسلا دھار بارش کی طرح اس کے جسم پر برسیں۔ جب میراں شاہ کے ساتھیوں نے میرا پلہ بھاری دیکھا تو بندوقیں تان کر میری طرف لپکے لیکن اس وقت ایک کرشمہ دیکھنے کو آیا۔ ''ایران والا'' کی جدید اور طاقت ور رائفل نے میری طرف بڑھنے والے افراد کو چھلنی کر دیا۔ ایکا ایکی زبردست فائرنگ ہونے لگی۔ ڈاکوؤں کے دونوں گروہ پوری شدت کے ساتھ آپس میں بھڑ گئے تھے۔

☆======☆======☆

مجھے اس وقت بچپن کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔ ہمارے محلے کی مسجد کے امام صاحب نماز جمعہ کے بعد اکثر ایک دعا مانگا کرتے تھے۔ ''یا اللہ کافروں کو ہدایت دے اور اگر انہوں نے ہدایت یاب نہیں ہونا تو انہیں آپس میں ٹکرا کر پاش پاش کر دے۔''

کچھ ایسی ہی صورتِ حال جنگل کے اس ویران حصے میں پیش آئی۔ ''ایران والا'' اور میراں شاہ کے اندرونی اختلافات کی آگ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑی۔ دونوں گروہوں میں خونریز تصادم ہوا جو کوئی آٹھ پہر جاری رہا۔ اس تصادم میں بیسیوں ڈاکو ہلاک اور زخمی ہوئے اور بیسیوں جنگل میں بھاگ گئے۔ پران کپور شدید زخمی ہوا اور اس کے تقریباً آٹھ ساتھی ایک دستی بم کی زد میں آ کر ہلاک ہوئے۔ جب میں نے ایک گڑھے سے اسے خون میں لت پت گرفتار کیا تو کوئی ہاتھ اسے بچانے والا نہیں تھا۔ اس کا ایک بیٹا بھی دوطرفہ فائرنگ کی زد میں آ کر شدید زخمی ہوا اور اگلے روز جنگل ہی میں چل بسا۔ ''ایران والا'' ہلاک ہوا لیکن میراں شاہ ایک بار پھر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں اگلے روز غروب آفتاب سے قبل تا دیر اس کی لاش ڈھونڈتا رہا لیکن مایوسی ہوئی۔

وہ ایک اداس شام تھی۔ تباہ حال بستی میں بکھری لاشوں کے درمیان میں اور بلال شاہ تنہا کھڑے تھے۔ کبھی کبھی کسی زخمی کے کراہنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی..... ہمارے سامنے ایک لاش تھی۔ لنگوٹی والے ایک پستہ قد اور کمزور سے شخص کی لاش۔ اس کے ہڈیوں بھرے سینے میں سٹین گن کا پورا برسٹ اتر گیا تھا۔ اس شخص کا چہرہ شمال کی طرف تھا اور آنکھیں جنگل کے اس پار دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں ..... جنگل کے اس پار جہاں کسی بستی میں اس کی اکلوتی بیٹی اپنے ننھے منے بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔

☆======☆======☆

گمشدہ قبر

ایک نڈر اور جرأت مند صحافی کی داستان جو اپنے فرض کے لیے جان پر کھیلنا جانتا تھا۔ دشمنوں کی سازش نے اسے کالا پانی پہنچا دیا تھا، اس کے سینے میں ایک راز دفن تھا اور یہ راز جاننے کے لیے ضروری تھا کہ اسے کالا پانی سے فرار کرا لیا جائے۔

یہ میری زندگی کا ایک یادگار ایڈونچر ہے۔ یہ ایڈونچر ہوشیار پور سے شروع ہوا۔ بظاہر یہ ایک عام سا واقعہ تھا لیکن اس واقعے کے لئے مجھے دور دراز کا سفر کرنا پڑا۔ یہ ایک ایسا سفر تھا جس کا ذکر کرتے ہوئے لوگ کانپ جاتے تھے۔ آپ نے بھی ''کالے پانی'' کا نام بہت سنا ہوگا لیکن بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ ''کالا پانی'' درحقیقت کہا کس کو جاتا تھا اور کالے پانی کی سزا پانے والے کو کہاں بھیجا جاتا تھا؟ زیرِ نظر کہانی ہوشیار پور سے شروع ہو کر کالے پانی کی ہیبت ناک فضاؤں میں پہنچتی ہے اور ان کرداروں کو سامنے لاتی ہے جو کالے پانی کی سزا کاٹ رہے تھے۔

یہ مئی جون کے دن تھے۔ میں ہوشیار پور کے مرکزی تھانے میں تعینات تھا۔ علی الصبح میرے سب انسپکٹر نے اطلاع دی کہ زنا بالجبر کا ایک کیس رجسٹرڈ ہوا ہے...... اس اطلاع میں افسوس ناک بات یہ تھی کہ ظلم کا شکار ہونے والی ایک نو سالہ بچی حمیدہ تھی۔ حمیدہ اس وقت ہسپتال میں تھی۔ اسے اس کی والدہ رات دو بجے ہسپتال لے کر آئی تھی۔ شروع میں بچی کی والدہ نے اس واقعے کو چھپانے کی کوشش کی لیکن یہ چھپنے والی بات نہیں تھی۔ پھر وہ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کی منت سماجت کرنے لگی کہ کسی کو اس واقعے کا پتہ نہ چلے۔ ڈاکٹر یہ بات مان کر خود کو مصیبت میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ یہ پولیس کیس ہے اور پولیس کو ہر حال میں اطلاع کرنی ہوگی۔ اس نے عورت سے بظاہر تسلی تشفی کی باتیں کیں لیکن موقع ملتے ہی پولیس کو فون کر دیا۔

یہ کیس کچھ الجھا ہوا تھا۔ خدانخواستہ کسی کے بچے کے ساتھ ایسا سانحہ ہو جائے اور بات ہسپتال تک پہنچ جائے تو وارث اس واقعے کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔ چھپانے کی کوشش یا تو شروع میں کی جاتی ہے یا اس وقت کی جاتی ہے جب اس واقعے میں کوئی ''اپنا''

ہی ملوث ہو۔ زیرِ نظر کیس میں بھی یہی صورتِ حال نظر آ رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ بچی کو اس سنگ دلی کا نشانہ بنانے والا عورت کا کوئی اپنا ہی عزیز ہو۔

یہ بہت سنگین معاملہ تھا۔ میں عورت کا تفصیلی بیان لینے کے لئے خود ہسپتال پہنچا۔ میری توقع کے برخلاف بچی کی والدہ ایک جوان عورت تھی۔ عمر بمشکل پچیس برس رہی ہوگی۔ قبول صورت تھی لیکن چہرے اور لباس سے غربت ٹپکتی تھی۔ اس کا نام کلثوم تھا۔ کلثوم کا ایک خالو بھی ہسپتال پہنچ چکا تھا۔ وہ بھی کلثوم ہی کی طرح غریب صورت تھا۔ اس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ معلوم ہوا کہ کلثوم کا شوہر جو ایک لکھاری تھا، پچھلے پانچ برس سے کالے پانی کی سزا کاٹ رہا ہے۔ کلثوم اپنے تین بچوں اور بوڑھی ساس کے ساتھ اندرون شہر ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی اور لوگوں کے گھروں میں کام کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پال رہی تھی۔

میں نے کلثوم سے اس واقعے کے بارے میں پوچھا۔ اس نے اوڑھنی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''تھانیدار صاحب! جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب ہمارے سر پر اور راکھ نہ ڈالیں۔ میں نے کسی کے خلاف کچھ نہیں کہنا۔ میں بے آسرا ہوں۔ بے آسرا لوگوں کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا ہی کرتا ہے۔ آپ اپنے آپ کو تکلیف مت دیں۔''

میں نے کہا۔ ''بی بی! مجرم آزاد رہے گا تو نہ جانے کتنی عزتیں خطرے میں پڑی رہیں گی۔ کیا تم چاہو گی کہ کل کسی دوسرے غریب کی بچی کے ساتھ یہی سلوک ہو۔ مجرم کو سزا ملنے سے تمہارا ہی نہیں اور بھی بہت سوں کا بھلا ہوگا.....''

وہ سسکتے ہوئے بولی۔ ''میں سچ کہتی ہوں تھانیدار صاحب! مجھے کچھ خبر نہیں وہ کون تھا۔ میری ساس ایک رات کے لئے اپنی بیٹی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ وہ رات کو دیوار پھلانگ کر میرے گھر میں آیا اور یہ ظلم کر کے چلا گیا۔ میں پانی پینے کے لئے اٹھی تو اس قیامت کا مجھے پتہ چلا۔ میری بچی برآمدے میں بے ہوش پڑی تھی۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے عورت پر جیسے ایک دم ہسٹریا کا حملہ ہو گیا۔ وہ زور زور سے چیخنے اور اپنا سینہ کوٹنے لگی۔

میں نے بہت کوشش کی لیکن کلثوم نامی یہ عورت اپنے بیان پر قائم رہی۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے مجرم کے بارے میں کچھ پتہ نہیں، نہ ہی وہ کسی پر شک کا اظہار کر سکتی ہے۔ کلثوم کا خالو کوئی بھی بیان دینے سے قاصر تھا کیونکہ وہ شہر کی ایک مضافاتی بستی میں رہتا تھا اور بہن کے گھر اس کا آنا جانا بہت کم تھا۔

اسی روز شام کے وقت میں نے کلثوم کے چند محلے داروں کے بیانات لئے۔ ان بیانات سے پتہ چلا کہ کلثوم کا ایک بھتیجا غازی احمد ڈیڑھ دو ماہ پہلے تک کلثوم کے پڑوس میں رہتا

تھا۔ وہ یہاں کے ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ دسویں کا امتحان دے کر وہ اپنے گاؤں واپس چلا گیا۔ تاہم اب بھی کبھی کبھار وہ یہاں آجاتا تھا۔ کل سہ پہر کو بھی اسے کلثوم کے گھر دیکھا گیا تھا۔ مگر وقوعہ کے بعد وہ کسی کو نظر نہیں آیا۔ بیان دینے والوں میں سے ایک بزرگ نے کھلے الفاظ میں اس شک کا اظہار کیا تھا کہ اس معاملے میں کلثوم کا بھتیجا غازی احمد ملوث ہو سکتا ہے۔

یہ معاملہ یقیناً زیر غور تھا۔ عین ممکن تھا کہ وقوعہ کی شب غازی احمد کلثوم کے گھر ہی میں ہو۔ بچی پر مجرمانہ حملہ کرنے کے بعد وہ بھاگ نکلا ہو یا پھر خون کے رشتے نے زور مارا ہو اور کلثوم نے ہی اسے بھگا دیا ہو...... میں نے اس لائن پر تفتیش شروع کی۔ غازی احمد ایک قریبی گاؤں میں رہتا تھا۔ کلثوم رشتے میں اس کی سگی پھوپھی تھی۔ غازی احمد کی عمر سولہ سال کے لگ بھگ تھی۔ میں نے اپنے اے ایس آئی کو دو سپاہی دے کر بھیجا اور وہ چند گھنٹے میں غازی احمد کو گاؤں سے شہر لے آئے۔ غازی احمد کا باپ اور گاؤں کا نمبردار بھی ساتھ ہی چلے آئے تھے۔

غازی احمد کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ وہ کھلے ہاتھ پیر کا ایک توانا اور صحت مند لڑکا تھا۔ مسیں ابھی بھیگی تھیں۔ میں نے اس کے ساتھ آنے والے دونوں افراد کو علیحدہ کمرے میں بٹھایا اور غازی کو اپنے دفتر میں لے جا کر پوچھ گچھ شروع کی۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اور رو دینے کے قریب تھا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ ''جناب! میں کل صبح سویرے پھوپھی کے گھر آیا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر میں واپس جانے لگا لیکن پھوپھی نے زبردستی روک لیا۔ کہنے لگی کہ گرمی بہت ہے۔ ذرا سورج ڈھلے تو چلے جانا۔ شام پانچ بجے میں گھر سے نکلا اور بس پکڑ کر گاؤں روانہ ہو گیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کل رات یہاں کیا ہوا ہے اور کس نے کیا ہے۔''

میں نے لڑکے کو مختلف طریقوں سے گھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ اسی دوران لڑکے کا باپ رجب علی زبردستی میرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کی پگڑی گلے میں پڑی تھی اور وہ رو رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''تھانیدار صاحب! کچھ خدا کا خوف کریں آپ لوگ۔ ہمارے گھر کی عزت برباد ہوئی ہے اور آپ ہمیں ہی مجرم بنا رہے ہیں۔ یہ دہرا ظلم نہ کریں ہم پر۔ خدا کی قسم میرا بچہ ایسا نہیں ہے۔ میرے گاؤں کا سو بندہ اس بات کی گواہی دے گا غازی کل رات اپنے گاؤں میں اور اپنے گھر میں تھا۔''

[illegible]ران گاؤں کا چوہدری بھی اندر آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''تھانیدار صاحب! اگر آپ قبول کریں تو میں اپنی طرف سے ہر قسم کی ضمانت دینے کو تیار ہوں۔ غازی احمد کل رات

گاؤں میں تھا اور پولیس کے پہنچنے تک گاؤں ہی میں رہا ہے۔''

میں نے ان دونوں کو باہر بھیج کر لڑکے سے پوچھ گچھ جاری رکھی۔ اس کی باتوں سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ زیادہ ہوشیار چالاک نہیں ہے۔ اگر اس نے جرم کیا ہوتا تو گفتگو کے دوران کہیں نہ کہیں اس کی زبان ضرور پھسل جاتی۔ بہر طور میں نے اسے حراست میں رکھنا ضروری سمجھا۔ اس کا باپ بہت واویلا کر رہا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اس کے بچے کو انگلی بھی نہیں لگاؤں گا اور بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے اس کے خلاف پرچہ نہیں کاٹا جائے گا۔

تفتیش کے دوران ہی ایک اور بات میرے سامنے آئی۔ معلوم ہوا کہ محلے کا ایک چوہدری ٹائپ شخص آصف خان اکثر کلثوم کے گھر آتا جاتا ہے۔ کلثوم جس گھر میں رہتی تھی وہ آصف خان کا تھا۔ کلثوم پر پورے ایک سال کا کرایہ چڑھ چکا تھا۔ وہ آصف خان کی منت سماجت کر کے گزارا کر رہی تھی۔ محلے دار آصف خان کی تعریف کرتے تھے کہ اس نے ایک بے سہارا عورت پر ترس کھا کر اسے گھر بدر نہیں کیا ہے، کوئی اور ہوتا تو کلثوم کا سامان کب کا گھر سے باہر پھینک دیا ہوتا لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو آصف خان کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ آصف خان نے کلثوم پر نگاہ رکھی ہوئی ہے۔ کلثوم کے ایک پڑوسی نے تو یہاں تک کہا کہ آصف خان، کلثوم کو دوسری شادی کے لئے اکساتا رہتا ہے۔ اسے کہتا ہے کہ ابھی وہ تیرہ چودہ سال اور شوہر کا انتظار کرے گی۔ اتنا لمبا عرصہ وہ کسی سہارے کے بغیر کیسے کاٹے گی۔ اس کی جوانی لوگوں کے جھوٹے برتن مانجھتے مانجھتے بڑھاپے میں بدل جائے گی۔

آصف خان نامی اس شخص کو میں پہلے بھی جانتا تھا۔ غالباً کسی کیس ہی کے سلسلے میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ گھونگریالے بالوں والا اونچا لمبا شخص تھا۔ باڈی بلڈنگ کرتا تھا اور اپنے کرتے کی آستینیں اوپر تک چڑھا کر رکھتا تھا۔ میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن اتنا پتہ تھا کہ وہ آٹھ دس کھولیوں کا مالک ہے اور وہاں رہنے والوں سے کرایہ وصول کرتا ہے۔ کرائے وغیرہ وصول کرنے کا کام وہی شخص کر سکتا ہے جو ذرا منہ پھٹ اور ہتھ چھٹ قسم کا ہو۔ آصف خان اسی محلے میں رہتا تھا جہاں کلثوم رہتی تھی اور جہاں مجرمانہ حملے کی یہ سنگین واردات ہوئی تھی، لیکن آصف خان ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا۔ مجھے اس کی غیر حاضری کچھ عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے چوہدری ٹائپ شخص تو ایسے موقعوں پر بڑھ چڑھ کر کارکردگی دکھاتے ہیں لیکن اس نے ابھی تک صورت نہیں دکھائی تھی۔ میں نے پتہ کروایا تو معلوم ہوا کہ وہ کل صبح سے جالندھر گیا ہوا ہے۔

☆======☆======☆

بچی کی حالت اب سنبھل چکی تھی۔ میں اس کے گھر جا کر اس سے ملا اور دیر تک اس سے باتیں کیں۔ اس کی عمر اور اس کی معصومیت دیکھ کر رونا آتا تھا۔ کیا شقی القلب انسان تھا جس نے اس ادھ کھلی کلی کو پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ بچی اس قدر خوفزدہ تھی کہ ذرا سی آواز پر سہم کر پیلی پڑ جاتی تھی۔ اسے اس کے سوا کچھ پتہ نہیں تھا کہ اندھیرے میں کسی نے اسے زور سے دھکا دیا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹکرا کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ آنکھ کھلی تو ہسپتال میں تھی۔

اسی دوران آصف خان بھی جالندھر سے واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ وہاں وہ ایک شادی میں شرکت کرنے گیا تھا۔ میں نے تنہائی میں اس سے پوچھ گچھ کی تاہم اسے یہ شبہ نہیں ہونے دیا کہ میری نگاہ میں وہ مشکوک ٹھہر چکا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”کلثوم بی بی سے تمہارے تعلقات کس طرح کے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”جناب! اسی طرح کے ہیں جس طرح کے مالک مکان اور کرائے دار میں ہوتے ہیں۔ کھینچا تانی ہوتی رہتی ہے۔ کلثوم کے ذمے پورے ایک سال کا کرایہ ہے۔ یہ کرایہ پورا کرنا تو دور کی بات ہے وہ اب بھی کسی مہینے دس کم دیتی ہے کسی مہینے پانچ کم دیتی ہے۔ بہرحال وہ بھی مجبور ہے اس کے سر کا سائیں سر پر نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”جس کے سر کا سائیں نہ ہو اور جو غریب اور خوبصورت بھی ہو اس کے لئے دنیا بڑی خطرناک ہو جاتی ہے۔ مجھے تو یہ بھی کسی گھر کے بھیدی کا کام لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اسی محلے کا ہو۔ اسے پتہ تھا کہ کلثوم کی ساس بھی گھر میں نہیں ہے۔ وہ رات کو دیوار پھاند کر گھر میں گھسا اور شیطان کو شرما کر چلا گیا۔“

میں براہِ راست آصف خان کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اس کا رنگ بدلتا محسوس ہوا مگر پھر فوراً ہی وہ سنبھل گیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ آصف خان کا گریبان حسبِ معمول کھلا ہوا تھا۔ اچانک میری نگاہ اس کے ابھرے ہوئے سینے پر پڑی۔ یہاں چند خراشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ صاف طور پر یہ ناخنوں کی خراشیں تھیں اور میرا تجربہ کہہ رہا تھا کہ دو تین روز پرانی ہیں۔ یعنی ان خراشوں کو اتنا ہی وقت گزرا تھا جتنا کلثوم کے گھر ہونے والی واردات کو۔

میں نے اپنا یہ شک ذہن میں رکھ لیا لیکن آصف خان پر کچھ ظاہر نہیں کیا اور کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اسے تھانے سے روانہ کر دیا۔

آصف خان سے ملنے کے چند گھنٹے بعد میں پھر کلثوم کے گھر پہنچ گیا۔ اس مرتبہ میں

نے اس پر پولیس کا خاص حربہ آزمایا۔ یعنی اسے بتایا کہ اصل مجرم نے سب کچھ بک دیا ہے۔

”کون ہے مجرم؟“ وہ ہکلا کر بولی۔

”آصف خان۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

کلثوم کے چہرے پر تاریک سا سایہ لہرا گیا اور اسی لمحے مجھے احساس ہو گیا کہ میرا تیر نشانے پر لگا ہے۔ میں نے کہا۔ ”کلثوم بی بی! اب چھپانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ پولیس سے تعاون کرو۔ آصف خان کی کھال اُترے گی تو اس نے وہ سب کچھ بتا دینا ہے جو اب تک چھپایا ہوا ہے لیکن اس میں ٹائم لگے گا۔ ہو سکتا ہے اس دوران آصف خان کے والی وارث بھاگ دوڑ کر کے کچھ تگڑی سفارش اکٹھی کر لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد اس کا چالان مکمل کر کے عدالت میں پیش کر دوں۔“

وہ سسکنے لگی۔ ”آصف خان نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے جب کچھ دیکھا نہیں تو اس پر الزام کیسے لگا دوں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ اچھا تماشا ہے۔ ملزم کہہ رہا ہے کہ اس سے جرم ہوا ہے اور مدعی کہتا ہے کہ نہیں ہوا۔ وہ ہر بات کا اقرار کر چکا ہے۔ اس رات اس نے تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ تمہارے اور اس کے درمیان زبردست کشمکش ہوئی۔ تمہارے ناخنوں کے نشان اب بھی اس کی چھاتی پر موجود ہیں۔ پھر تم کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گئیں لیکن تمہاری بچی اس شیطان کے ہتھے چڑھ گئی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

کلثوم کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہتھیار پھینک چکی ہے پھر ایک دم وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ ”وہ بہت ظالم شخص ہے وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میرے بچوں کو قتل کر دے گا۔“

میں نے کہا۔ ”وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ قانون کی پکڑ میں ہے اور سات آٹھ سال کی جیل تو اسے ہو کر رہے گی۔ میں تمہیں اپنی طرف سے ضمانت دیتا ہوں کہ تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہونے دوں گا۔“

کلثوم خوف اور جذبات کی شدت سے لرز رہی تھی۔ میں نے اسے ڈھب پر لانے کی کوشش جاری رکھی اور بالآخر اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ کلثوم نے آنسوؤں اور آہوں کے درمیان رک رک کر اور سہم سہم کر جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یوں ہے۔

”آصف خان نے ڈیڑھ دو برس سے کلثوم پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ وہ کرایہ لینے کے بہانے اکثر اس کے گھر آتا جاتا تھا۔ پہلے وہ اشاروں کنایوں میں کلثوم کو اپنی بات سمجھانے کی

کوشش کرتا رہا پھر کھل کر اظہارِ خیال کرنے لگا۔ اس نے کلثوم سے کہا کہ باعزت زندگی گزارنے اور اپنی مالی پریشانیوں سے نجات پانے کا اس کے پاس ایک ہی راستہ ہے، وہ آصف خان سے بیاہ کرلے اور اس بیاہ کے لئے اپنے شوہر عثمانی سے طلاق لے لے۔ کلثوم کو یہ بات سننا بھی گوارا نہیں تھی لیکن وہ مجبور تھی۔ وہ آصف خان کی مقروض تھی اور اس کی دی ہوئی چھت تلے رہ رہی تھی۔ آصف خان باتوں باتوں میں اکثر کلثوم پر اپنا رعب اور دبدبہ بھی قائم کرتا رہتا تھا۔ اپنے اثر ورسوخ کے جھوٹے سچے قصے سنا سنا کر اس نے کلثوم کو ذہنی طور پر مغلوب کر رکھا تھا۔

جب آصف خان نے دیکھا کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا اور کلثوم بدستور اپنے شوہر کی وفادار رہے گی تو اس نے اپنی رقم کی وصولی کے لئے کلثوم پر دباؤ بڑھا دیا۔ ایک مہینہ پہلے اس نے کلثوم سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اگلے ماہ کی دس تاریخ تک کرایہ چکتا کر دے ورنہ وہ اس کا سامان باہر پھینکنے پر مجبور ہو جائے گا۔ کلثوم اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی خاطر حسبِ معمول اس کی منت سماجت کرنے لگی لیکن وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اس مرتبہ کچھ نہ کچھ کر کے رہے گا...... جب اس نے دیکھا کہ نوٹس کی تاریخ قریب آگئی ہے اور کلثوم کی پریشانی انتہا کو چھو رہی ہے تو ایک مرتبہ پھر اس نے اشاروں کنایوں میں کلثوم کے سامنے اپنی شیطانی خواہشات کا اظہار کیا۔ بے بسی کی انتہا تھی کہ کلثوم اس کی باتیں خاموشی سے سنتی رہی۔ آصف خان کو ہوس نے اندھا کر رکھا تھا۔ وہ اس خاموشی کو نیم رضامندی سمجھا اور اس بات پر شادمان ہو گیا کہ بالآخر مچھلی نے کانٹا نگل لیا ہے۔

اسی روز آصف خان کو پتہ چلا کہ کلثوم کی ساس دو دن بعد ایک رات کے لئے اپنی بیٹی کے ہاں جا رہی ہے۔ آصف کے بُرے ارادوں کی تکمیل کے لئے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بڑھیا کے بعد کلثوم اور بچے گھر میں تنہا ہوں گے اور عثمانی کی چار دیواری میں اسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ وہ شدت سے وقت کا انتظار کرنے لگا۔ نصف شب کا عمل ہوا تو آصف خان شراب کے نشے میں دھت ہو کر عثمانی کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے بیرونی دیوار پھاندی اور اس برآمدے میں پہنچ گیا جہاں کلثوم اپنی بڑی بچی کے ساتھ سو رہی تھی۔ (اس کے دونوں چھوٹے بچے دادی کے ساتھ گاؤں گئے ہوئے تھے)

اس نے کلثوم کو جگایا اور اس سے دست درازی شروع کر دی۔ کلثوم ایک پاک باز عورت تھی۔ وہ آصف خان کے ہاتھوں میں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ذلت کی ایسی زندگی سے مر جانا اس کے لئے ہزار درجے آسان تھا۔ اس نے پہلے تو آصف خان کی منت

سماجت کی پھر بھرپور مزاحمت پر اُتر آئی۔ آصف خان کو زوردار دھکا دینے کے بعد وہ کمرے میں گھس گئی اور اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ شور وغل کی آوازوں نے کلثوم کی نو سالہ بیٹی حمیدہ کو بھی جگا دیا۔ کلثوم نے اس کے چیخنے چلانے اور بیرونی دروازے کی طرف بھاگنے کی آوازیں سنیں۔ اس نے یہی خیال کیا کہ حمیدہ گھر سے نکل بھاگی ہے۔

آصف خان دروازے کے سامنے پہنچ کر غرانے لگا۔ وہ کلثوم کو دھمکا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اگر اسے جان عزیز ہے تو دروازہ کھول دے۔ ساتھ ساتھ وہ کندھے کی ضربوں سے دروازہ توڑنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ دروازہ شیشم کی مضبوط موٹی لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اسے آسانی سے توڑ لینا ممکن نہیں تھا۔ آصف خان کو یہ بھی ڈر تھا کہ اگر اس نے بلند آواز میں گرجنے برسنے کی کوشش کی تو پڑوسیوں میں سے کوئی جاگ اٹھے گا۔ وہ نشے میں نیم پاگل ہو رہا تھا اور ہر صورت کلثوم تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

دروازہ کھلوانے کی کوششوں میں ناکام ہو کر اس نے کلثوم کو دھمکایا کہ اگر اس نے بات نہ مانی تو وہ اس کی بچی کو قتل کر دے گا۔ کلثوم کا خیال تھا کہ حمیدہ بھاگ نکلی ہے۔ اگر وہ آصف خان کی گرفت میں ہوتی یا گھر کے کسی دوسرے کمرے میں بند ہوتی تو اس کی چیخ وپکار ضرور کلثوم کے کانوں تک پہنچتی۔ اس نے سمجھا کہ آصف خان اسے کمرے سے نکالنے کے لئے خالی خولی دھمکیاں دے رہا ہے۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ حمیدہ کمرے سے باہر چند گز کی دوری پر بے ہوش پڑی ہے اور پوری طرح آصف خان کی شیطانی دسترس میں ہے۔

آصف خان نے خطرناک لہجے میں چند بار اپنی دھمکی دہرائی پھر دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ کلثوم کمرے میں بند روتی اور سسکتی رہی۔ رہ رہ کر اسے خیال آرہا تھا کہ حمیدہ ابھی تک کسی کی مدد لے کر کیوں نہیں پہنچی؟ کافی ٹائم اسی طرح گزر گیا۔ گھر میں اب مکمل خاموشی تھی۔ کہیں پتہ کھڑکنے کی آواز بھی نہیں آتی تھی لیکن کلثوم کو ڈر تھا کہ کہیں یہ بھی آصف خان کی چال نہ ہو، وہ خاموشی سے گھات لگائے بیٹھا ہو اور جونہی وہ باہر نکلے اسے دبوچ لے۔

کلثوم نے قریباً ایک گھنٹے تک اسی طرح انتظار کیا۔ حمیدہ کی طرف سے اس کی پریشانی لحہ بہ لحہ بڑھتی جارہی تھی۔ آخر اس کی مامتا نے جوش مارا اور وہ باہر نکل آئی۔ اس کا خیال تھا کہ حمیدہ باہر بھاگ نکلی ہے اور شاید خوف کے مارے کسی کونے کھدرے میں جا چھپی ہے۔ وہ حمیدہ کو دیکھنے کے لئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ اچانک اندھیرے میں اسے کسی شے سے ٹھوکر لگی اور وہ گرتے گرتے بچی۔ اس نے جھک کر غور سے دیکھا یہ حمیدہ کا جسم تھا۔ وہ

ایک چٹائی پر خون میں لت پت پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر کلثوم کی چیخیں نکل گئیں۔

کلثوم کی زبانی یہ ساری روئیداد سننے کے بعد اب شک شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ مجرم کا چہرہ بے نقاب ہو چکا تھا۔ اب اسے جلد از جلد گرفتار کرنا ضروری تھا۔ میں کلثوم کے گھر سے رخصت ہو کر سیدھا تھانے کی طرف چل دیا۔ ابھی میں تھانے سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ مجھے ایک لمبریٹا اسکوٹر نظر آیا۔ اسکوٹر برانچ روڈ سے بڑی سڑک کی طرف جا رہا تھا۔ اس پر دو افراد سوار تھے، ان میں سے ایک جو اسکوٹر چلا رہا تھا آصف خان تھا۔ وہ مجھ سے قریباً دس گز کی دوری سے گزرا۔ میں نے زور سے آواز دی۔ ”آصف خان۔“

آصف خان کے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے گھوم کر میری طرف دیکھا لیکن آصف خان سنی ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ میں نے ایک بار پھر زور سے آواز دی لیکن اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ دل نے گواہی دی کہ یہ شخص فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک اتفاق تھا کہ میری نگاہ اس پر پڑ گئی تھی ورنہ وہ سڑک کے اس مقام سے ایک منٹ پہلے بھی گزر سکتا تھا۔ میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور مخالف سمت سے آتے ہوئے ایک موٹر سائیکل سوار کو ہاتھ دے کر روک لیا۔ وہ کوئی دلیپ کمار ٹائپ کالج بوائے تھا۔ میں وردی میں تھا لہٰذا تعارف کرانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں نے نوجوان سے کہا کہ وہ سفید اسکوٹر کا پیچھا کرے۔

نوجوان نے پھرتی سے میری ہدایت پر عمل کیا اور موٹر سائیکل، اسکوٹر کے پیچھے لگا دی۔ اسکوٹر کے پیچھے بیٹھا ہوا شخص گردن گھما کر دیکھ چکا تھا کہ میں نے ایک موٹر سائیکل سوار سے لفٹ لی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک دم اسکوٹر کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ نوجوان نے بھی موٹر سائیکل کی رفتار بڑھا دی۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں ہوشیار پور کی سڑکوں پر اسکوٹر اور موٹر سائیکل میں دھواں دھار دوڑ ہوئی۔ آخر اسٹیشن کے قریب ہم نے آصف خان کو جا لیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ایک دم اسکوٹر روک لیا اور یوں ظاہر کرنے لگا جیسے اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہم موٹر سائیکل پر اس کے پیچھے آ رہے ہیں۔

”السلام علیکم انسپکٹر صاحب .... آپ یہاں؟“ اس نے اداکاری کی۔

میں نے کہا۔ ”بنومت۔ تمہیں سب معلوم تھا، تم نے جان بوجھ کر ہمیں دوڑایا ہے۔“

وہ ایک بار پھر حیرت کی اداکاری کرنے لگا۔ ”خدا کی قسم مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں نے لاہور جانے والی ٹرین پکڑنی تھی۔ وقت کم رہ گیا تھا اس لئے تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔“ اس نے جیب سے ریلوے ٹکٹ نکال کر مجھے دکھایا۔

میں نے ٹکٹ اس سے لے لیا۔ ”اتنی جلدی لاہور جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی تمہیں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”ایک شادی تھی جی۔“ وہ بولا۔

”شادیاں تمہیں بہت پڑتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”میں کچھ سمجھا نہیں۔“ اس نے کہا۔

میں نے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ لی اور دوسرا ہاتھ اپنے پستول پر رکھ لیا۔ ”میرا خیال ہے تھانے چلتے ہیں، وہاں چل کر سب کچھ تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔“

☆======☆======☆

آصف خان کو عین اس وقت گرفتار کیا گیا تھا جب وہ لاہور فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے خلاف ٹھوس ثبوت موجود تھے۔ انگریزی حکومت ایسے معاملوں میں بڑی سخت تھی۔ کوئی وجہ نہیں تھی کہ آصف خان لمبی سزا سے بچ جاتا لیکن گرفتاری کے صرف چوبیس گھنٹے بعد اچانک اس کیس کی تفتیش تبدیل کر دی گئی۔ اتنی جلدی اور یوں بلا وجہ تفتیش کا تبدیل ہونا حیرت ناک تھا۔ پہلے تو مجھے اس اطلاع پر یقین ہی نہیں آیا۔ جب یقین آیا تو بھاگم بھاگ ایس پی کے پاس پہنچا۔ ایس پی نے اس اطلاع کی تصدیق کی اور بتایا کہ تفتیش کی تبدیلی ایک انگریز افسر اے سی مسٹر ایڈرسن راک کے کہنے پر عمل میں آئی ہے۔

مسٹر راک کا نام میں نے پہلے بھی سنا تھا۔ یہ کوئی بہت سخت گیر قسم کا افسر تھا اور عام انگریز افسروں کے برعکس پرلے درجے کا بے اصول بھی تھا۔ میں نے اس کی بدمعاشی اور سخت گیری کے ایک دو واقعات سنے تھے اور یہ بھی سنا تھا کہ اس کے ساتھی انگریز افسر بھی اسے زیادہ پسند نہیں کرتے، لیکن وہ کسی بڑے لارڈ کا قریبی رشتے دار بتایا جاتا تھا۔ اس رشتے داری کے سبب ساتھی افسر اس سے دبے رہتے تھے۔ میں نے ایس پی سے سوال کیا۔ ”جناب! تفتیش تبدیل کئے جانے کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ میں نے اس کیس پر خاصی محنت کی ہے۔ اب میں ملزم کو بمعہ ثبوت گرفتار کر چکا ہوں۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ کیس ویسے ہی تفتیش کے مرحلے سے گزر چکا ہے۔“

ایس پی نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ”تم اس کیس کے لئے خود کو خواہ مخواہ مشکل میں نہ ڈالو۔ مسٹر راک سے الجھنے میں فائدہ نہیں۔ جو اس بدبخت کے دماغ میں آیا ہے اس نے کر دیا ہے۔ اب خاموشی ہی بہتر ہے۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن جناب! کسی سے اپنی غلطی پوچھنا تو گناہ نہیں ہے۔“

ایس پی صاحب بولے۔ ''غلطی تم نے پہلے نہیں کی لیکن اب اس کیس سے چمٹ کر غلطی کرو گے۔ میں تمہیں کہہ رہا ہوں ناں کہ اس معاملے کو بھول جاؤ...... میرا خیال ہے کہ یہ آصف خان مسٹر راک کے پاس آتا جاتا ہے۔ کافی دیر سے شناسائی ہے ان دونوں میں۔ بہت مشکل ہے کہ مسٹر راک اسے دس پندرہ روز بھی پولیس کی حراست میں رہنے دے۔ اسے ہر صورت میں چھوٹ ہی جانا ہے۔ پھر تم اسے چھوڑ کر یہ شرمندگی اپنے کھاتے میں کیوں ڈالنا چاہتے ہو۔''

میں نے ایس پی صاحب کا حکم مانتے ہوئے تفتیش نئے انسپکٹر کے حوالے کر دی۔ اس انسپکٹر کا نام راجپال تھا اور انگریز افسروں کی چاپلوسی کرنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ تفتیش کی اس تبدیلی کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔ گواہوں کو ڈرایا دھمکایا گیا اور وہ اپنے بیانات سے منکر ہو گئے۔ دو تین ہفتے کے اندر اندر آصف خان چھوٹ کر گھر آ گیا۔

جس روز وہ گھر آیا اس کی رہائی کا باقاعدہ جشن منایا گیا۔ دیگیں پکیں اور گانے بجانے کا انتظام ہوا۔ میں جانتا تھا آج جہاں خوشیاں منائی جا رہی ہیں وہیں ایک چار دیواری میں صفِ ماتم بھی بچھی ہو گی۔ میری نگاہوں میں بار بار کلثوم کا غم زدہ چہرہ گھوم جاتا تھا۔ وہ جیسے بزبان خاموشی مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ''انسپکٹر صاحب تم سے کہا تھا ناں کہ وہ بہت زور آور ہے۔ اس کے خلاف بیان دے کر میں اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی مختصر کر لوں گی۔ اب بتاؤ میں کس کے پاس فریاد لے کر جاؤں کون مجھے پناہ دے گا؟''

میں تنہائی میں بیٹھا دیر تک سوچتا رہا۔ اس وقت شام کے آٹھ بجے تھے۔ میں تھانے سے اٹھا اور سیدھا ریاض عثمانی کے گھر پہنچ گیا۔ عثمانی کی والدہ اور بیوی دونوں گھر میں موجود تھیں۔ سہمی ہوئی مرغیوں کی طرح وہ اپنے بچوں کو پروں میں دبائے بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہروں پر رونق سی آ گئی...... میں نے ان کے پاس بیٹھ کر تسلی تشفی کی باتیں کیں اور خلوصِ دل سے وعدہ کیا کہ میں ہر مشکل میں اُن کا ساتھ دوں گا...... ابھی تک صرف مجھے اتنا ہی پتہ تھا کہ کلثوم کا خاوند ریاض عثمانی کسی اخبار میں کام کرتا تھا۔ اس نے اخبار میں کوئی ایسی بات لکھ دی تھی جو انگریز افسروں کو ناگوار گزری تھی۔ اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ گرفتاری سے بچنے کے لئے عثمانی نے مزاحمت کی جس کے نتیجے میں ایک انگریز پولیس افسر مکان کی چھت سے گر کر شدید زخمی ہو گیا۔ عثمانی کا کیس مزید خراب ہو گیا۔ اس پر فوجداری مقدمہ چلا اور اسے بڑی بے رحمی سے کالے پانی کی سزا دے دی گئی۔

اب آصف خان کے رہا ہونے کے بعد مجھے اس معاملے سے خاص طور پر دلچسپی پیدا

ہو گئی تھی۔ میں نے کلثوم اور اس کی ساس کے ساتھ تفصیلی بات چیت کی اور ان سے دریافت کیا کہ ریاض عثمانی کے ساتھ یہ سب کچھ کیسے اور کیوں ہوا... ساس بہو کے بیانات سے مجھے صرف ایک دو نئی باتیں ہی معلوم ہو سکیں۔ پہلی اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ گرفتاری سے پہلے ریاض عثمانی ہوشیار پور سے فرار ہو گیا تھا۔ اسے پولیس نے جالندھر سے گرفتار کیا جہاں وہ اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ دوسرے یہ پتہ چلا کہ ریاض عثمانی نے کسی انگریز افسر کے خلاف لکھا تھا اور اس حوالے سے کچھ تصویریں بھی شائع کی تھیں۔ اچانک میرے ذہن میں برق سی لہرائی۔ مجھے چار پانچ سال پہلے کی کچھ باتیں یاد آئیں۔ ان دنوں میں ڈلہوزی میں ڈیوٹی دے رہا تھا۔ ایک اخبار میں ایک انگریز افسر کے بارے میں بہت سنگین قسم کا الزام شائع ہوا تھا۔ اس الزام کے مطابق انگریز افسر نے جھوٹے پولیس مقابلے کے نام پر چند نامعلوم دیہاتیوں کو قتل کیا تھا اور انہیں چوری چھپے امرتسر کے ایک نواحی ویرانے میں دفن کر دیا تھا۔ اس خبر کی سرخی مجھے اتنے سال بعد بھی یاد تھی۔ ''انگریز افسر کا قتل عام امرتسر کے نواحی جنگل میں مقتولین کی اجتماعی قبر......'' اس حوالے سے چند تصویریں بھی شائع ہوئی تھیں۔ ایک جگہ بہت سا خون دکھایا گیا تھا اور چند جوتے بکھرے پڑے تھے۔ ایک تصویر میں کسی شخص کا ہیولا تھا۔ اس نے کندھے پر کوئی وزنی شے لاد رکھی تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ ''ایک لاش دفن کرنے کے لئے لے جائی جا رہی ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ریاض عثمانی کی بیوی سے پوچھا۔ ''کہیں یہ وہ خبر تو نہیں تھی جس میں ایک انگریز افسر پر کچھ دیہاتیوں کے قتل کا الزام لگا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ ان قتل ہونے والوں کو چوری چھپے ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا ہے......''

کلثوم نے کہا۔ ''میں نے کہا ہے ناں کہ مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ کوئی ایسا ہی معاملہ تھا۔ کچھ لوگوں کو گولی ماری گئی تھی اور انہیں ایک ہی جگہ دفن کر دیا گیا تھا۔''

کلثوم اور اس کی ساس سے ہونے والی گفتگو کے بعد ایک عجیب طرح کی بے چینی نے مجھے گھیر لیا۔ ان دونوں بے سہارا عورتوں کے لئے میرے اندر ہمدردی کا جذبہ تو پہلے ہی موجود تھا۔ اب یہ جذبہ اور توانا ہو گیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس معاملے کی پوری چھان بین کرنی چاہئے۔ ہوشیار پور کی پولیس لائن میں ایک رجسٹرار خدا بخش بہت باخبر شخص سمجھا جاتا تھا۔ اس کے پاس اخبارات کا ریکارڈ بھی موجود رہتا تھا۔ برسوں پرانی خبروں کی تفصیل یا تو اسے زبانی یاد ہوتی تھی یا اس کے اخباری ریکارڈ میں سے مل جاتی تھی۔

اگلی صبح تھانے میں چند ضروری کاموں سے فارغ ہوتے ہی میں رجسٹرار چاچے خدا

بخش سے ملاقات کے لئے چل دیا۔ میں نے اسے اپنی آمد کا سبب بتایا تو وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر جیسے ایک دم اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ کہنے لگا۔ ''تم اس مسٹر ایڈورڈ رن راک والی خبر کی بات کر رہے ہو ناں؟ وہی جو آج کل اے سی ہے۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''مسٹر راک کا اس خبر سے کیا تعلق ہے؟''

وہ ہنس کر بولا۔ ''او جناب عالی! یہی مسٹر راک ہی تو وہ بندہ ہے جس نے یہ قتل کئے تھے اور جس کے بارے میں ریاض عثمانی نے لکھا تھا۔ عثمانی ''سماچار'' اخبار کا چیف رپورٹر تھا۔ وہ خاص طور پر غلط قسم کے انگریز افسروں کی ٹوہ میں رہتا تھا۔ اس نے مسٹر راک کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ بڑے ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ لکھا تھا لیکن بجائے اس کے کہ مسٹر راک کو پھانسی پر چڑھایا جاتا الٹا عثمانی کو تاج برطانیہ کا غدار ٹھہرایا گیا اور کالے پانی کی سزا دے دی گئی۔ یہ واقعہ اب تک بہت سے لوگوں کو یاد ہے اور وہ اس کی کسک دل سے نکال نہیں سکے۔ مسٹر راک اس وقت صرف پی اے تھا لیکن اس کا اثر و رسوخ اس وقت بھی کم نہیں تھا۔ اس نے تفتیش کا رخ اپنی طرف مڑنے ہی نہیں دیا۔ پھر ایک غلطی خود عثمانی سے بھی ہو گئی۔ وہ اس مشترکہ قبر کی نشاندہی نہیں کر سکا جس میں اس کے بقول مسٹر راک نے آٹھ دیہاتیوں کو مار کر گاڑ دیا تھا۔ عثمانی کے مطابق یہ قبر امرتسر کے نواحی جنگل میں لنک کینال کی مغربی جانب تھی۔ پولیس والے اسے ساتھ لے کر موقعہ پر پہنچے۔ عثمانی وہاں پورے دو دن ٹامک ٹوئیاں مارتا رہا لیکن قبر تک نہیں پہنچ سکا۔ بعد میں اس نے بیان دیا کہ وہ اس جگہ کو ٹھیک سے یاد نہیں رکھ سکا ہے۔

عدالت تو پہلے ہی اسے جھوٹا ثابت کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہی تھی۔ جب وہ قبر کی نشاندہی کرنے میں ناکام ہوا تو اس کی کھینچی ہوئی تصویروں کو بھی ناقابل اعتبار قرار دے دیا گیا۔ وکیل صفائی نے الزام لگایا کہ یہ جعلی تصویریں ہیں اور ان میں کسی شخص کا چہرہ بھی صاف نظر نہیں آتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کیس الٹا عثمانی اور اخبار کے ایڈیٹر اور مالک ولایت سنگھ پر پڑ گیا۔ عثمانی پر باقاعدہ بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا۔ ولایت سنگھ پر بھی کڑی دفعات لگائی گئیں۔ ولایت سنگھ کی جان تو سستے میں چھوٹ گئی اور وہ تین سال کے لئے اڈیالہ جیل چلا گیا لیکن عثمانی چونکہ مسلمان تھا، اسے آڑے ہاتھوں لیا گیا اور غدار قرار دے کر اٹھارہ سال کے لئے کالے پانی روانہ کر دیا گیا۔

میں نے چاچے خدا بخش سے اس معاملے کی مزید تفصیل معلوم کرنا چاہی، مگر بہت سے واقعات اسے بھی بھول چکے تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے وہ پرانے اخبارات نکال

دے جن میں یہ واقعات چھپے ہیں۔ چاچے خدا بخش نے وعدہ کیا کہ شام تک مجھے اخبارات مل جائیں گے۔ شام کے بعد میں نے بلال شاہ کو بھیجا اور وہ مطلوبہ اخبار لے آیا۔ پانچ سال پہلے کے ان اخبارات پر یکم ستمبر سے لے کر سولہ ستمبر کی تاریخیں تھیں۔ یکم ستمبر والے اخبار میں یہ دھاکہ خیز خبر تھی کہ ایک انگریز افسر نے نامعلوم دیہاتیوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے گولی ماری اور گھنے جنگل میں اجتماعی قبر کھود کر دبا دیا۔ ان اخبارات کے مطالعے سے مجھے جو مکمل کہانی معلوم ہوئی اس کی تفصیل ریاض عثمانی کی زبانی کچھ اس طرح تھی۔ ریاض عثمانی نے لکھا تھا۔ ''مجھے پتہ چلا تھا کہ اس علاقے میں شراب کی چند چالو بھٹیاں موجود ہیں۔ ان بھٹیوں کی ناقص بلکہ خطرناک شراب امرتسر اور اس کے گرد و نواح میں فروخت کی جا رہی ہے۔ میں درحقیقت ان بھٹیوں کے کھوج میں ہی وہاں پہنچا تھا۔ میرے پاس فلیش گن والا جدید کیمرہ بھی موجود تھا۔ رات آٹھ نو بجے کا وقت تھا۔ میں برساتی نالے کے کنارے واقع کیکر اور ٹاہلی کے گھنے درختوں میں چھپا ہوا تھا۔ اچانک ایک پولیس گاڑی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ شاید میری طرح کوئی پولیس پارٹی بھی بھٹیوں کے کھوج میں یہاں تک پہنچی ہے لیکن اگلے پانچ دس منٹ میں میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ پولیس گاڑی کو درختوں کے درمیان ایک خالی جگہ پر کھڑا کر کے اس کا عقبی دروازہ کھولا گیا اور کچھ قیدیوں کو باہر نکالا گیا۔ یہ سارے قیدی خستہ حال تھے۔ سردی کے باوجود ان کا لباس نامکمل تھا۔ کسی کے جسم پر صرف دھوتی تھی۔ کوئی جانگیہ پہنے ہوئے تھا۔ ان سب کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ وہ اپنے قد کاٹھ اور حلیے سے بہاری یا بنگالی نظر آتے تھے۔ پولیس کے سپاہیوں نے رائفلوں کے دستے مار مار کر انہیں ایک لائن میں کھڑا کیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے انہیں گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔

چند منٹ بعد ان کی لاشیں اٹھا کر دوبارہ پولیس کی گاڑی میں ڈالی گئیں اور گاڑی رینگنے والے انداز میں درختوں کے درمیان آگے بڑھنے لگی۔ مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں گاڑی کے عقب میں چل دیا۔ گاڑی کی سرخ بتی میری راہنمائی کر رہی تھی۔ قریباً دو فرلانگ چلنے کے بعد گاڑی ایک مقام پر رک گئی۔ یہاں پہلے سے ایک اور گاڑی کھڑی تھی اور چار پانچ پولیس والے مصروف کار نظر آتے تھے۔ یہ دیکھ کر میری حیرت میں زبردست اضافہ ہوا کہ یہاں ایک بڑا سا گڑھا تیار کیا گیا ہے۔ لاشیں گڑھے میں پھینک کر اوپر مٹی ڈال دی گئی۔ اسی دوران ایک پولیس والے نے درختوں کی جانب ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ شاید اسے کسی طرح کا شبہہ ہوا تھا۔ میں گھبرا گیا کیونکہ ٹارچ کی

روشنی مجھے چھوتے ہوئے گزری تھی۔ میں وہاں سے نکل بھاگا۔ پولیس والوں نے میرا پیچھا کیا۔ میں ان کے بھاگتے قدموں کی آوازیں اور ان کی چیخ وپکار صاف سن رہا تھا۔ قریباً دو میل بھاگ کر میں اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوا اور پھر ساری رات بھٹکنے کے بعد امرتسر جالندھر روڈ پر پہنچ سکا۔“

چیف رپورٹر عثمانی کی اس رپورٹ کے ساتھ دو فوٹوگراف بھی تھے۔ یہ فوٹوگراف بنانے کے لئے فلیش لائٹ استعمال نہیں کی گئی تھی۔ عثمانی نے پولیس گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں یہ تصویریں بنائی تھیں۔ اسی لئے وہ بہت دھندلی تھیں۔ ایک تصویر میں ہیڈ لائٹس کی روشنی براہِ راست اس خون پر پڑ رہی تھی جو مقتولین کے جسم سے نکلا تھا۔ اس کے علاوہ چند جوتے بھی بکھرے ہوئے تھے۔ دوسری تصویر میں ایک پولیس والے کا ہیولا تھا جو ایک ننگ دھڑنگ شخص کو کندھے پر لاد کر لے جا رہا تھا۔ ننگ دھڑنگ شخص کے بازو ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح جھول رہے تھے اور صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بے ہوش ہے یا مر چکا ہے۔ ظاہر ہے عثمانی نے اور بھی کئی تصویریں کھینچی ہوں گی لیکن ان میں سے یہی دو تھیں جو کسی حد تک سمجھ میں آتی تھیں۔ بعد کی تاریخوں میں جو اخبارات آئے تھے ان میں اس معاملے پر کافی لے دے ہوئی تھی۔ پولیس ایسی کسی بھی کارروائی سے لاعلمی کا اظہار کر رہی تھی۔ جب کہ عثمانی دعویٰ کر رہا تھا کہ وہ اخباری نمائندوں کو اس اجتماعی قبر کا سراغ دے سکتا ہے۔ پھر وہ اخباری نمائندوں کے ایک گروپ کے ساتھ امرتسر روانہ بھی ہوا تھا لیکن راستے میں ہی اسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ بعد میں جب پولیس اسے اپنے ساتھ امرتسر لے کر گئی تو وہ قبر کی نشاندہی میں ناکام ہو گیا۔

میں نے اس واقعے کی تمام تفصیلات بڑے غور سے پڑھیں۔ ایک عجیب طرح کی پُراسراریت تھی اس ساری کہانی میں۔ اگر واقعی کچھ لوگوں کو قتل کیا گیا تھا تو پھر ان کے وارث منظرِ عام پر کیوں نہیں آئے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی توجہ طلب تھی کہ عثمانی دو مرتبہ کوشش کے باوجود قبر کا سراغ لگانے میں ناکام رہا تھا۔ مگر دوسرے رخ سے دیکھا جاتا تو عثمانی کی رپورٹ بھی بے حد ٹھوس تھی۔ وہ واقعی ان دنوں شراب کی بھٹیوں پر ایک زبردست فیچر تیار کر رہا تھا اور اپنے ایڈیٹر کی اجازت سے امرتسر کے گرد و نواح میں گھوم رہا تھا۔ اس نے جو تصویریں پیش کی تھیں ان میں سے ایک تصویر کے اندر پولیس کی وردی صاف پہچانی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ عثمانی کا سابقہ ریکارڈ گواہ تھا کہ وہ ایک قابلِ بھروسہ اور نہایت سنجیدہ رپورٹر ہے۔ اس نے ہمیشہ ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ رپورٹیں لکھی تھیں اور بعض اوقات بہت اہم انکشاف کئے تھے۔

اپنی اس کارروائی کے دوران عثمانی نے پولیس کی گاڑی کا نمبر بھی نوٹ کر لیا تھا اور جو سب سے اہم کامیابی اس نے حاصل کی تھی وہ یہ تھی کہ وہ ایک انگریز افسر کو صورت سے پہچان گیا تھا۔ یہ انگریز افسر مسٹر اینڈرسن راک تھا اور وہی اس ساری کارروائی کی نگرانی کر رہا تھا...... عثمانی نے براہِ راست ایک انگریز اہلکار پر الزام لگایا تھا لہٰذا مقامی حکومت کی ساری مشینری اس کے خلاف حرکت میں آ گئی اور چند ہفتوں کے اندر اس کیس کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دی گئیں۔ مسٹر راک نے رپورٹر عثمانی اور ایڈیٹر ولایت سنگھ کو کئی لوگوں کے سامنے دھمکی دی کہ وہ ان دونوں کو اس الزام تراشی کا مزہ چکھائے گا اور اس نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ خاص طور پر عثمانی کو تو واقعی اپنے کئے کی خوب سزا ملی۔

☆======☆======☆

میرے اندر ٹھن سی گئی کہ میں اس مشترکہ قبر والے معاملے کی تحقیق کروں گا۔ پانچ چھ روز کے وقفے سے میں ایک بار پھر عثمانی کی بیوی سے ملا۔ اس مرتبہ بھی یہ ملاقات عثمانی کے گھر ہی میں ہوئی۔ میں نے ساس بہو سے ان کی خیر خیریت دریافت کی اور ان پر زور دیا کہ اگر اب آصف خان کی طرف سے انہیں کسی قسم کا خطرہ محسوس ہو تو وہ بلاخوف فوراً مجھے اطلاع دیں۔ میری حوصلہ بخش باتوں سے وہ دونوں سہمی ہوئی عورتیں جیسے جی اُٹھی تھیں۔ کلثوم کی ساس نے بتایا کہ آصف خان نے تین روز کے اندر اندر انہیں مکان سے نکل جانے کا حکم دیا ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے ایک سال کا کرایہ بھی یک مشت مانگ رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر کرایہ نہ دیا گیا تو وہ نہ صرف ان کا سارا سامان ضبط کر لے گا بلکہ انہیں تھانے میں بھی گھسیٹے گا۔ میں نے کلثوم سے کہا۔ ”بی بی! فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آصف خان کو رقم بھی مل جائے گی اور تمہیں دوسرا مکان بھی۔ کل شام تک سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

پھر میں نے کلثوم سے ان واقعات کے بارے میں مختلف سوال پوچھنے شروع کر دیئے جو آج سے پانچ سال پہلے پیش آئے تھے اور جن کے نتیجے میں اس کے شوہر کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی گمنام جزیرے میں جانا پڑا تھا۔ ان واقعات کو یاد کر کے ایک بار پھر کلثوم کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ یوں لگا جیسے شوہر سے آخری ملاقات کا منظر اس کی نگاہوں میں گھومنے لگا ہے۔ میں نے کلثوم سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارے شوہر نے جو مشترکہ قبر والی بات کی تھی، وہ درست تھی۔“

وہ بولی۔ ”تھانیدار صاحب! میں غریب عورت ہوں۔ زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں ہوں لیکن ایک بات پورے یقین اور بھروسے سے کہہ سکتی ہوں، میرے شوہر نے کبھی کسی پر جھوٹا

الزام نہیں لگایا۔ وہ چاہتا تو جھوٹ بول کر بڑی ترقی حاصل کر سکتا تھا۔ کسی بڑے اخبار کا مالک بن سکتا تھا لیکن وہ ہمیشہ سچ بات کہنے والا بندہ ہے۔ اس کے دشمن بھی گواہی دیں گے کہ وہ نہ جھوٹ لکھتا ہے، نہ بولتا ہے۔“

کچھ اس قسم کی بات چوتھے روز پھر میرے کانوں میں پڑی۔ یہ بات کہنے والا ”سماچار“ اخبار کا ایڈیٹر ولایت سنگھ تھا۔ وہ اپنی سزا کاٹ کر چند ماہ پہلے ہی ہوشیار پور واپس آیا تھا۔ اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! میں نے وہ قبر آنکھوں سے نہیں دیکھی اور نہ ہی عثمانی کی کھینچی ہوئی تصویروں کے سوا کوئی ثبوت میری نگاہ سے گزرا ہے لیکن میں گرنتھ صاحب پر ہاتھ رکھ کر سوگند کھا سکتا ہوں کہ وہ قبر کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ اس لئے کہ اس قبر کے بارے میں اطلاع دینے والا عثمانی ہے۔ عثمانی نے جھوٹ بولا ہے اور نہ کبھی اس کی آنکھ نے دھوکا کھایا ہے۔“

ایڈیٹر ولایت سنگھ، عثمانی کے گھر پر ٹوٹنے والی قیامت سے بھی آگاہ تھا، اس نے اپنے اخبار میں نوعمر بچی پر ڈھائے جانے والے ظلم کا ذکر بڑی دلیری سے کیا تھا اور یہ بھی لکھ دیا تھا کہ مجرم ایک بااثر شخص ہے اور اس کے بااثر ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وقوعہ کے چند ہی روز بعد اس کی ضمانت ہوگئی ہے اور وہ اپنی رہائی کے جشن منا رہا ہے۔ ولایت سنگھ نے آصف خان کے اصل پشت پناہ یعنی مسٹر راک کا ذکر کھلے الفاظ میں تو نہیں کیا تھا۔ تاہم ڈھکے چھپے طریقے سے اشارہ دے دیا تھا کہ مجرم کو کن لوگوں کی آشیرباد حاصل ہے۔

میں نے جب ولایت سنگھ سے یہ پوچھا کہ آصف خان اور مسٹر راک میں کیا تعلق ہے تو ولایت سنگھ نے کہا۔ ”بہت گہرا تعلق ہے۔ تم اسے مسٹر راک کا مخبر خاص بھی کہہ سکتے ہو اور مسٹر راک نے اس علاقے میں آصف جیسے تین چار مخبر اور بھی پال رکھے ہیں۔ یہ لوگ مسٹر راک کی کوٹھی میں آتے جاتے رہتے ہیں اور کوئی بڑی بات نہیں کہ انہیں اس غداری کے صلے میں باقاعدہ وظیفہ بھی ملتا ہو۔“

میں اور ولایت سنگھ اس مسئلے پر دیر تک بات چیت کرتے رہے۔ اس بات چیت کے دوران ریاض عثمانی کا ذکر بھی آیا۔ ولایت سنگھ نے مجھے ریاض عثمانی کے چند خط دکھائے۔ یہ خط اس نے کالے پانی سے لکھے تھے۔ ان خطوں میں اپنی بدنصیبی کا تذکرہ کیا گیا اور وہ حالات بتائے گئے تھے جو عثمانی کو کالا پانی میں پیش آرہے تھے۔ ان خطوں کے ذریعے ہی مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ کالا پانی کو جزائر انڈیمان بھی کہتے ہیں۔ یہ دور دراز اور ویران جزیروں کا ایک مجموعہ ہے جہاں کی آب و ہوا نہایت خراب ہے اور خطرناک بیماریاں وہاں کثرت

سے پھلتی پھولتی ہیں۔ عثمانی ایک ”بدو“ نامی جزیرے پر تھا اور بڑی سختی کے دن گزار رہا تھا۔ اس نے خطوں میں بار بار یہ لکھا تھا کہ وہ بے گناہ ہے اور اس نے انگریز افسر مسٹر راک پر جو الزام لگایا ہے وہ سو فیصد درست ہے۔ اس نے اپنے بیوی بچوں کو بڑے دردناک انداز میں یاد کیا تھا اور اس المیے پر خون کے آنسو بہائے تھے کہ اس کے ساتھ ساتھ اس کی بیوی بھی جرمِ بے گناہی کی سزا کاٹنے پر مجبور ہے۔ ایک جگہ اس نے لکھا تھا۔ ”میں نے جرم کیا ہے یا نہیں یہ ایک علیحدہ سوال ہے لیکن میری بیوی کا کیا قصور ہے جسے ہمیشہ کے لئے اس کے شوہر سے جدا کر دیا گیا ہے اور ان بچوں کا کیا قصور ہے جو ایک دن بھی اپنے باپ کی صورت نہ دیکھتے تو پریشان ہو جاتے تھے۔“

اس ملاقات کے بعد بھی ایڈیٹر ولایت سنگھ سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ ملاقاتیں اکثر ولایت سنگھ کے دفتر میں ہی ہوئی تھیں۔ عثمانی کے حالات کا اسے بھی بہت دکھ تھا۔ اسے یقین تھا کہ کالے پانی میں اٹھارہ برس قید کی سزا کاٹ کر واپس آنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس سے بہت پہلے ہی قیدی کسی نہ کسی سنگین بیماری کا شکار ہو کر راہی عدم ہو جاتا ہے۔ اس کی موت کے کئی ہفتے بعد حکومت ہند کی طرف سے وارثوں کو ایک مختصر چٹھی ملتی ہے جس میں لکھا ہوتا ہے کہ قیدی فلاں ولد فلاں...... فلاں جزیرے میں طبعی موت کا شکار ہو گیا۔ خس کم جہاں پاک، عثمانی کے ساتھ بھی کسی روز یہی ہونا تھا۔ اپنے پیاروں کی دید کے لئے اس کی ترستی ہوئی آنکھیں پتھرا جانا تھیں۔ ہوشیار پور کے گلی کوچوں سے سینکڑوں ہزاروں میل دور کسی اجنبی جزیرے کی اجنبی مٹی نے اسے ہڑپ کر لینا تھا۔

ایڈیٹر ولایت سنگھ سے ملاقاتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ دھیرے دھیرے میرے اندر ایک ارادہ پروان چڑھنے لگا۔ یہ ارادہ تھا عثمانی کی مدد کا اور مشترکہ قبر والے کیس کو دوبارہ کھولنے کا۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک خطرناک کام ہے کیونکہ اس میں مسٹر راک سے براہ راست ٹکر ہے لیکن مسٹر راک سے ڈر کر اگر میں جانتے بوجھتے ظلم اور بے انصافی کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا تو یہ زبردست بزدلی ہوتی۔

سب سے پہلے تو میں نے ایڈیٹر ولایت سنگھ سے مل کر عثمانی سے خط و کتابت شروع کی۔ اس خط و کتابت کی رفتار بے حد سست تھی۔ خط کبھی ایک مہینے اور کبھی ڈیڑھ مہینے بعد منزلِ مقصود تک پہنچتا تھا۔ اس خط و کتابت کے ذریعے میں نے نہ صرف عثمانی کے مکمل حالات معلوم کئے بلکہ یہ جاننے کی کوشش بھی کی کہ وہ اجتماعی قبر جو عثمانی نے امرتسر کے نواحی علاقے میں دیکھی تھی کیسے تلاش کی جا سکتی ہے۔ عثمانی کے ذہن سے خود وہ جگہ نکل چکی تھی وہ ہمیں کیا بتاتا۔

بہر حال اس نے اپنی یادداشت کے زور پر چند نقشے بنا کر ہمیں بھیجے..... میں نے ان نقشوں اور دیگر معلومات کی مدد سے کھوج لگوانے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ انہی دنوں ایک خوبصورت اتفاق یہ ہوا کہ مجھے امرتسر سے ایک بہت اہم سیاسی قیدی کو لے کر جمشید پور جانا پڑا۔ جمشید پور کا شہر کلکتہ سے صرف دو سو میل کے فاصلے پر ہے۔ جمشید پور میں قیدی کو مقامی حکام کے حوالے کرنے کے بعد میں فارغ ہی فارغ تھا۔ کلکتہ دیکھنے کی خواہش میرے دل میں بہت عرصے سے موجود تھی۔ اب یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ میں کلکتہ سے اس قدر نزدیک آنے کے بعد بغیر اسے دیکھے واپس چلا جاؤں۔ میں نے جمشید پور کے ایک سب انسپکٹر وشوانا تھ کو ساتھ لیا اور بذریعہ ٹرین کلکتہ روانہ ہوگیا۔ کلکتہ اس زمانے میں ایک وسیع وعریض شہر تھا۔ جدھر نگاہ اٹھاؤ عمارتیں، سڑکیں اور بازار نظر آتے تھے۔ فیشن ایبل بنگالی عورتیں ساڑھیاں پہنے ہر جگہ کولہے مٹکاتی پھرتی تھیں۔ مردوں کے سروں پر بڑے بڑے پگڑ نظر آتے تھے۔ ان کی دھوتیاں بھی عجیب طرز کی تھیں۔ کلکتہ میں ہر جگہ انسانوں کا ہجوم نظر آیا۔ یوں لگتا تھا پورا ہندوستان اس شہر میں سمٹ آیا ہے۔

ایک ہفتے کے لئے میں نے خود کو ہر قسم کے غم وفکر سے آزاد کرلیا اور اس اجنبی شہر میں ایک من موجی سیاح کی طرح گھومنے پھرنے لگا۔ وشوانا تھ ہر جگہ میرے ساتھ تھا۔ وہ بنگالی تھا لیکن ٹھیک ٹھاک اردو بول لیتا تھا۔ عام پولیس والوں کے برعکس وہ ہنس مکھ اور باتونی شخص تھا۔ اس کی زبانی مجھے کالا پانی یعنی جزائر انڈیمان کے بارے میں چند اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ پہلی تو یہ کہ جزائر انڈیمان کلکتہ کے ساحل سے جنوب کی طرف تقریباً چھ سو میل کے فاصلے پر واقع ہیں اور جہاز یا بڑی موٹر بوٹ کے ذریعے یہ سفر تقریباً چار روز میں طے کیا جاسکتا ہے۔ دوسری بات جو وشوانا تھ نے بتائی یہ تھی کہ ان جزائر پر جانا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ حکومت اکثر لوگوں کو ایسے اجازت نامے جاری کرتی رہتی ہے جن کی مدد سے وہ اپنے کسی قیدی سے ملنے جزائر پر جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض لوگ سرکاری اہلکاروں کو کچھ دے دلا کر بھی بطور ملازم جہاز پر سوار ہوجاتے ہیں اور جزائر کا چکر لگا آتے ہیں۔ وشوانا تھ نے بتایا کہ ایک موٹر بوٹ کا انچارج عبداللہ نصیری اس کا پرانا واقف ہے۔ یہ شخص کئی افراد کو اپنے عملے میں بھرتی کر کے انڈیمان کی سیر کرا چکا ہے۔

وشوانا تھ کی باتیں سن سن کر میرے اندر بہت گہرائی میں سویا ہوا کوئی جذبہ بیدار ہونے لگا۔ میرا دل چاہا کہ اگر انڈیمان کی سیر ممکن ہے تو پھر اس موقعے کو ہاتھ سے کھونا نہیں چاہئے۔ میں نے کلکتہ سے اپنے افسران کو بذریعہ ڈاک اطلاع دے دی کہ مجھے ایک ضروری کام سے

کچھ دن کلکتہ میں رکنا پڑ رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میری واپسی میں چار پانچ ہفتے لگ جائیں۔ مزید تسلی کے لئے میں نے دو روز بعد ہوشیار پور میں ٹیلی فون بھی کر دیا۔

بہت عرصے سے میں نے کوئی چھٹی نہیں لی تھی۔ لہٰذا بہت سی چھٹیاں جمع ہو چکی تھیں۔ میں نے کلکتہ ہی سے چھٹی کی ایک درخواست ٹائپ کروائی۔ اس میں چھ ہفتے کی چھٹی مانگی گئی تھی اور ایک ناگہانی کام کا عذر پیش کیا گیا تھا۔ بذریعہ رجسٹری یہ درخواست ہوشیار پور روانہ کرنے کے بعد میں تھانے کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہوگیا۔ اس کام کے بعد میں اور وشوانا تھ اس عبداللہ نامی شخص سے ملے جو اپنی موٹر بوٹ پر اکثر انڈیمان آتا جاتا رہتا تھا۔ عبداللہ سے اسی کی بوٹ پر ہی ملاقات ہوئی۔ یہ بوٹ کلکتہ کی عظیم الشان بندرگاہ سے کچھ ہٹ کر ایک ویران گھاٹ پر کھڑی تھی۔ اس بوٹ کا نام ''جھانسی'' تھا۔ کہنے کو تو یہ بوٹ تھی لیکن چھوٹے موٹے جہاز سے کم نہیں تھی۔ دو طاقتور انجن تھے۔ عرشے کے اوپر باقاعدہ برج بنا ہوا تھا۔ بوقتِ ضرورت اس بوٹ میں بادبان بھی استعمال کئے جاسکتے تھے۔ اس پرائیویٹ بوٹ کو ہند سرکار کی طرف سے خصوصی لائسنس جاری کیا گیا تھا۔ ہم بوٹ پر پہنچے تو مزدور اس میں بوریاں لاد رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ ان بوریوں میں گیہوں اور چنا ہے جو جزائر انڈیمان لے جایا جائے گا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ ضروری اجناس وہاں پیدا نہیں ہوتی تھیں اور انگریز حکومت یہ اشیاء کلکتہ سے وہاں پہنچاتی تھی۔ بوٹ کے ایک نیم تاریک کیبن میں عبداللہ نصیری سے ملاقات ہوئی۔ وہ پینتالیس پچاس برس کا ایک لمبا چوڑا شخص تھا۔ اس کے کیبن میں شراب کی بُو رچی بسی تھی اور پورا کیبن دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بولتا تھا۔ وشوانا تھ نے اس سے میرا تعارف ایک دکاندار کے طور پر کرایا اور بتایا کہ پنجاب کے شہر ہوشیار پور میں کپڑے کا کاروبار کرتا ہوں۔ اس نے عبداللہ نصیری سے کہا۔ ''ریاض عثمانی اس کا گہرا دوست ہے اور پچھلے پانچ سال سے جزیرہ ''بدو'' میں سزا بھگت رہا ہے۔ اس نے عثمانی سے ملاقات کے لئے بہت کوششیں کی ہیں۔ کئی بار جیل حکام کو درخواستیں دی ہیں لیکن کوئی پیش نہیں چلی۔ اب اس کا آخری سہارا تم ہو ہم بہت امیدیں لے کر تمہارے پاس آئے ہیں۔''

نصیری نے اپنی گھنی بھنوئیں اٹھائیں اور بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کا انداز گھاگ تھانیداروں جیسا تھا۔ میں نے اپنے تاثرات کو مکمل طور پر قابو میں رکھا۔ وہ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر بولا۔ ''کتنے خرچ کرسکتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''میرے پاس تین ہزار روپیہ ہے۔ بس میں اتنے پیسے اپنے پاس رکھنا

چاہتا ہوں کہ واپسی پر کلکتے سے ہوشیار پور پہنچ جاؤں۔ باقی سب تم لے لو۔''

غالباً اسے میری بات پسند آئی تھی۔ وہ کچھ دیر بہت گہری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''لاؤ پیسے۔''

مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ جولائی کی دس تاریخ تھی۔ صبح کے آٹھ بجے موٹر بوٹ جھانسی کلکتے سے روانہ ہوئی۔ میں اس بوٹ میں بطور ''لوڈر'' بھرتی تھا۔ میری وردی نیلی قمیص اور زرد پتلون پر مشتمل تھی۔ قمیص کی پشت پر میرا نمبر 18 لکھا ہوا تھا۔ میرے علاوہ بوٹ پر عملے کے بیس ارکان اور بھی موجود تھے۔ عبداللہ ان سب کا باس تھا اور عبداللہ کی باس ایک شوخ و شنگ لڑکی تھی۔ وہ کہنے کو تو عبداللہ کی محبوبہ تھی لیکن اس پر کسی مالکن کی طرح حکم چلاتی تھی۔ عبداللہ بھی اس کی تمام خرمستیاں بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کرتا تھا۔ اس کی عمر بمشکل بیس سال رہی ہوگی۔ چست پتلون اور بشرٹ پہنتی تھی۔ بشرٹ کے بازو بہت مختصر اور گریبان بہت وسیع تھا اور پتلون تو جیسے جسم کے ساتھ سلی ہوئی تھی۔ اس کا نام بھی اس کی طرح عجیب تھا۔ عبداللہ اسے کوشیلا کہہ کر پکارتا تھا جبکہ بوٹ کا باقی عملہ بڑے احترام سے اسے میڈم کہتا تھا لیکن یہ احترام صرف دکھاوے کا تھا ورنہ بوٹ کا سارا عملہ اس میڈم کا عاشق تھا اور اسے دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتا تھا۔

یہ میرے لئے پہلا تجربہ تھا کہ میں سمندری سفر کر رہا تھا۔ ہندوستان سے باہر جانے کا بھی یہ میرا پہلا موقع تھا۔ بہت عجیب لگ رہا تھا یہ نیا تجربہ۔ میں نے اپنی سروس کے پندرہ سال مشرقی پنجاب کے دیہاتی علاقوں میں قاتلوں، چوروں اور رسہ گیروں کو پکڑتے گزارے تھے...... آج میں سمندر کی لہروں پر سوار تھا اور ایک گمنام جزیرے کی طرف جا رہا تھا۔ بہرحال میرا یہ سفر بھی سیر و سیاحت کے لئے نہیں ''ڈیوٹی'' کی خاطر تھا۔

ہمارا رخ سری لنکا (سیلون) کی طرف تھا لیکن ہمیں سری لنکا نہیں جانا تھا بلکہ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے پورٹ بلیر نامی مقام پر پہنچنا تھا۔ چار روز کے بحری سفر کے دوران کئی دلچسپ واقعات پیش آئے جن کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ بہرحال ایک واقعہ میں ضرور بیان کرنا چاہوں گا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، عبداللہ نصیری کی محبوبہ کوشیلا بڑی شوخ و شریر لڑکی تھی۔ وہ سر شام بہت مختصر سا لباس پہن کر بوٹ کے عرشے پر چڑھ آتی اور وہاں ایک چٹائی پر آڑی ترچھی ہو کر لیٹ جاتی۔ اس کے پاس ایک بیٹری سے چلنے والا ریڈیو تھا۔ وہ ریڈیو سنتی رہتی یا پھر دوربین سے اردگرد کا نظارہ کرتی رہتی لیکن عرشے پر آنے سے اس کا اصل مقصد بوٹ کے عملے کو اپنی ادائیں دکھانا ہوتا تھا۔ نوجوان چور نظروں سے اس کے بے ترتیب

جسم کو دیکھتے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے۔ کبھی کبھی وہ کسی کی چور نظروں کو پکڑ بھی لیتی۔ ایسے میں وہ چیخ کر کہتی۔ ''کیا دیکھ رہا ہے مورکھ۔ تیری آنکھ میں گرم سلائی پھروا دوں گی۔ بے شرم بے حیا کہیں کا۔''

سارا عملہ جانتا تھا کہ یہ چیخ و پکار صرف عبداللہ کو سنانے کے لئے ہے اور اسے یہ جتانے کے لئے ہے کہ وہ بڑی پٹاخہ لڑکی ہے اور عبداللہ کا سارا عملہ اس کا دیوانہ ہے۔ عرشے پر آرام کرنے کے دوران کوشیلا سگریٹ سے بھی شغل کرتی رہتی تھی۔ ہولڈر میں سگریٹ لگا کر وہ انگریز ایکٹرسوں کی طرح بڑے انداز سے کش لیتی اور ہونٹ سکوڑ سکوڑ کر دھواں فضا میں چھوڑتی۔ ایک روز اس نے سگریٹ کا ایک ٹکڑا لاپرواہی سے عرشے سے نیچے پھینک دیا۔ یہاں خشک بھوسے کا ڈھیر پڑا تھا۔ اسے آگ لگ گئی۔ میں اس وقت بوٹ کے گودام میں تھا۔ ہم گیہوں کی پھٹی ہوئی بوریاں مرمت کر رہے تھے۔ اچانک میں نے عرشے کی جانب سرخ روشنی دیکھی۔ اس وقت شام ہو چکی تھی اور بوٹ کے گردونواح میں گہری تاریکی پھیل چکی تھی۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر عرشے پر پہنچا تو ایک سنسنی خیز منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ بوٹ کا ایک حصہ آگ پکڑ چکا تھا۔ یہاں قریب ہی تیل کے چند بڑے ڈرم رکھے تھے۔ آگ ان ڈرموں تک پہنچ جاتی تو بوٹ پر قیامت برپا ہو جاتی۔ عملہ چیخ و پکار کر رہا تھا۔ کچھ لوگ آگ بجھانے کی کوششوں میں مصروف تھے اور کچھ دور کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اتنی ہمت کسی میں نہیں تھی کہ آگ میں گھرے ہوئے ڈرموں تک پہنچتا اور انہیں وہاں سے ہٹانے کی کوشش کرتا۔ اس وقت میں نے عبداللہ کو دیکھا۔ وہ عرشے پر بھاگتا ہوا آیا اور بڑی دلیری سے اس جگہ کود گیا جہاں ڈرم رکھے ہوئے تھے۔ اس نے زور لگا کر ایک ڈرم کو فرش پر گرایا اور دھکا دے کر دور تک لڑھکا دیا۔ پھر وہ دوسرے ڈرم کی طرف بڑھا۔ یہ ڈرم کافی بڑا اور وزنی تھا۔ عبداللہ کے لئے اسے زمین پر گرانا مشکل ہو رہا تھا۔ عملہ ہکا بکا کھڑا تھا اور کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ عبداللہ کی مدد کرنے کے لئے آگے بڑھتا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اگر عبداللہ کا ہاتھ نہ بٹایا تو سب کی زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ میں نے ایک ترپال اپنے گرد لپیٹی اور بھاگ کر آگ میں سے گزر گیا۔ عبداللہ کے ساتھ مل کر میں نے تیل کے باقی ڈرم نیچے گرائے اور انہیں لڑھکا کر آگ کے مقام سے دور ہٹا دیا۔

تیل کے ڈرم موقعے سے ہٹ گئے تو آگ بجھانے والوں کے حوصلے بھی بلند ہو گئے اور وہ زیادہ نزدیک آ کر آگ پر پانی پھینکنے لگے۔ کچھ دیر بعد آگ بجھ گئی۔ سب لوگ ہانپتے کانپتے ہوئے عرشے پر بیٹھ گئے۔ سب حیران تھے کہ آگ کیسے لگی۔ میں نے دبے لہجے میں

کہا۔ ''عبداللہ صاحب! میرا خیال ہے کہ یہ آگ میڈم کوشیلا کی لاپرواہی سے بھڑکی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' عبداللہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''میڈم شام سے کچھ دیر پہلے تک عرشے پر لیٹی ہوئی تھیں۔ انہوں نے دو تین سگریٹ بھی پیئے تھے۔ میرا خیال ہے سگریٹ کا کوئی ادھ جلا ٹکڑا انہوں نے عرشے سے نیچے بھوسے کے ڈھیر پر پھینک دیا۔''

ایکا ایکی عبداللہ نصیری کے چہرے پر طیش کے آثار نمودار ہوئے...... میری بات اس کے دل کو لگی تھی۔ اس نے زور سے اپنے جبڑے بھینچے اور دندناتا ہوا برج کی طرف چلا گیا۔ کوشیلا بھی برج میں تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں عبداللہ کے گرجنے برسنے کی آوازیں سن رہا تھا۔ وہ بنگالی بول رہا تھا لہٰذا الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن اتنا پتہ ضرور چل رہا تھا کہ وہ کوشیلا کو برا بھلا کہہ رہا ہے۔ بوٹ کا سارا عملہ حیرت زدہ نظر آ رہا تھا۔ غالباً انہوں نے اس سے پہلے عبداللہ کو کبھی کوشیلا پر بگڑتے نہیں دیکھا تھا۔

اس واقعے کے بعد ہم قریباً اڑتالیس گھنٹے بوٹ پر رہے۔ کوشیلا نے جب بھی مجھے دیکھا، قہرناک نظروں سے دیکھا۔ اسے کسی نہ کسی کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ عبداللہ کے ساتھ اس کی لڑائی کا سبب میں ہوں یعنی میں نے ہی عبداللہ کو بتایا تھا کہ آگ میڈم کی لاپرواہی کے سبب لگی ہے۔

کلکتہ سے روانہ ہونے کے ٹھیک پانچ روز بعد ہم انڈیمان پہنچ گئے۔ ہماری بوٹ پورٹ بلیر میں رکی۔ یہاں اور بھی کئی چھوٹے بڑے جہاز اور کشتیاں موجود تھیں۔ انگریز فوج کے باوردی سپاہی اور پولیس کے لوگ جگہ جگہ نظر آ رہے تھے۔ یہ ایک عام سا جزیرہ تھا۔ لوگ کھلے بندوں گھوم رہے تھے۔ کہیں خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ کہیں کشتیوں پر سامان چڑھایا اور اتارا جا رہا تھا۔ بازار کھلے تھے۔ مرد و زن، بچے بوڑھے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ بندرگاہ پر اُترتے ہی میرے کانوں میں موسیقی کی آواز پڑی۔ کہیں پاس ہی ڈھول تاشے بج رہے تھے۔ غالباً کوئی مذہبی رسم ادا کی جا رہی تھی۔ یہ کالا پانی اس ہیبت ناک جگہ سے بہت مختلف تھا جس کا تصور برسوں سے میرے ذہن میں موجود تھا۔ میرا خیال تھا کہ کسی چھوٹے سے الگ تھلگ جزیرے کے اردگرد کوئی بہت بلند و بالا فصیل ہوگی۔ فصیل پر مسلح سپاہی چوکسی سے پہرہ دیتے ہوں گے۔ آہنی سلاخوں والی کوٹھڑیاں ہوں گی اور ان کوٹھڑیوں میں ایسے قیدی ہوں گے جنہوں نے برسوں سے سورج کی روشنی نہیں دیکھی ہوگی۔ مگر یہاں ایسا کوئی منظر نظر نہیں آیا۔

ہم بندرگاہ پر اُتر گئے اور آزادی سے اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ کالا پانی میں مجھے جو پہلی خاص بات نظر آئی وہ یہ تھی کہ کچھ بہت بوڑھے لوگوں کی پیشانیوں پر ان کے نام اور درجے وغیرہ کندہ تھے۔ یہ عبارتیں پیشانیوں کو داغ کر لکھی گئی تھیں اور بہت بدنما معلوم ہوتی تھیں۔

پروگرام کے مطابق ہماری بوٹ کو چھ روز یہاں رکنا تھا۔ ان چھ دنوں کے اندر اندر مجھے نہ صرف ریاض عثمانی کو تلاش کرنا تھا بلکہ اس سے ملاقات بھی کرنا تھی۔ یہ ایک دشوار کام تھا لیکن بوٹ پر آتشزدگی والے واقعے کے بعد عبداللہ مجھ پر خاصا مہربان ہو چکا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ مجھے عثمانی سے ملانے میں ہر طرح میری مدد کرے گا۔ ہماری رہائش کا بندوبست بندرگاہ کے قریب ہی تھا۔ یہ ایک رہائشی کالونی تھی جس میں چھوٹے چھوٹے بہت سے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ ان کوارٹروں میں زیادہ تر بندرگاہ کے ملازمین اور ملاح وغیرہ رہتے تھے۔ مجھے یہاں ایک ایسا چہرہ بھی دکھائی دیا جسے میں چند برس پہلے دہلی کی ایک شاندار حویلی میں دیکھ چکا تھا۔ یہ شخص دہلی کے امراء میں شمار ہوتا تھا اور اس کا قالینوں کا کام ہندوستان کے کئی شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔ اس شخص کا پورا نام تو مجھے معلوم نہیں لیکن لوگ اسے ''نواب جی'' کہا کرتے تھے۔ میں نے نواب جی کو کالے پانی میں اس حال میں دیکھا کہ انہوں نے گھسے گھسائے کپڑے پہن رکھے تھے۔ پاؤں میں چپل تھی اور وہ ایک انگریز صاحب کے پیچھے پیچھے فائلوں کا انبار سر پر رکھے جا رہے تھے۔ میں نے نواب جی کو مخاطب کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ مجھے پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے پہچانتے تھے اور میں یہاں ایک مزدور کی حیثیت سے آیا تھا...... نواب جی کی خستہ حالی اور بے چارگی دیکھ کر میں حیران ہوا لیکن آنے والے دنوں میں اس طرح کے اتنے مناظر دیکھنے کو ملے اور میں نے ایسے ایسے باحیثیت کو فقیروں کے حال میں دیکھا کہ حیران ہونے کی عادت جاتی رہی۔

ہم جس کوارٹر میں رہتے تھے اس میں تین کمرے تھے۔ ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا جسے باورچی خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ عملے کے بیس یا بائیس ارکان انہی تین کمروں میں پھنس پھنسا کر رہتے تھے۔ بہرحال کھانے پینے کا انتظام وافر تھا۔ مکئی اور جوار کی روٹی مقامی لوگ بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کا پھل، گوشت، ترکاری اور دودھ وغیرہ ہمیں اسی چھوٹے سے کوارٹر میں مہیا کر دیا جاتا تھا۔ ایک رات کھانا وغیرہ کھا کر میں کوارٹر کی چھت پر چڑھ گیا اور وہیں ایک چٹائی بچھا کر لیٹ گیا۔ سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ کھجور کے بلند و بالا درختوں کی اوٹ سے طلوع ہونے والی چاند کی کرنیں ساحل کو روشن کر رہی تھیں۔ اس روشنی میں سمندر کی ڈوبتی ابھرتی لہریں دلکش منظر پیش کر رہی تھیں۔ میرا

تصور پَر لگا کر اُڑا اور سینکڑوں میل دور ہوشیار پور کے گلی کوچوں میں پہنچ گیا۔ میں سوچنے لگا معلوم نہیں وہاں لوگ کیا کر رہے ہوں گے۔ بلال شاہ کہاں ہوگا۔ سب انسپکٹر کرمانی کیا کر رہا ہوگا۔ ایڈیٹر ولایت سنگھ کیا لکھ رہا ہوگا۔ کلثوم کیا سوچ رہی ہوگی اور اس کا دشمن آصف خان کیا منصوبے بنا رہا ہوگا۔ کلکتہ روانہ ہونے سے کئی روز پہلے ہی میں کلثوم کی رہائش اور اس کی حفاظت کا خاطر خواہ بندوست کر چکا تھا۔ اب مجھے اس کی طرف سے کوئی خاص فکر نہیں تھی۔

یکا یک مجھے اپنے خیالوں سے چونکنا پڑا۔ صحن کی طرف سے کچھ نامانوس آوازیں سنائی دی تھیں۔ میں چٹائی سے اٹھا اور منڈیر کے قریب پہنچ کر احتیاط سے نیچے جھانکا۔ مجھے پولیس کے چند باوردی سپاہی نظر آئے۔ ان میں ایک بنگالی اے ایس آئی اور انگریز انسپکٹر نمایاں تھے۔ انگریز انسپکٹر سمیت تمام اہلکاروں کی وردی بشرٹ اور نیکر پر مشتمل تھی۔ انسپکٹر کے سر پر ہیٹ اور ہاتھ میں چھڑی تھی۔ بنگالی اے ایس آئی پستول سے مسلح تھا۔ بنگالی اے ایس آئی، عبداللہ نصیری سے مخاطب تھا اور بڑے تلخ لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ زبان بنگالی تھی لہٰذا بات میری سمجھ میں نہیں آسکی، ہاں حیات خان کا نام سن کر میں چونک پڑا۔ یہ بڑا اہم نام تھا۔ اے ایس آئی کی گفتگو میں یہ نام آنے کا مطلب تھا کہ میں سخت خطرے میں ہوں۔ وجہ یہ تھی کہ حیات خان کسی اور کا نہیں میرا اپنا ہی نام تھا۔ عبداللہ کی کشتی میں مَیں اس فرضی نام سے سوار ہوا تھا۔ میرے جسم میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ اسی دوران انگریز انسپکٹر کڑک کر بولا۔ ”وہ بہت بڑا فراڈ ہے۔ اگر تم اس کی حمایت کرو گے تو اس کے ساتھ خود بھی زبردست مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔“

عبداللہ نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔ ”میں اس کی حمایت نہیں کر رہا جناب! صرف اس کا قصور پوچھ رہا ہوں۔“

”قصور بھی ہم بتائیں گے۔ فی الحال اس کو باہر نکالو۔“

بھانڈا پھوٹ چکا تھا اور یہ سوچنے کا وقت بھی نہیں تھا کہ بھانڈا کیسے پھوٹا ہے۔ میں نے تیزی سے فیصلہ کیا۔ ہتھیار کے نام پر میرے پاس صرف ایک کمانی دار چاقو تھا۔ میں نے کمر ٹٹول کر چاقو کی موجودگی کا یقین کیا اور کوارٹر کی عقبی سمت میں آ گیا۔ چھت قریباً پندرہ فٹ بلند تھی۔ یہاں سے کودنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ اگر قسمت ساتھ دیتی تو میں تاریکی کا فائدہ اٹھا کر اس کالونی سے نکل سکتا تھا۔ میں کلائیوں کے زور پر منڈیر سے لٹکا اور نیچے چھلانگ لگا دی۔ زمین پر پاؤں ٹکتے ہی میں نے دائیں جانب دوڑ لگا دی اور یہیں پر میں غلطی کر گیا۔ میں اناس کے جھنڈ میں کھڑی وہ جیپ نہ دیکھ سکا جس کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں اور جس کے

اندر تین مسلح ساحلی محافظ بالکل چوکس بیٹھے تھے۔

جونہی میں جیپ کے قریب سے گزرا اس کا انجن سٹارٹ ہوا اور ساتھ ہی بتیاں روشن ہوگئیں۔ ”ہالٹ“ کی کرخت آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں اس آواز کو خاطر میں لائے بغیر بھاگتا چلا گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ مجھے سیدھی فائرنگ کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ میرے عقب میں فائرنگ ضرور ہوئی لیکن وہ ہوائی فائرنگ تھی۔ جیپ نے کسی شکاری کتے کی طرح جست لگائی اور چنگھاڑتی ہوئی میرے پیچھے لپکی۔

”ہالٹ...... ہالٹ“ کی آوازیں ایک بار پھر گونجیں لیکن میں اب گھنے درختوں میں تھا اور بدقسمتی آڑے نہ آتی تو فائرنگ سے محفوظ ہو چکا تھا۔ میں ناک کی سیدھ میں دوڑتا چلا گیا۔ ایک چھوٹی سی سڑک پار کی اور دوسری طرف کے گھنے درختوں میں داخل ہوگیا۔ میرے پیچھے آنے والوں نے اب جیپ چھوڑ دی تھی اور پا پیادہ میرا تعاقب کر رہے تھے۔ میں ان کی چیختی پکارتی آوازیں صاف سن رہا تھا۔ پھر اچانک ان آوازوں میں سیٹیاں بھی شامل ہوگئیں۔ یہ سیٹیاں خطرے کی علامت تھیں۔ ان کا مطلب تھا کہ میں جس رخ پر جا رہا ہوں وہاں مزید محافظ موجود ہیں اور میرے تعاقب میں آنے والے سیٹیاں بجا کر آگے والوں کو خبردار کر رہے ہیں۔ میں نے اپنا رخ بدلا اور سڑک کے متوازی دوڑنے لگا لیکن رخ بدلنے میں مَیں نے کافی دیر کی تھی۔ ...اچانک میری بائیں جانب بھاگتے قدموں کی آواز آئی اور دو سائے مجھ پر جھپٹے۔ ایک کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس نے وزنی رائفل کو کسی آہنی ڈنڈے کی طرح استعمال کر کے میرے سر کو نشانہ بنایا۔ میں نے تیزی سے نیچے جھک کر اس کا یہ وار بچایا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا تھا اس لئے اپنے ہی زور سے اوندھے منہ جھاڑیوں میں گرا۔ دوسرے قوی ہیکل شخص نے مجھے عقب سے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس موقع پر میں نے قمیص کے نیچے سے کمانی دار چاقو نکال لیا۔ چاقو پہلے ہی کھلا ہوا تھا۔ میں چاہتا تو پلک جھپکتے میں اپنے حریف کو نشانہ بنا سکتا تھا لیکن میں کسی کو ہلاک یا زخمی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اسی پولیس کا ایک حصہ تھا... اسی گورنمنٹ کا ملازم تھا جس کے یہ لوگ ملازم تھے۔ میں نے چاقو ہاتھ میں ہونے کے باوجود اسے استعمال نہیں کیا اور سر کے پچھلے حصے سے ایک زوردار ضرب اپنے حریف کے چہرے پر لگائی۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی اور وہ چہرہ پکڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اسی دوران سامنے سے ایک اور رائفل بردار محافظ نمودار ہوگیا۔ وہ سخت طیش میں تھا اور مرنے مارنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنی سیمی آٹومیٹک رائفل سیدھی کر لی۔ ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوتی تو وہ گولی چلا دیتا۔ میری ٹانگ عین وقت پر اس کے سینے پر پڑی اور وہ اچھل کر تاریکی میں

جا گرا۔ تاہم اس دوران وہ ٹریگر دبا چکا تھا۔ تڑتڑ کی آواز سے شعلے لپکے اور گولیاں شاخوں کو توڑتی ہوئی نکل گئیں۔ یہ موقع غنیمت تھا، میں نے جست لگائی اور زمین بوس محافظ کو پھلانگتا ہوا واپس سڑک کی طرف دوڑا۔ عین اس وقت ایک امپالا کار گزر رہی تھی۔ کار کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ میں نے ایک ساعت میں فیصلہ کیا اور بھاگ کر کار کے آگے کھڑا ہو گیا۔ کار کے بریک زور سے چرچرائے۔ جونہی وہ رکی میں نے پھرتی سے اگلا دروازہ کھولا اور ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک خوبرو نوجوان بیٹھا تھا۔ وہ اینگلو انڈین تھا۔ میرے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو اور آنکھوں میں وارننگ دیکھ کر اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ میں نے بلاتردد چاقو کی دھار اس کی گردن سے لگا دی۔

"گاڑی آگے بڑھاؤ۔" میں نے انگریزی میں کہا۔

اس کا پاؤں جیسے خود بخود کلچ سے ہٹ گیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور رفتار پکڑتی چلی گئی...... پہلے اچانک جھٹکے کے بعد نوجوان اب سنبھل گیا تھا۔ اس نے کن اکھیوں سے مجھے دیکھتے ہوئے شستہ انگریزی میں پوچھا۔ "کون ہو تم...... کیا چاہتے ہو؟"

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "سوال جواب نہیں۔ اپنا دھیان سڑک پر رکھو اور صرف ڈرائیونگ کرو...... کچھ لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ گاڑی کی رفتار جتنی بڑھا سکتے ہو بڑھا دو۔"

نوجوان نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "تم یہ چاقو میری گردن سے ہٹا دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری مرضی کے مطابق چلوں گا۔"

میں نے اس کی تلاشی لے کر چاقو اس کی گردن سے ہٹا لیا...... دو تین منٹ کے اندر اندر اس نے کار کو واقعی ہوائی جہاز بنا دیا۔ وہ بڑی مہارت سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں تعاقب کرنے والوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں۔ اس نے گاڑی کو بڑی جلدی جلدی چند سڑکوں پر موڑا اور ایک دو تنگ گلیوں سے گزارنے کے بعد ایک پارک نما جگہ کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ کوئی گنجان آبادی تھی۔ (رہائشی علاقہ تھا) رات کے دس بج چکے تھے لہٰذا ہر طرف خاموشی تھی۔ پارک کے سامنے سے گزرنے والی نیم تاریک سڑک بالکل خالی تھی۔ نوجوان نے کار کا انجن بند کیا تو یوں لگا کہ ہم شور و غل کو پیچھے چھوڑ کر کسی پرسکون لائبریری میں آ بیٹھے ہیں۔ نوجوان بڑی بے باکی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ میں نے تیزی سے کار کا جائزہ لیا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر ایک ٹوپی پڑی نظر آئی۔ یہ پولیس کی ٹوپی تھی۔ میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر کار کا دروازہ

کھولا اور دنگ رہ گیا۔ اس امپالا کار کا رنگ زرد تھا اور اس کے دروازوں پر کالے رنگ کے مونوگرام بنے ہوئے تھے۔ ان مونوگرامز کے عین درمیان "پولیس" لکھا ہوا تھا۔

میں پولیس سے بھاگ کر آیا تھا اور اس وقت پولیس ہی کی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ گہری تاریکی کے باعث میں سوار ہوتے وقت گاڑی کی صرف ہیڈ لائٹس ہی دیکھ سکا۔ گاڑی کا رنگ اور مونوگرام میری نگاہ سے اوجھل رہے تھے۔ میں نے حیرت سے نوجوان کی طرف دیکھا وہ زیرلب مسکرا رہا تھا۔

"میں اس نیکی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"وجہ یہ ہے کہ میں تمہارا خیرخواہ ہوں۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"میں نے پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔"

"میں نے بھی نہیں دیکھا۔ اس کے باوجود میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں...... جس جزیرے میں تم آئے ہو اسے لوگ بڑے برے ناموں سے یاد کرتے ہیں اور وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں کرتے۔ یہ جزیرہ تمہیں معمولی نظر آتا ہوگا لیکن یہ معمولی نہیں ہے۔ تم چند روز یہاں رہو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ اس ماحول میں کتنی سفاکی اور بے رحمی رچی بسی ہے۔ تم یہاں نہ آتے تو اچھا تھا اب آ گئے ہو تو کسی ہمدرد اور مخلص سہارے کے بغیر ایک قدم بھی مت چلو۔ ورنہ ٹھوکر کھاؤ گے اور سیدھے پھانسی گھاٹ پر پہنچو گے۔"

"تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"قریباً سب کچھ۔" جواب ملا۔ "اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہاری مخبری کر کے تمہیں اس جزیرے میں پھنسانے والا کون ہے۔"

"کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوشیلا۔" نوجوان نے اطمینان سے جواب دیا۔ "وہ لڑکی کسی بدروح سے کم نہیں۔ تم نے عبداللہ نصیری کے سامنے اس کے خلاف بول کر زبردست غلطی کی ہے۔ وہ اب آسانی سے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی...... میں ثبوت پیش کر سکتا ہوں کہ انڈیمان کی پولیس کو تمہارے پیچھے لگانے والی وہی حرافہ ہے۔"

دفعتاً گاڑی کے عقبی حصے سے نامانوس آوازیں آئیں۔ یوں لگا کہ کوئی ڈگی میں بندھا ہے اور ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ یہ آوازیں سن کر نوجوان بھی چونک گیا۔ اس نے اپنا سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے وہ ہوش میں آ گئی ہے۔"

"کون؟" میں نے پوچھا۔

''ابھی دکھاتا ہوں۔'' نوجوان نے کہا اور عجیب پُراسرار انداز سے مسکرانے لگا۔

ہم دونوں گاڑی سے نیچے اُتر آئے۔ نوجوان گھوم کر ڈگی کی طرف آیا اور چابی لگا کر ڈگی کھول دی۔ ڈگی کا منظر دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ وہاں جولڑکی مڑی تڑی پڑی تھی وہ کوشیلا تھی۔ وہ سرخ اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کا بالائی جسم چست اسکرٹ میں پھنسا ہوا تھا اور اسکرٹ سے نیچے ٹانگیں عریاں تھیں۔ جونہی ڈگی کھلی کوشیلا نے تڑپ کر باہر نکلنا چاہا لیکن نوجوان نے اسے دھکیل کر دوبارہ ڈگی میں گرا دیا۔

''خبردار۔'' وہ اس کی کنپٹی پر پستول رکھتے ہوئے غرایا۔ ''چپکی لیٹی رہو ورنہ مار کر یہیں پھینک دوں گا۔''

کوشیلا پر اس دھمکی کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ اس نے حلق کی پوری قوت سے چیخنے کے لئے منہ کھولا تاہم نوجوان نے بروقت ڈگی بند کر دی۔ کوشیلا کی چیخ ڈگی کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔

''آؤ چلیں۔ اب یہ لڑکی ہمیں چین سے نہیں رہنے دے گی۔'' نوجوان نے کہا اور مجھے لے کر پھر گاڑی میں آ بیٹھا۔ چند ہی لمحے بعد امپالا گاڑی سڑکوں پر فراٹے بھرتی نامعلوم سمت میں جا رہی تھی۔ ڈگی سے مسلسل دھما چوکڑی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تڑپنے مچلنے کے ساتھ ساتھ کوشیلا چیخ و پکار بھی کر رہی تھی۔ اگر وہ ڈگی سے باہر ہوتی تو شاید یہ چیخ و پکار سن کر جزیرے کی ساری پولیس ہمارے پیچھے لگ گئی ہوتی لیکن اب یہ آوازیں بمشکل ہم تک پہنچ رہی تھیں۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد ہم ایک شاندار کوٹھی میں بیٹھے تھے۔ یہ سرکاری کوٹھی تھی اور نوجوان پولیس آفیسر کو رہائش کے لئے ملی ہوئی تھی۔ نوجوان کا نام سنت سنگھ تھا اور وہ عہدے کے لحاظ سے انسپکٹر تھا۔ ایک انسپکٹر کا ایسی عالی شان کوٹھی میں رہنا کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ تاہم بعد میں معلوم ہوا کہ کالا پانی جیسی دور دراز اور خوفناک جگہ پر ڈیوٹی انجام دینے والے سرکاری اہلکاروں کو خاص سہولتیں اور آسائشیں فراہم کی جاتی ہیں۔ سنت سنگھ، کوشیلا کو پہلے سے جانتا تھا۔ اس نے راستے میں مجھے بتایا تھا کہ کوشیلا ایک چالاک عیار کال گرل ہے۔ ماضی میں جزیرہ بدو کے کئی سول اور فوجی افسروں سے اس کے تعلقات رہے ہیں لیکن اب ڈیڑھ دو سال سے وہ موٹر بوٹ ''جھانسی'' کے مالک عبداللہ نصیری کے پاس تھی۔

سنت سنگھ چونکہ کوشیلا کی ہوشیاری چالاکی سے واقف تھا لہٰذا اس نے اسے ڈگی سے اس وقت تک نہیں نکالا جب تک اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ نہیں دیئے تھے۔ پھر بھی وہ جنگلی بلی کی طرح غرا رہی تھی اور اچھل اچھل کر سنت سنگھ پر حملے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوٹھی کی

نشست گاہ میں پہنچ کر انسپکٹر سنت سنگھ نے اسے صوفے پر دھکیل دیا۔

کوشیلا کا اسکرٹ کندھے سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کے ایک بازو پر بھی چند خراشیں موجود تھیں۔ لگتا تھا کہ انسپکٹر سنت سنگھ کے ساتھ اس کی مار کٹائی بھی ہو چکی ہے۔ سنت سنگھ نے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

''اس شخص کو جانتی ہو؟'' سنت سنگھ کا اشارہ میری طرف تھا۔

''میں تو جانتی ہوں لیکن یہ ٹھیک سے مجھے نہیں جانتا۔'' وہ کڑک کر بولی۔

''کیا اس کے خلاف پولیس کو اطلاع تم نے دی تھی؟''

''ہاں میں نے دی تھی اور ڈنکے کی چوٹ پر دی تھی اور ابھی تو صرف اطلاع ہی دی ہے۔ جونہی میرا بس چلا اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر سمندر میں پھنکوا دوں گی۔ نہ پھنکواؤں تو میرا نام کوشیلا نہیں۔''

''تم کچھ نہیں کر سکتی ہو۔''

''آزمائش شرط ہے۔'' وہ غرائی۔ ''تم میرے ہاتھ کھول دو، ابھی اس کے ناک منہ سے خون نہ چھڑوا دوں تو کہنا۔''

وہ جوڈو کراٹے کا دور نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی یہ سوچ سکتا تھا کہ لڑکیاں بھی لڑائی بھڑائی میں ماہر ہو سکتی ہیں لیکن یہ لڑکی کسی اور ہی ٹائپ کی تھی۔ وہ بندھی ہوئی تھی لیکن پھر بھی ہمیں دھمکا رہی تھی اور مقابلے کا چیلنج کر رہی تھی۔

سنت سنگھ نے مسکراتی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''بھئی! میں نے تو آج تک کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اگر تم اس سے کشتی لڑنا چاہتے ہو تو بخوشی لڑ سکتے ہو۔''

سنت سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی برادر! اس کم بخت کا بڑا کارگر علاج میرے پاس موجود ہے۔''

پھر اس نے اپنے ایک ملازم کو آواز دی۔ ادھیڑ عمر ملازم اندر آیا تو سنت سنگھ نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ ملازم باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ہاؤنڈ نسل کا ایک بے حد جسیم کتا لے کر اندر آ گیا۔ یہ کتا غیر معمولی طور پر وزنی اور قد آور تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں جھانک کر ایک کپکپی سی جسم پر طاری ہو جاتی تھی۔ کتے کو دیکھ کر کوشیلا کے ہونٹوں سے دبی دبی چیخ نکل گئی اور وہ جو چند لمحے پہلے بہت غصے میں نظر آ رہی تھی ایک دم ہلدی کی طرح زرد ہو گئی۔ ظاہر ہے وہ ایک چلتی پھرتی لڑکی تھی۔ اسے مار پیٹ کا خوف تھا اور نہ اپنی عزت کے جانے کا۔ یہ بھی اسے یقین تھا کہ ہم اسے قتل نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دلیر نظر آ رہی تھی۔ مگر اب ایک

خونخوار کتے کو سامنے دیکھ کر اس کی گھگھی بندھ گئی۔ کوشیلا کے سرخ اسکرٹ کو دیکھ کر کتا اور زیادہ مشتعل ہو گیا اور اس کے حلق سے دھیمی دھیمی مسلسل غراہٹ بلند ہونے لگی۔ یہ آواز جیسے کسی بہت بڑے کنوئیں سے آ رہی تھی اور اپنے اندر عجب درندگی سمیٹے ہوئے تھی۔ کوشیلا نے چلا کر اپنی ٹانگیں صوفے پر چڑھا لیں۔ سنت سنگھ کے اشارے پر اس کے ملازم نے کتے کی زنجیر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ کتے کی دُم نے تیزی سے گردش کی اور وہ زوردار آواز میں بھونکتا ہوا کوشیلا پر حملہ آور ہوا۔ اس نے جب اپنے دونوں اگلے پنجے اٹھائے تو اس کا قد چھ فٹ سے بھی بلند نظر آنے لگا۔ کوشیلا کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں اور وہ ہذیانی انداز میں چلاتی چلی جا رہی تھی۔

تین چار منٹ یہ کش مکش جاری رہی۔ کبھی کتا کوشیلا کے بالکل نزدیک پہنچ جاتا، کبھی ملازم اسے کھینچ کر پیچھے ہٹا لیتا۔ کتے کا خوف کوشیلا کے لئے تھرڈ ڈگری سے بڑھ کر اذیت ناک تھا۔ سنت سنگھ نے اس کے سامنے چند سادہ کاغذات اور قلم رکھ دیا اور کہا کہ وہ اپنی جان چھڑانا چاہتی ہے تو ان کاغذات پر دستخط کر دے۔ پانچ منٹ کے اندر اندر کوشیلا نے تمام کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد ایک تحریر شدہ کاغذ لایا گیا اور اس پر دستخط کرا لئے گئے۔

☆======☆======☆

سنت سنگھ نے مجھے بتایا کہ کوشیلا کسی ناگن سے کم نہیں لیکن سادے کاغذات پر دستخط کرا کے اس نے اس ناگن کے دانت نکال دیئے ہیں۔ کوشیلا کو چھوڑ دیا گیا تھا اور وہ واپس عبداللہ نصیری کے پاس موٹر بوٹ پر چلی گئی تھی۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں سنت سنگھ کی کوٹھی میں بالکل محفوظ تھا۔ حالات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جزیرہ بدو میں جگہ جگہ میری تلاش ہو رہی ہے لیکن تلاش کرنے والوں کے خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ میں ایک ایسے شخص کے گھر میں ہوں جو ان کے ساتھ مل کر تلاش کے کام میں مصروف ہے۔

انسپکٹر سنت سنگھ نے مجھے کوشیلا کے بارے میں جو کچھ بتایا اس سے پتہ چلا کہ اس نے کوشیلا کو ایک انگریز افسر کی کوٹھی سے نکلتے ہوئے پکڑا تھا۔ دراصل کوشیلا اور انسپکٹر سنت سنگھ میں پرانی چپقلش چلی آ رہی تھی۔ ایک موقع پر انسپکٹر سنت سنگھ نے کسی بات پر ناراض ہو کر کوشیلا کو تھپڑ مار دیا تھا بس اس وقت سے وہ انسپکٹر کے اعلیٰ افسروں کو اس کے خلاف بھڑکانے میں لگی رہتی تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ انسپکٹر سنت سنگھ کی تبدیلی ایک دوسرے جزیرے ڈیلا اس میں کر دی جائے۔

کل رات جب انسپکٹر سنت سنگھ نے اسے انگریز افسر کی کوٹھی سے نکلتے دیکھا تو اس نے یہی خیال کیا کہ وہ افسر کو اس کے خلاف سکھا پڑھا کر نکلی ہے۔ وہ اس سے بہت تنگ آ چکا تھا۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق اس نے کوشیلا پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک مناسب جگہ پر اس نے کوشیلا کو جا دبوچا اور اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ کوشیلا نے زبردست مزاحمت کی۔ سنت سنگھ کے ایک ساتھی نے عقب سے کوشیلا کے سر پر چوٹ لگائی جس سے وہ بے ہوش ہو گئی۔ ان دونوں نے اسے ڈگی میں ڈال دیا۔ کوشیلا کے لباس کی تلاشی سے انہیں ایک خط بھی ملا۔ یہ خط کوشیلا نے اپنی ایک دوست کو لکھا تھا لیکن ابھی پوسٹ نہیں کیا تھا۔ اس طویل خط سے یہ انکشاف ہوا کہ کوشیلا انگریز افسر سے کسی اور سلسلے میں ملاقات کر کے آ رہی تھی۔ حیات خان نامی ایک شخص نے (یعنی میں نے) موٹر بوٹ میں اس کی بے عزتی کی تھی اور عبداللہ نصیری سے اسے ڈانٹ پلوائی تھی۔ حیات خان غیر قانونی طور پر کالا پانی آیا تھا۔ اب کوشیلا نے اس کی مخبری کر کے اسے گرفتار کرانے کی کوشش کی تھی۔ بعد ازاں اس خط کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اعلیٰ افسران کی طرف سے انسپکٹر سنت سنگھ سمیت کچھ پولیس اہلکاروں کو یہ حکم ملا کہ وہ عبداللہ نصیری کی رہائش گاہ پر چھاپہ ماریں اور وہاں سے حیات خان کو (یعنی مجھے) گرفتار کر لیں۔

خیر اب میں کوشیلا کے معاملے کو کچھ دیر کے لئے ایک طرف رکھتا ہوں۔ کالا پانی اور جزیرہ بدو میں میرے آنے کا اصل مقصد اس شخص کی تلاش تھا جسے ناکردہ گناہ کی سزا میں کالا پانی بھیجا گیا تھا۔ وہ شخص یہاں نہ جانے کس تاریک کوٹھڑی میں بند تھا اور اس کے ساتھ ہی اس اجتماعی قبر کا راز بھی دفن تھا جو امرتسر کے نواحی جنگل میں واقع تھی اور اپنے پیٹ میں کم از کم آٹھ انسانی لاشیں چھپائے ہوئے تھی۔ سنت سنگھ مجھے ایک مخلص اور بے لوث دوست نظر آ رہا تھا لہٰذا میں نے اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دیا۔ یعنی کس طرح ریاض عثمانی نامی رپورٹر شراب کی بھٹیوں کا کھوج لگاتا ہوا امرتسر کے ایک نواحی علاقے میں پہنچا اور وہاں اس نے ایک انگریز افسر کو آٹھ دیہاتیوں کے خون سے ہاتھ رنگتے اور انہیں مشترکہ قبر میں دفناتے دیکھا۔ پھر کس طرح اس رپورٹر کو جھوٹے مقدمات میں پھنسا کر کالے پانی کی سزا دی گئی اور اب اس بدنصیب قیدی کے لاوارث بیوی بچوں کو کیسی کیسی اذیتوں سے گزارا جا رہا ہے۔ میں نے سنت سنگھ سے کلثوم کا ذکر کیا اور اس کی معصوم بچی حمیدہ کا بھی جسے آصف خان نے انگریز افسر مسٹر راک کی آشیر باد سے درندگی کا نشانہ بنایا تھا۔

میری اس کتھا کا انسپکٹر سنت سنگھ پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ جزیرہ بدو میں میری ہر طرح مدد کرنے پر تل گیا۔ اس نے اپنے ذرائع استعمال کئے اور ایک ہی روز میں پتہ چلا لیا کہ

ریاض عثمانی جزیرے کی کس جیل میں اور جیل کے کون سے حصے میں ہے۔ اپنے وعدے کے مطابق اگلے روز سنت سنگھ نے مجھے عثمانی سے ملانا تھا لیکن اس روز وہ میرے لئے کوئی اچھی خبر نہ لاسکا۔ اس نے بتایا کہ عثمانی وہاں نہیں ہے۔ قریباً تین ماہ پہلے وہ شدید بیمار ہوگیا تھا اور اسے جیل سے ہسپتال میں منتقل کردیا گیا تھا۔ ہسپتال سے پتہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ وہاں بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد سنت سنگھ نے ریکارڈ کی چھان بین کروائی۔ اس چھان بین سے ایک اور سنسنی خیز انکشاف ہوا۔ پتہ چلا کہ عثمانی جیل کے ہسپتال سے فرار ہوگیا تھا۔ وہ ایک طوفانی رات تھی۔ ہسپتال کی روشنیاں گل ہوگئیں۔ دھواں دھار بارش سے بچنے کے لئے پہرے دار بھی کونوں کھدروں میں چھپ گئے تھے۔ ایسے میں ایک قیدی جس نے اپنی زنجیر پہلے سے کاٹ رکھی تھی ہسپتال سے فرار ہوگیا۔ وہ ریاض عثمانی تھا۔ مقامی پولیس جو اپنی سخت گیری میں مشہور ہے اسے ڈھونڈنے کی سرتوڑ کوشش کررہی تھی لیکن اسے ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

یہ بالکل نئی صورت حال سامنے آئی تھی۔ میں ریاض عثمانی سے ملنے اور اس کی مدد کرنے کے لئے اتنا طویل سفر کرکے یہاں تک پہنچا تھا اور وہ یہاں ایک ''لاپتہ شخص'' تھا۔ سنت سنگھ کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ جیل میں ایک راجہ نامی شخص سے ریاض عثمانی کی ان بن ہوئی تھی اور راجہ نے عثمانی سے مار پیٹ بھی کی تھی۔ یہ راجہ جیل میں مقدم تھا۔ جیسا کہ اکثر قارئین جانتے ہیں مقدم وہ قیدی ہوتا ہے جسے کچھ اختیارات دے کر دیگر قیدیوں پر نگران بنا دیا جاتا ہے۔ بعض ایسے نگرانوں کو خاص وردیاں فراہم کی جاتی ہیں اور کالا پانی میں ایسے نگرانوں کو یہ رعایت بھی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جیل سے باہر اپنے گھر میں رات گزار سکتے ہیں۔ اتفاقاً راجہ کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ انسپکٹر سنت سنگھ کی کوٹھی کے پچھواڑے ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر ناڈو نامی کالونی میں راجہ کا کوارٹر تھا۔ انسپکٹر سنت سنگھ نے مجھے کوارٹر کا نمبر بھی بتادیا۔ اس نے مجھے راجہ کی ایک تصویر بھی دکھائی جو اس کی فائل میں لگی ہوئی تھی۔

انسپکٹر سنت سنگھ کی رات کی ڈیوٹی تھی۔ ایک رات جب وہ ڈیوٹی پر چلا گیا تو میں کوٹھی سے نکلا اور پوچھتا پاچھتا ناڈو کالونی تک جا پہنچا۔ بے شک جزیرے میں میری تلاش ہورہی تھی لیکن میری شکل وصورت سے صرف وہ دو تین سپاہی واقف تھے جن سے میری مکالات ہوئی تھی۔ باقی لوگوں کے لئے میں اجنبی ہی تھا۔ نہ کسی کے پاس میری کوئی تصویر تھی اور نہ شناخت۔ رات قریباً دس بجے میں نے ایک آہنی دروازے پر دستک دی۔ چھوٹے قد کا ایک فربہ اندام ہندوستانی باہر نکل آیا۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر ہی مجھے یقین ہوگیا کہ وہ راجہ

نہیں ہے۔ میں نے اس سے راجہ کے بارے میں پوچھا۔ وہ پہلے تو مجھے سرتاپا گھورتا رہا پھر پوچھنے لگا۔ ''راجہ سے تمہیں کیا کام ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ایک ذاتی نوعیت کا کام ہے اور میرا اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔''

وہ بولا۔ ''راجہ تو دو ہفتے پہلے یہ کوارٹر چھوڑ چکا ہے اور مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں کہ وہ کدھر گیا ہے۔'' اسی دوران بارش ہونے لگی۔ رات کا وقت تھا پتہ ہی نہیں چلا کہ مطلع ابر آلود ہے۔ اب آناً فاناً زبردست تریڑا پڑنے لگا تھا۔ صاحب خانہ نے مجھے مجبوراً اندر آنے کی دعوت دی۔ میں اندر چلا گیا۔ گھر میں کوئی خاتون بھی موجود تھی لہٰذا مجھے بیٹھک میں بٹھایا گیا۔ صاحب خانہ کا نام عباس علی تھا۔ وہ بھی جزیرہ بدو کا قیدی تھا لیکن پڑھا لکھا تھا لہٰذا اسے ایک دفتر میں کلرک کی نوکری مل چکی تھی۔ اچھی بھلی تنخواہ تھی۔ رہنے کے لئے کوارٹر تھا اور شادی یا شادیاں کرنے کی بھی اجازت تھی۔ شرط صرف اتنی تھی کہ اس کی بیوی کا تعلق جزائر انڈیمان سے ہو۔ وہ اپنی ہندوستانی بیوی کو انڈیمان میں نہیں لاسکتا تھا اور نہ خود وہاں جاسکتا تھا۔ جزائر انڈیمان کے بیشتر پڑھے لکھے قیدیوں کو یہ سہولتیں حاصل تھیں۔ بلکہ ان میں سے کئی تو ان جزائر میں ایک خوشحال اور مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔

باتوں باتوں میں عباس علی اور میں گھل مل گئے۔ میں نے عباس کو بتادیا کہ میں یہاں ریاض عثمانی نام کے ایک قیدی کو ملنے آیا ہوں۔ (لیکن یہ نہیں بتایا کہ غیر قانونی طور پر آیا ہوں) میں نے اس پر ظاہر کیا کہ عثمانی میرا کوئی قریبی عزیز ہے۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ عباس علی، ریاض عثمانی کے بارے میں جانتا ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ راجہ اور ریاض عثمانی میں چپقلش رہی ہے۔ دراصل عباس بھی جیل ہی کی نوکری کرتا تھا اور جیل کے گنے چنے مسلمان قیدیوں کے بارے میں اسے بیشتر معلومات حاصل تھیں۔ اس نے بتایا کہ راجہ نے ایک عمر رسیدہ قیدی پر تشدد کیا تھا۔ اس بات پر ریاض عثمانی کا اس سے جھگڑا ہوگیا۔ مقدم راجہ نے ریاض عثمانی کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔ دونوں میں مارا ماری ہوئی۔ راجہ نے گھونسہ مار کر ریاض کے دو دانت توڑ ڈالے۔ بعدازاں جیل کے قانون کے مطابق ریاض کو ایک ماہ قید تنہائی کی سزا بھی ہوئی۔ تاہم ریاض عثمانی چونکہ پڑھا لکھا تھا اور انگریزی بھی لکھ پڑھ لیتا تھا لہٰذا اس سے نرم رویہ اختیار کیا گیا۔ نہ تو اسے کوڑوں کی سزا ہوئی اور نہ راشن وغیرہ میں کمی کی گئی۔ ذرا توقف کرکے میرے میزبان نے سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ''اس واقعے کے بعد سے راجہ اور عثمانی میں کشیدگی تھی۔ بلکہ مجھے تو شک ہے کہ عثمانی کی بیماری کا باعث بھی راجہ ہی تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے عثمانی کو کوئی زہریلی چیز کھلا دی ہو۔ اس کے لئے ایسا کرنا

زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ لنگر خانے میں بھی کام کرتا تھا اور لانگریوں سے اس کے قریبی تعلقات تھے۔''

میں نے پوچھا۔ ''عثمانی کو ہوا کیا تھا؟''

''دست اور الٹیاں لگ گئی تھیں۔'' عباس علی نے جواب دیا۔ ''ایک ہی روز میں وہ برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔ اسے ہسپتال نہ پہنچایا جاتا تو شاید زندہ ہی نہ بچتا۔''

میں نے کہا۔ ''عباس علی صاحب! پھر تو ایک اور بات بھی سوچی جاسکتی ہے۔ ممکن ہے کہ عثمانی ہسپتال سے فرار نہ ہوا ہو۔ اسے اغوا کرلیا گیا ہو۔ جیسا کہ آپ بتارہے ہیں راجہ کافی اثر ورسوخ والا شخص ہے۔ کیا پتہ اس نے اپنے کارندوں کے ذریعے عثمانی کو ہسپتال سے اٹھوایا ہو اور مار کر کہیں گاڑ دیا ہو۔''

عباس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آنے لگے بولا۔ ''میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ویسے یہ بات ایسی ناممکن بھی نہیں ہے۔ اس معاملے کی اچھی طرح چھان بین کی جائے تو بہت کچھ سامنے آسکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''سنا ہے پولیس بھی چھان بین کررہی ہے۔ انہوں نے کیا نتیجہ نکالا ہے؟''

''نتیجہ خاک نکلنا ہے۔'' عباس نے جواب دیا۔ ''نتیجہ اس وقت نکلتا ہے جب تفتیش غیر جانبداری سے کی جائے۔ یہاں کی پولیس کو تو مسلمان قیدیوں کے خلاف کیس بنانے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ بہانے بہانے سے مسلمانوں کو مقدمات میں پھنساتے ہیں اور سخت سزائیں دیتے ہیں۔ اب یہ عثمانی والا سلسلہ ہی دیکھ لیں۔ ہسپتال سے دو نرسوں اور ایک ڈاکٹر کو گرفتار کیا گیا۔ ان پر الزام تھا کہ وہ عثمانی کے فرار میں ملوث ہیں۔ انہیں تھانوں میں زبردست تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ تینوں مسلمان ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''اب وہ تینوں کہاں ہیں؟''

عباس نے بتایا۔ ''دونوں نرسوں کو تو چھوڑ دیا گیا ہے لیکن ڈاکٹر ابھی تک پولیس کے قبضے میں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''دونوں میں سے کسی نرس کا پتہ بتا سکتے ہو مجھے؟''

وہ بولا۔ ''نرس شمیم ناڈو کالونی ہی میں رہتی ہے۔ اٹھارہ نمبر لین میں دسواں کوارٹر ہے اس کا۔ بے چاری کے ساتھ بہت بُرا سلوک ہوا ہے۔ دو پولیس افسروں نے چار روز تک اسے اپنے قبضے میں رکھ کر دن رات بے آبرو کیا ہے۔ کئی روز تو وہ بستر سے نہیں اٹھ سکی لیکن

یہاں پوچھنے والا کون ہے اور انگریز افسر تو یہاں ویسے ہی سیاہ سفید کے مالک ہیں۔ ان کا خیال ہے قیدی عورتوں سے تفتیش کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے۔''

میں نے نرس شمیم کے بارے میں عباس علی سے کچھ معلومات مزید حاصل کیں اور پھر اس سے رخصت ہوکر باہر آگیا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اس وقت کسی عورت کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانا مناسب نہیں تھا لہٰذا میں انسپکٹر سنت سنگھ کی کوٹھی میں واپس آگیا۔

شمیم نامی نرس سے میری ملاقات اگلے روز رات نو بجے ہوئی۔ اس رات پھر بارش ہورہی تھی۔ تاہم میں مکمل انتظام کرکے نکلا تھا۔ برساتی کے علاوہ میرے پاس ٹارچ اور چھتری بھی تھی۔ میری دستک پر ایک درمیانی عمر کی عورت نے دروازہ کھولا۔ یہی شمیم تھی۔ اس کے نقوش بہت اچھے نہیں تھے، لیکن رنگ گورا چٹا اور جسم گدرایا ہوا تھا۔ میں نے اس سے اپنا تعارف اسی حیثیت سے کرایا جس حیثیت سے عباس علی سے کرایا تھا۔ یہ جان کہ میں عثمانی کے بارے میں کوئی معلومات حاصل کرنے کے لئے آیا ہوں شمیم متفکر نظر آنے لگی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ یہ بھی پولیس کی کوئی چال ہے۔ میں نے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کرکے اسے اپنے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب رہا۔

وہ مجھے کوارٹر کے اندر لے آئی۔ اس کے ساتھ دو اور عورتیں بھی کوارٹر میں مقیم تھیں۔ ایک نرس تھی اور دوسری ہسپتال میں دایہ کا کام کرتی تھی۔ یہ ایک ادھیڑ عمر سکھ عورت جانکی کور تھی۔ جانکی کور نے مجھ سے بہت کھل کھلا کر باتیں کیں۔ اس نے انگریز افسروں کو بے تحاشا صلواتیں سنائیں اور شمیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ حرامیوں نے اس بے چاری کو حاملہ کردیا ہے۔

میں نے شمیم سے کہا۔ ''میں اتنا طویل سفر طے کرکے عثمانی سے ملنے یہاں آیا تھا۔ وہ رشتے میں میرا بھائی ہے اور مجھے اس سے ایک بے حد ضروری کام ہے لیکن یہاں اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ ہسپتال سے فرار ہوا ہے۔ کسی کا کہنا ہے کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔ میں تمہارے پاس یہ امید لے کر آیا ہوں کہ تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کرسکو گی۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر زخمی لہجے میں بولی۔ ''جس رات یہ واقعہ ہوا ہسپتال کے اس حصے میں عملے کے سات آٹھ ارکان موجود تھے۔ ان میں ایک وارڈ بوائے کشن کمار بھی ہے۔ میرے خیال میں اگر قیدی واقعی اغوا ہوا ہے تو پھر اس سلسلے میں کشن کمار سے زیادہ اور کسی پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ کشن کمار اکثر قیدی سے باتیں کرتا نظر آتا تھا۔ جس رات قیدی فرار یا اغوا ہوا اس رات کشن کمار کی ڈیوٹی اسی خاص وارڈ میں تھی۔ قیدی کی گمشدگی کے بعد قریباً چھ

گھنٹے تک کشن کمار موقعہ سے غائب رہا۔ بعد میں اس نے بہانہ بنایا تھا کہ وہ زکام کی دوا کھا کر سٹور روم میں سویا ہوا تھا۔ چونکہ کشن کمار ہندو ہے اور انگریز اہلکاروں کی چاپلوسی کرتا رہتا ہے لہٰذا اسے سرے سے شاملِ تفتیش ہی نہیں کیا گیا۔"

دایہ جانکی کور بولی۔ "بھرا جی! واہگرو کو جان دینی ہے، جھوٹ نہیں بولوں گی۔ مجھے تو پکا پکا وشواس ہے کہ اگر وہ قیدی سچ مچ اغوا ہی ہوا ہے تو پھر اس میں کشن کمار کا ہاتھ ہوگا۔۔ وہ ہمارے ساتھ ہی کام کرتا ہے۔ اس کے سارے کرتوتوں لچھنوں سے ہم واقف ہیں۔ دمڑی دمڑی پر جان دیتا ہے۔ شراب تو اس کی گھٹی میں شامل ہے شراب کی صرف ایک چھوٹی بوتل کے لئے اس نے دو بندے قتل کر دیئے تھے۔ اس جرم میں اسے کالے پانے لایا گیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ قیدی والے معاملے سے ضرور کشن کمار کا کوئی نہ کوئی ٹانکا ہے۔ آج کل اس کی پانچوں گھی میں ہیں۔ چھٹی کے دن صاف ستھرے کپڑے پہن کر کھاڑی کے شراب خانے میں جاتا ہے۔ ولایتی شراب پیتا ہے اور سؤر کا تلا ہوا گوشت کھاتا ہے۔ آج کل اس کی جیب بہت گرم ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک دم یہ جیب گرم کیسے ہوگئی ہے۔"

نرس شمیم اور دایہ جانکی وغیرہ سے میری بہت کارآمد گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ عثمانی کا کھوج لگانے کے لئے میرا وارڈ بوائے کشن کمار سے ملنا بے حد ضروری ہے۔ میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور نرس شمیم کے کوارٹر سے نکلتے ہی کشن کمار کے درشن کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس وقت تک رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ بارش اب تھم گئی تھی اور تیز رفتار بدلیوں کی اوٹ سے ستارے جھانک رہے تھے۔ وہ ہفتے کی رات تھی لہٰذا جزیرے کی سڑکیں سنسان نہیں ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی ابھی شام پڑی ہے۔ میں درمیانی رفتار سے گلی نمبر 18 کی جانب چل دیا۔ آدھ پون گھنٹے کے اندر میں نے نہ صرف گلی ڈھونڈ لی بلکہ مطلوبہ مکان بھی تلاش کرلیا لیکن اس سے پہلے کہ میں مکان کے دروازے تک پہنچتا اور دستک دیتا مجھے ٹھٹک کر ایک تاریک گلی میں داخل ہونا پڑا۔ کشن کمار کے کوارٹر کا دروازہ اچانک کھلا تھا اور دو افراد باتیں کرتے ہوئے باہر نکل آئے تھے۔ ان میں ایک ناٹے قد کا تھا۔ دوسرا لمبا چوڑا تھا اور اس کی نوکدار مونچھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ گلی کی روشنی میں مَیں ان دونوں کے چہرے صاف دیکھ سکتا تھا۔ میں نے نوکدار مونچھوں والے کو پہچان لیا۔ بلاشبہ وہ راجہ تھا۔ میں اس کی تصویر انسپکٹر سنت سنگھ کے پاس دیکھ چکا تھا۔ میرے جسم میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ ریاض عثمانی کا ایک اہم ترین کھوج ہاتھ میں آگیا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ اندازہ بھی درست ثابت ہو رہا تھا کہ ریاض عثمانی کو جیل سے ہسپتال پہنچانے اور

ہسپتال سے غائب کرنے میں راجہ کا ہاتھ ہے۔

اب سانولی رنگت والے کشن کمار سے ملنا اتنا اہم نہیں رہا تھا۔ اصل مجرم راجہ تھا اور مناسب یہی تھا کہ راجہ سے دو دو ہاتھ کئے جائیں۔ گلی کی ایک دیوار کے ساتھ بوسیدہ سا اسکوٹر کھڑا تھا۔ نوکدار مونچھوں والا جو یقیناً راجہ تھا اسکوٹر پر سوار ہوا اور اسے سٹارٹ کر کے ایک طرف روانہ ہوگیا۔ میرے پاس سواری نہیں تھی ورنہ اسی وقت راجہ کا پیچھا کر کے اس کا ٹھکانہ معلوم کیا جا سکتا تھا۔ میں کچھ دیر اندھیری گلی میں بے حس و حرکت کھڑا رہا پھر اپنے ٹھکانے پر واپس جانے کے لئے مڑ گیا لیکن عین اس وقت مجھے بہت تیزی سے نیچے جھکنا پڑا۔ ورنہ جو چیز شائیں کی آواز سے میرے سر کی طرف لپکی تھی وہ یقیناً میرے چہرے کا گوشت ادھیڑ دیتی۔ یہ کسی سائیکل یا موٹر سائیکل کا زنگ آلود چین تھا۔ چین سے میرے سر کو نشانہ بنانے والا ایک موٹا تازہ مکرانی تھا۔ اپنی سیاہ رنگت کے باعث وہ اندھیرے ہی کا حصہ نظر آ رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کب سے اور کہاں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پہلا وار خالی جاتے ہی وہ غرایا اور دوگنی پھرتی سے دوسرا وار کیا۔ میں الٹے قدم پیچھے ہٹا۔ اس مرتبہ آہنی چین میرے سینے کو چھوتا ہوا گزرا۔ یوں لگا جیسے چھاتی کے گوشت میں کسی نے گرم سلائی اتار دی ہے۔ میں نے بھنا کر ایک لات مدِمقابل کی پسلیوں میں رسید کی۔ چونکہ میری پشت کو دیوار کا سہارا تھا لہٰذا یہ لات بڑی قوت کے ساتھ مدِمقابل کے جسم پر پڑی۔ وہ ڈکراتا ہوا سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔ عین اس وقت ایک ہیولا دائیں جانب سے نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی آہنی راڈ تھا۔ اس نے راڈ گھمایا۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا۔ آہنی راڈ پختہ دیوار سے ٹکرایا اور تاریکی میں چند چنگاریاں سی چمک گئیں۔ میں نے بند چھتری کی نوک سے ایک جچی تلی ضرب حملہ آور کے سینے میں لگائی وہ تڑپ کر دوہرا ہوگیا۔ پھر میری ٹھوکر نے اسے بوسیدہ برج کی طرح الٹا دیا۔

میں واپس پلٹ کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن پہلا شخص بلال شاہ کے جناتی انداز میں مجھ سے لپٹ گیا۔ اسی اثناء میں ایک تیسرا شخص بھی پہنچ گیا۔ اس نے عقب سے میری گردن میں بازو ڈال دیا اور صرف بازو ہی نہیں ڈالا کسی وزنی چیز سے میرے سر ضرب بھی لگائی۔ ایکا ایکی آنکھوں میں ستارے ناچے اور میری مزاحمت دم توڑ گئی۔

چند منٹ بعد حواس بحال ہوئے تو میں نے خود کو ایک کمرے میں پایا۔ یہ ایک مختصر سا بیڈ روم تھا۔ ایک جانب جھلنگا چارپائی پڑی تھی۔ فرش پر ناریل اور نیم پختہ کیلے کے چھلکے بکھرے پڑے تھے۔ تپائی پر ایک بہت بوسیدہ ریڈیو رکھا تھا اور اس میں سے عجیب و غریب آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ بلب کی روشنی میں مَیں نے دیکھا میرے سینے سے خون بہہ رہا

تھا۔ سر پر بھی چوٹ آئی تھی۔ میں قریباً دس منٹ تک بے ہوش یا نیم بے ہوش رہا تھا۔ اس نیم بے ہوشی کے دوران میری جامہ تلاشی لینے کے بعد میرے ہاتھ اچھی طرح پشت پر باندھ دیئے گئے تھے۔ اس مقصد کے لئے رسی یا ڈوری کی بجائے وہی آہنی چین استعمال کیا گیا تھا اور میری کلائیاں سخت تکلیف محسوس کر رہی تھیں۔ کمرے میں مجھے تین صورتیں نظر آئیں لیکن تینوں اجنبی تھیں۔ ان میں سے صرف ایک شخص کو میں اس کے ڈیل ڈول سے پہچان سکا۔ یہ وہی فربہ اندام مکرانی تھا جس نے مجھ پر پہلا وار کیا تھا۔ اب وہ اپنی نہایت سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اسی دوران دروازے کی جانب سے اسکوٹر کے انجن کا شور سنائی دیا۔ یہ شور عین دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا راجہ کے کارندوں نے مجھے پکڑنے کے بعد کشن کمار کے کوارٹر میں بند کیا تھا اور راجہ کو اس کے گھر سے بلا لیا تھا تاکہ وہ مجھ سے پوچھ گچھ کر سکے۔ اسکوٹر پر آنے والا راجہ ہی تھا۔

راجہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آیا۔ اس کی ایک انگلی مسلسل نوکدار مونچھوں پر گردش کر رہی تھی۔ مکرانی نے ایک طرف جا کر راجہ سے کچھ کھسر پھسر کی۔ پھر وہ دونوں میرے پاس آ گئے۔ راجہ نے اردو میں پوچھا۔ ''ہاں بیٹا جی! کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے تھے؟''

اس کی عمر مجھ سے بمشکل پانچ چھ برس زیادہ ہوگی۔ اس کے منہ سے اپنے لئے بیٹے کا خطاب سن کر کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ میں نے کہا۔ ''میں ایک موٹر بوٹ پر ملازم ہوں۔ ہم چار دن پہلے یہاں پہنچے ہیں۔ جزیرہ بدو پر میں پہلی بار آیا ہوں۔ اپنے مالک کی اجازت سے ذرا گھومنے پھرنے نکلا تھا۔ تمہارے آدمیوں نے پکڑ کر مار پٹائی کی اور یہاں بند کر دیا۔''

وہ غرایا۔ ''کیا میں تمہیں گدھا نظر آتا ہوں۔ کشتیوں اور جہازوں کا عملہ بندرگاہ کے آس پاس رہائش اختیار کرتا ہے اور بندرگاہ سے باہر نہیں جا سکتا۔ تم اس وقت بندرگاہ سے تقریباً چار میل دور پائے گئے ہو۔''

میں نے اپنا شناختی کارڈ نکال کر راجہ کے سامنے رکھ دیا۔ اس کارڈ پر نہ صرف میری تصویر چسپاں تھی بلکہ مکمل کوائف بھی لکھے تھے۔ ان کوائف کے مطابق میرا نام حیات خان تھا اور میں موٹر بوٹ جھانسی پر بطور پورٹر ملازم تھا۔ کارڈ پر مہر اور مجاز افسروں کے سائن بھی موجود تھے۔ کارڈ دکھانے میں ایک خطرہ بھی تھا۔ جزیرے میں اس وقت میری حیثیت مفرور مجرم کی سی تھی۔ عین ممکن تھا کہ راجہ یا اس کے ساتھی مجھے مفرور کی حیثیت سے پہچان جاتے۔ بہر طور خیر خیریت گزری۔ میرا شناختی کارڈ دیکھنے کے بعد راجہ کا رویہ کچھ نرم پڑ گیا۔ اس نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کو کہا اور خود بھی سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ بدستور پشت پر

بندھے ہوئے تھے۔ راجہ بولا۔ ''میرے آدمی کہتے ہیں کہ تم گلی میں چھپ کر کھڑے تھے اور کشن کمار کے گھر پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔''

''میں پھر کہوں گا کہ آپ کے کارندوں کو غلط فہمی ہوئی ہے میں.....''

''بکواس بند کرو۔'' مکرانی نے میری بات کاٹی اور مجھے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ پھر وہ راجہ سے مخاطب ہوا۔ ''آپ اس کی کسی بات کا وشواس نہ کرو راجہ صاحب۔ یہ کوئی بہت چالاک اور خطرناک شخص ہے۔ ہم تینوں نے بڑی مشکل سے قابو کیا ہے اسے۔''

''اوہ۔'' راجہ نے ہونٹ سکوڑے اور دلچسپی سے مجھے دیکھنے لگا۔

جس شخص کے چہرے پر میں نے ٹھوکر رسید کی تھی اس کی ناک سے خون رس رہا تھا اور وہ مجھے مسلسل کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ بھڑک کر بولا۔ ''راجہ صاحب! مجھے تو یہ خفیہ پولیس کا بندہ لگتا ہے۔ لڑائی بھڑائی کی خاص ٹریننگ لی ہوئی ہے اس نے۔''

راجہ کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔ غالباً اپنے کارندوں کے منہ سے میرے خطرناک ہونے کی باتیں سن کر اس کا دل میرے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کو چاہ رہا تھا۔ راجہ کسرتی جسم کا مالک ایک مضبوط شخص تھا۔ اس کے ہاتھ بہت بڑے بڑے اور لوہے کی مانند سخت دکھائی دیتے تھے۔ وہ ہر پہلو سے ایک پھرتیلا اور جنگجو شخص نظر آتا تھا۔ غصیلے لہجے میں بولا۔ ''بیٹا جی! لگتا ہے جوانی بڑا جوش مار رہی ہے تمہارے اندر۔''

''ہاں چاچا جی! جوانی جو ہوئی۔'' میں نے بھی تلخ ترش لہجے میں جواب دیا۔

باہر ایک بار پھر بارش نے زور پکڑ لیا تھا۔ اب ساتھ تیز ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ اچھے خاصے طوفان کا سماں بندھ گیا تھا۔ دروازے کھڑکیاں دھڑ دھڑ بج رہے تھے۔ کوارٹر کی چوبی چھت پر چھاجوں پانی برس رہا تھا۔ راجہ عجیب ٹھہری ہوئی سی آواز میں بولا۔ ''مکرانی! ہاتھ کھول دو بیٹا جی کے۔''

مکرانی ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا پھر اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ آہنی چین سے آزاد کر دیئے۔

''تم لوگ باہر جاؤ۔'' راجہ نے اپنے کارندوں کو حکم دیا۔

وہ بلا چوں چراں باہر نکل گئے۔ راجہ نے دروازہ بند کر دیا اور میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ غصے اور جوش سے تمتما رہا تھا۔ میرا گریبان تھام کر بولا۔ ''بڑی گرمی ہے تیرے خون میں۔ لے مار اپنے باپ کو مار۔''

اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اسے اپنی قوتِ بازو پر حد سے زیادہ اعتماد ہے۔ غالباً وہ

مجھے اپنے سامنے ایک نوعمر لڑکا سمجھ رہا تھا، جو لڑائی بھڑائی میں کتنا بھی ماہر تھا اس کے سامنے طفلِ مکتب ہی تھا۔ اس نے گریبان سے پکڑ کر مجھے زوردار جھٹکا دیا اور پھر ایک ہتھوڑے جیسا مکہ میرے منہ پر مارا۔ میں لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا۔ اپنی پہلی کامیابی نے اسے اور زیادہ شیر کر دیا اور اس نے میری ٹانگوں میں ہاتھ دے کر مجھے اوپر اٹھانا اور زمین پر پٹخنا چاہا۔ جوش و خروش میں وہ اپنے دفاع کو بالکل نظرانداز کر گیا تھا۔ جونہی وہ مجھے دبوچنے کے لئے قریب آیا میں نے پھرتی سے اس کی ناف میں گھٹنا مارا، وہ تکلیف سے دہرا ہوا تو میں نے اس کی گردن بغل میں لی اور گھما کر نیچے گرا دیا۔ یہ سب کچھ ایسا آناً فاناً ہوا کہ راجہ ہلکی سی مزاحمت بھی نہیں کر سکا۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب وہ میرے نیچے دبا ہوا تھا اور اس کی گردن بُری طرح میرے بازو کے شکنجے میں کسی ہوئی تھی۔ یہ بڑی جان لیوا گرفت تھی۔ میں دباؤ میں اضافہ کر دیتا تو بے حد مضبوط ہونے کے باوجود راجہ کی گردن سرکنڈے کی طرح ٹوٹ سکتی تھی۔ راجہ کی آنکھیں ابلی ہوئی تھیں اور حلق سے خرخر کی مدھم آواز نکل رہی تھی۔ ایک ہی لمحے میں وہ عرش سے فرش پر آ گرا تھا اور بے بسی کے عالم میں میرے نیچے پڑا تھا۔

''جی چاچا جی۔ گردن کی ضرورت ہے یا توڑ دوں اسے؟'' میں نے اس کے کان میں تلخ سرگوشی کی۔

اس نے خود کو چھڑانے کے لئے یکبارگی زور مارا لیکن پھر فوراً ہمت ہار دی۔ میں نے اس کے نیفے میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹے سائز کا مشین پسٹل نکال لیا۔ پھر راجہ کے اوپر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ راجہ کچھ دیر فرش پر چت لیٹا اپنی گردن سہلاتا رہا پھر وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میری انگلی مشین پسٹل کی لبلبی پر تھی اور اس کی سیاہ نال کا رخ راجہ کے سینے کی طرف تھا۔ وہ کپڑے جھاڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بھی صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔

''یہ پسٹل مجھے واپس کر دو۔'' وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔

''کیوں چاچا جان۔'' میں نے اپنا طنزیہ لہجہ برقرار رکھا۔

''اس لئے کہ یہ خالی ہے......لیکن اگر بھرا ہوا بھی ہوتا تو تمہیں اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یہ تم سے میرا وعدہ ہے کہ جب تک تم اس چار دیواری میں ہو، میں یا میرے کارندے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

''اس نوازش کی وجہ پوچھ سکتا ہوں چاچا جان؟''

''اس لئے کہ میں نے تمہاری بہادری اور دلیری کو کھلے دل سے تسلیم کیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے بہادر اور دلیر کہہ کر بھی تم اپنی ہی اہمیت جتا رہے ہو۔ یعنی تم جیسے

رستم زمان کو نیچا دکھا کر میں نے خود کو دلیر ثابت کر دیا ہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ تمہیں زیر کرنا میرے لئے ہرگز فخر کی بات نہیں ہے۔''

احساسِ ندامت سے ایک لمحے کے لئے راجہ کا چہرہ سرخ ہو گیا تاہم اس نے فوراً اس کیفیت پر قابو پا لیا اور بولا۔ ''میں تم سے دوستانہ ماحول میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔'' میں نے تند و تیز لہجے میں کہا اور اپنے لباس کے اندر سے وہ ریوالور نکال لیا جو میں انسپکٹر کی کوٹھی سے لے کر نکلا تھا۔ میں نے ریوالور کی نال راجہ کی جانب سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ریوالور پکڑنا ہی نہیں چلانا بھی جانتا ہوں۔ تم نے کوئی چالاکی دکھائی تو مجھے گولی چلانا پڑے گی اور ایسا کرتے ہوئے میں یہ ہرگز نہیں سوچوں گا کہ اس کے بعد میرے ساتھ کیا ہو گا۔''

میری آواز کے ٹھہراؤ اور فیصلہ کن انداز نے راجہ کی پیشانی پر پسینے کے موتی چمکا دیئے۔ وہ ایک دم گم صم سا ہو گیا تھا۔ غالباً اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا واسطہ ایک ٹیڑھے شخص سے پڑ گیا ہے۔ میں نے کمرے کی تمام کھڑکیاں دروازے اندر سے بند کر دیئے اور راجہ کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ریاض عثمانی کہاں ہے؟''

راجہ کو جیسے دس ہزار وولٹ کا کرنٹ لگ گیا۔ ''کک......کون عثمانی؟'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

''وہی عثمانی جسے تم نے پہلے زہر دے کر مارنے کی کوشش کی اور پھر ہسپتال سے اغوا کر لیا۔''

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟''

''بالکل ٹھیک ہے اور ابھی تھوڑی دیر میں تمہارا بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارے خلاف پورے پورے ثبوت میرے پاس موجود ہیں اور وارڈ بوائے کشن کمار کا کیس تو بالکل مکمل ہے اور اسی وقت عدالت میں بھیجا جا سکتا ہے۔''

''تم......تم ہو کون؟'' راجہ ہکلایا۔

''ابھی خود ہی تو تم مجھے بیٹا کہہ رہے تھے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''میرے خیال میں تم پولیس کے آدمی تو نہیں ہو۔ جزیرے کے ایک ایک پولیس والے کو میں شکل سے جانتا ہوں......اور مجھے لگ رہا ہے کہ تم وہ بھی نہیں ہو جو تمہارا شناختی کارڈ بتا رہا ہے۔ شاید تم خاص اس شخص سے ملنے کے لئے ہی یہاں آئے ہو جس کا نام تم عثمانی بتا رہے ہو۔''

"اگر میں کہوں کہ ایسا ہی ہے تو پھر؟"

وہ بولا۔ "پھر...... تمہیں مجھے اپنے بارے میں تفصیل سے بتانا ہوگا...... اس میں تمہارا فائدہ ہے...... اور فائدہ یہ ہے کہ میں تمہیں ریاض عثمانی کے بارے میں کچھ اہم معلومات دے سکتا ہوں۔" اس فقرے کے ساتھ ہی راجہ نے تسلیم کرلیا کہ وہ عثمانی کو جانتا ہے۔

"مجھے اہم معلومات کی ضرورت نہیں۔" میں نے بے رخی سے کہا۔ "ریاض عثمانی تمہارے پاس موجود ہے اور تم ابھی تھوڑی دیر میں اسے میرے حوالے کرو گے۔"

راجہ نے کہا۔ "کیا میں سمجھوں کہ تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتے؟"

"میں بتا دوں گا لیکن پہلے تم یہ تسلیم کرو کہ عثمانی اس وقت تمہارے پاس ہے۔"

وہ کچھ دیر گہری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "میں یہ مانتا ہوں کہ عثمانی اس وقت زندہ سلامت جزیرہ بدو میں موجود ہے اور میں تمہیں اس کے پاس پہنچا سکتا ہوں۔"

"تم بات کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "بہرحال میں تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ میرا تعلق انڈین پولیس سے ہے۔ میرا عہدہ انسپکٹر کا ہے اور میں مشرقی پنجاب سے دور دراز کا سفر طے کر کے صرف ریاض عثمانی سے ملنے یہاں پہنچا ہوں۔"

میرے انکشافات نے راجہ کو حیران کیا، تاہم وہ اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "تمہاری آمد کی وجہ جان سکتا ہوں؟"

"نہیں، یہ میں نہیں بتا سکتا۔ ہاں یہ یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں یا تمہارے ساتھیوں کو میری وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ تم عثمانی کو میرے حوالے کر دو میں خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

"لیکن اگر عثمانی نے تمہارے ساتھ نہ جانا چاہا۔"

"یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے وہ میرے ساتھ جائے گا۔ اگر نہیں جائے گا تو میں اس سے زبردستی نہیں کروں گا۔"

دفعتاً کمرے میں رکھی ہوئی ایک بڑی الماری کے پیچھے سے نکل کر ایک شخص میرے سامنے آ گیا۔ وہ قمیص اور پاجامے میں تھا۔ عمر قریباً 35 برس، سر کے بال لمبے، ڈاڑھی الجھی ہوئی، آنکھوں پر عینک تھی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ یہی ریاض عثمانی تھا۔ ہوشیار پور میں اس کی بیوی کلثوم نے مجھے اس کی کئی تصویریں دکھائی تھیں۔ وہ بہت بدل چکا تھا لیکن پھر بھی اپنی آنکھوں، ٹھوڑی اور ناک سے پہچانا جا رہا تھا۔ عثمانی کی ایک تصویر میں ساتھ لے کر آیا تھا اور اس وقت بھی میرے لباس میں موجود تھی۔ عثمانی کو راجہ کے گھر میں دیکھ کر مجھ پر حیرت کا

شدید حملہ ہوا لیکن زیادہ حملہ اس وقت ہوا جب عثمانی نے مجھ سے بات کی۔ کہنے لگا۔ "اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو تم انسپکٹر نواز خان ہو؟"

"لیکن...... تمہیں...... کیسے معلوم ہوا؟"

"کلثوم کے خطوں سے۔ اس نے قریباً آٹھ مہینے قبل پہلی بار تمہارا ذکر کیا تھا۔ وہ تمہاری بہت مشکور تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بڑے مشکل حالات میں تم بڑے خلوص کے ساتھ اس کی مدد کر رہے ہو۔ اس کے بعد بھی اس نے اپنے کئی خطوں میں تمہارے حسنِ سلوک کا ذکر کیا ہے۔"

راجہ نے کہا۔ "آپ دونوں بیٹھ جائیں اور بڑی تسلی تشفی کے ساتھ بات کریں۔"

میں حیرت زدہ سا بیٹھ گیا۔ میرے اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا عثمانی کے ساتھ اتنی آسانی سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ میرے اندازے کے مطابق ریاض عثمانی کو (اگر وہ زندہ تھا) تو کسی بہت محفوظ مقام پر رکھا گیا تھا اور وہ راجہ کے سخت پہرے میں تھا...... لیکن یہاں وہ اس گھر میں گھر کے فرد کی طرح بیٹھا تھا اور خوش و خرم نظر آ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کب سے دیوار گیر الماری کے پیچھے موجود تھا اور ہماری باتیں سن رہا تھا۔ یہ چکر کچھ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

عثمانی بڑے دھیان سے میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔ "کہتے ہیں انسان میں پانچ حسوں کے علاوہ ایک حس ہوتی ہے، اسے عام زبان میں چھٹی حس کہتے ہیں۔ میں اسے انسان کے اندر کی آواز کہتا ہوں۔ یہ آواز کبھی کبھی تاریک راتوں کے سناٹے میں ابھرتی تھی اور مجھے یقین دلاتی تھی کہ کوئی نہ کوئی...... میرا اپنا...... میرے پیچھے اس دور دراز جزیرے تک ضرور پہنچے گا...... پھر جب میری بیوی کے خطوں میں تمہارا ذکر آنا شروع ہوا تو دل کے کسی کونے کھدرے میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں تم ہی تو وہ شخص نہیں جو میرے لئے یہ دور دراز کا کٹھن اور طویل سفر طے کرو گے۔"

میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہارے لئے سفر تو طے کیا ہے لیکن اتنا طویل اور کٹھن بھی نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ میں اپنے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں ہوشیار پور سے کلکتہ آیا تھا۔ کلکتہ پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ انڈیمان یہاں سے بہت دور نہیں ہے اور اگر کوشش کی جائے تو جہاز رانوں کو کچھ دے دلا کر وہاں پہنچا جا سکتا ہے۔"

یکایک ریاض عثمانی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دونوں ہاتھ میری طرف پھیلا دیئے۔ میں اس سے بغل گیر ہو گیا۔ وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔ یوں محسوس

ہوا کہ پچھلے پانچ برس میں جتنے دکھ اس کے سینے میں جمع ہوئے تھے وہ سارے آنسو بن کر میرے شانے کو بھگونے لگے ہیں۔ میں اس کا عزیز رشتے دار نہیں تھا، نہ ہی یار دوست تھا، نہ اس کے گلی محلے سے تعلق رکھتا تھا پھر بھی وہ مجھ سے یوں مل رہا تھا جیسے اپنے سگے بھائی سے مل رہا ہو۔ اس کے لئے یہی بات بڑی اہم تھی کہ میں اس شہر کی گلیوں سے آیا تھا جو اس کی جنم بھومی تھا۔

بہت دیر وہ مجھ سے لپٹا رہا، پھر اشک بار آنکھوں سے میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کی گردن پر دو تین ماہ پرانا ایک زخم نظر آ رہا تھا۔ راجہ نے کہا۔ ''تم دونوں بیٹھو اور باتیں کرو میں تمہارے لئے قہوے کا انتظام کرواتا ہوں۔''

ہم دونوں کو چھوڑ کر وہ باہر نکل گیا۔ عثمانی کی نم آنکھوں میں اور لرزاں ہونٹوں پر بے شمار سوالات مچل رہے تھے۔ وہ ایک لمحے میں سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔ گھر کے حالات، خاندان کی باتیں، گلیوں محلوں کا موسم، وطن کے حالات اور پھر یہ کہ میں یہاں کیسے پہنچا، کس مقصد کے تحت پہنچا اور کب؟ وہ سب کچھ ایک ہی سوال میں سمیٹ کر مجھ سے پوچھ لینا چاہتا تھا۔ دوسری طرف میرے پاس بھی اس سے پوچھنے کے لئے کئی سوالات تھے۔ ان میں اہم ترین سوال یہ تھا کہ وہ جیل کی اونچی دیواروں سے نکل کر وارڈ بوائے کشن کمار کے اس بوسیدہ کوارٹر تک کیسے پہنچا؟ اور راجہ سے اس کا کیا تعلق ہے؟

جب میرا یہ سوال آواز بن کر میرے ہونٹوں تک آیا تو عثمانی نے ایک طویل سانس لی اور کہنے لگا۔ ''میرا خیال ہے کہ بات آگے بڑھانے سے پہلے تمہیں تمہارے اس سوال کا جواب مل ہی جانا چاہئے...... بات یہ ہے انسپکٹر نواز! کہ میں جیل کی کال کوٹھڑی سے یہاں تک پہنچنے میں صرف اور صرف راجہ کا مرہونِ منت ہوں۔''

''لیکن...... میرے علم میں تو یہ بات آئی تھی کہ راجہ نے تمہیں کھانے میں زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''وہ زہر نہیں تھا، زہریلی جڑی بوٹی تھی۔ وہ اس جزیرے میں عام پائی جاتی ہے۔ مقامی زبان میں اسے شنگرف کہتے ہیں۔ بہرحال یہ کام کرنے والا راجہ ہی تھا لیکن اس نے ایسا مجھے نقصان پہنچانے کے لئے نہیں، میری بھلائی کے لئے کیا تھا۔ وہ مجھے جیل سے نکالنے کا تہیہ کر چکا تھا لیکن جیل میں انتظامات اتنے سخت تھے کہ کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی تھی۔ راجہ نے مجھے جیل سے ہسپتال پہنچانے کا پروگرام بنایا۔ میرے کھانے میں اسی مقصد کے لئے شنگرف نامی بوٹی ملائی تھی لیکن مقدار اتنی تھی کہ میری جان کو خطرہ نہیں تھا۔ زہریلے کھانے

سے میں بیمار ہو گیا اور جیلر نے میری حالت دیکھ کر مجھے ہسپتال پہنچانے کی ہدایت کی۔ ہسپتال سے فرار کرانا مشکل تو تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ راجہ کے ساتھی وارڈ بوائے کشن کمار نے لوہا کاٹنے والی ایک چھوٹی سی آری مجھے فراہم کر دی تھی۔ میں اس آری کی مدد سے رات کے وقت اپنی زنجیر کاٹنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ آخر زنجیر اس حد تک کمزور ہو گئی کہ میں معمولی کوشش سے اسے توڑ سکتا تھا۔ راجہ کسی مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ ایک طوفانی شب کو وارڈ بوائے کشن کمار نے مجھے وارڈ سے نکالا اور ایک غسل خانے کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے گزار کر باہر پورچ میں لے آیا۔ یہاں راجہ ایک اسکوٹر لئے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے اپنے عقب میں بٹھایا اور چند مرحلوں سے گزار کر ناڈو کالونی لے آیا۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن جیل میں راجہ کے ساتھ تو تمہارے تعلقات اتنے اچھے نہیں تھے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم دونوں میں مار پٹائی بھی ہوئی تھی۔ تمہارے دو دانت ٹوٹ گئے تھے اور تمہاری گردن پر زخم بھی شاید اسی واقعے کی یادگار ہے؟''

وہ بولا۔ ''نہیں یہ گردن کا زخم اتنا پرانا نہیں ہے۔ یہ ایک اور چکر ہے...... بہرحال تمہاری یہ بات درست ہے کہ کچھ عرصہ پہلے جیل میں راجہ سے میرا جھگڑا ہوا تھا لیکن اس وقت راجہ کو یہ علم نہیں تھا کہ میں کون ہوں اور کس جرم کی پاداش میں کالا پانی پہنچا ہوں۔ جب اپنے ایک ساتھی کی زبانی اسے میری کہانی معلوم ہوئی تو اس کا رویہ یکسر بدل گیا۔ اس نے نہ صرف مجھ سے اپنی زیادتی کی معافی مانگی بلکہ یہ ارادہ بھی ظاہر کیا کہ وہ مجھے اس جیل سے نکالنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال تھا یہ کام ایسا مشکل نہیں ہے۔''

''لیکن وہ کیوں نکالنا چاہتا تھا تمہیں؟'' میں نے عثمانی سے سوال کیا۔

''اس لئے کہ وہ مجھے کالے پانی سے نکال کر واپس ہندوستان بھیجنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مجھے واپس جا کر اپنے پر لگائے جانے والے الزامات کو غلط ثابت کرنا چاہئے اور اصل مجرم کے چہرے سے نقاب نوچنا چاہئے۔''

''یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس مشترکہ قبر کا کھوج لگا کر جس میں اس حرامی افسر مسٹر راک نے آٹھ بے گناہ دیہاتیوں کو مار کر گاڑ دیا تھا۔'' عثمانی نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''عثمانی! کیا تم سمجھتے ہو کہ اس قبر کو ڈھونڈنا تمہارے لئے ممکن ہے؟''

''بالکل ممکن ہے۔'' عثمانی نے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''وہ کوئی لق و دق صحرا نہیں ہے کہ

جہاں سمتوں کا ہی پتہ نہیں چل سکے۔ ایک مختصر سا جنگل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مجھے صرف دو ہفتے کا وقت دیا جائے تو میں اس قبر کو کھوج سکتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ اس جزیرے سے راہِ فرار اختیار کی جا سکتی ہے؟"

"اس سوال کا ٹھیک جواب تو راجہ ہی دے سکتا ہے۔" عثمانی نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ "اب تک تم ہی پوچھ رہے ہو، کیا میں بھی کوئی بات پوچھ سکتا ہوں؟"

"ضرور پوچھو۔" میں نے کہا۔

"سب سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ تم یہاں کس مقصد سے آئے ہو؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "اس سوال کا مختصر ترین جواب یہ ہے کہ میرا مقصد وہی ہے جو تمہارے بقول راجہ کا ہے۔ میں یہی نیت لے کر یہاں آیا ہوں کہ تم سے اس واردات کے بارے میں پوچھوں جس کا اصل اور بڑا مجرم مسٹر راک ہے اور اگر ہو سکے تو تمہیں اس جزیرے سے نکال کر آزاد فضاؤں میں لے جاؤں۔

اس سے پہلے کہ عثمانی جواب میں کچھ کہتا، دروازہ کھلا اور راجہ اندر آ گیا۔ اس کی ایک انگلی حسبِ معمول نوکدار مونچھوں پر گردش کر رہی تھی لیکن اب اس کی یہ ادا مجھے زیادہ بری نہیں لگی۔ سچ کہتے ہیں کہ کسی کی ظاہری شکل وصورت سے اس کے کردار اور مزاج کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ راجہ پہلی نظر میں مجھے کوئی اچھا شخص نہیں لگا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے دیکھنے سے پہلے ہی میں اس کے متعلق بہت زیادہ بدگمان ہو چکا تھا۔ بعد میں پے در پے جو حالات سامنے آئے ان سے بھی یہی پتہ چلا کہ راجہ ہر مرحلے میں عثمانی سے دشمنی مول لیتا رہا ہے لیکن اب عثمانی سے ملنے کے بعد تصویر کا ایک بالکل دوسرا رخ سامنے آیا تھا۔ پتہ چلا تھا کہ عثمانی کے سلسلے میں میرے اور راجہ کے خیالات بالکل ایک جیسے ہیں۔ راجہ بھی انگریز سرکار کا زخم خوردہ تھا اور اپنے وطن سے سینکڑوں میل دور ایک اجنبی جزیرے میں آباد ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ اس شخص کا دکھ سمجھ سکتا تھا جسے ناکردہ گناہ کی سزا میں ہمیشہ کے لئے بیوی بچوں سے دور کر دیا گیا تھا۔

اس گرجتی برستی رات میں اس کمرے کے اندر راجہ، عثمانی اور میرے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ ساتھ ساتھ قہوے کا دور چلتا رہا۔ میں نے عثمانی کو اس کے گھر اور بیوی بچوں کے حالات سے آگاہ کیا۔ میری زبانی آصف خان کی ریشہ دوانیوں کا سن کر عثمانی کا خون کھول گیا۔ تاہم میں نے وہ واقعہ چھپا لیا جس کا ذکر عثمانی کو لہو کے آنسو بہانے پر مجبور کر سکتا تھا۔ میرا مطلب کم سن حمیدہ پر آصف خان کے ہاتھوں گزرنے والی قیامت سے ہے۔

گفتگو کے دوران میں نے راجہ کو کریدنا چاہا کہ وہ عثمانی کو جزیرے سے نکالنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کرے گا۔ مگر وہ اس سوال کو گول کر گیا۔ شاید وہ اتنی جلدی مجھ پر اس حد تک اعتماد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بہرحال اس بات کا اندازہ مجھے ہو گیا کہ اس کے ذہن میں کوئی خاص منصوبہ موجود ہے اور وہ جلد ہی اس منصوبے پر عمل کرنے والا ہے۔

☆======☆======☆

مجھے اس جزیرے پر اترے ہوئے چار روز ہو چکے تھے۔ ہماری موٹر بوٹ کو پروگرام کے مطابق صرف چھ روز یہاں رکنا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر دو روز مزید گزر گئے تو بوٹ میرے بغیر ہی واپس چلی جائے گی۔ اس کے بعد میری واپسی کیسے ہو گی۔ یہ ایک بے حد تشویش ناک سوال تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جس طرح بھی ہو سکے بوٹ کے مالک عبداللہ نصیری سے رابطہ کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے میں خود تو عبداللہ کے پاس جا نہیں سکتا تھا۔ مقامی پولیس میری تلاش میں تھی اور میرے محسن انسپکٹر سنت سنگھ نے بتایا تھا کہ عبداللہ کی نگرانی کی جا رہی ہے۔

سوچ بچار کے بعد میں نے انسپکٹر سنت سنگھ سے ہی کہا کہ وہ عبداللہ سے رابطہ کر کے تازہ ترین حالات معلوم کرے۔ سنت سنگھ نے حامی بھر لی۔ وہ اس روز عبداللہ سے ملا اور میرے لئے ایک خوشخبری لے آیا۔ عبداللہ نصیری نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے مجھ پر آنے والی مصیبت کافی حد تک ٹال دی تھی۔ وہ انگریز افسروں سے ملا تھا اور انہیں باور کرایا تھا کہ حیات خان کے بارے میں انہیں غلط اطلاعات دی گئی ہیں اور وہ فی الواقع ایک ملازم پیشہ شخص ہے۔ عبداللہ نصیری نے اپنا ایک آدمی بھی انسپکٹر سنت سنگھ کے ساتھ بھیجا تھا۔ یہ شخص بوٹ پر فورمین تھا اور ہم سب اس کے ماتحت کام کرتے رہے تھے۔ فورمین نے مجھے بتایا۔

"میڈم کوشیلا سے عبداللہ نصیری کے تعلقات بگڑ گئے ہیں۔ عبداللہ نصیری کو اس بات کا پتہ چل گیا ہے کہ جزیرے کی پولیس کو تمہارے پیچھے لگانے والی کوشیلا ہی ہے۔ اسے اس بات پر بے حد غصہ ہے کہ کوشیلا نے پولیس کے مخبر کا کردار ادا کیا ہے۔ چند روز پہلے اس نے کوشیلا کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا ہے۔"

فورمین نے یہ بھی بتایا کہ بوٹ کی روانگی کا پروگرام بدل گیا ہے اب وہ پانچ کی بجائے بارہ تاریخ کو جزیرے سے روانہ ہو گی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے ساتھ چلوں اور ایک بار پولیس کے سامنے پیش ہو جاؤں۔

قدرتی طور پر میرے دل میں یہ بات آئی کہ کہیں یہ کوئی چال نہ ہو۔ میں نے انسپکٹر

سنت سنگھ سے مشورہ کیا۔ انسپکٹر نے کہا۔ ''بظاہر تو کوئی چال نظر نہیں آتی۔ بہر حال تمہیں جو بھی کرنا ہے اپنی ذمے داری پر کرنا ہے۔ تم نے کچھ وقت عبداللہ نصیری کے ساتھ گزارا ہے اور اسے مجھ سے بہتر جانتے ہو۔''

سوچ بچار کے بعد میں نے فورمین کے ساتھ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ہم شام قریباً آٹھ بجے کھاڑی پر پہنچے۔ عبداللہ سے اس کے کوارٹر میں ہی ملاقات ہوئی۔ یہاں سب اچھا تھا۔ عبداللہ خندہ پیشانی سے ملا۔ آدھ پون گھنٹے کے اندر اندر میرے بیشتر خدشات دور ہو گئے۔ عبداللہ کے ساتھ اگلا دن میں نے کافی مصروف گزارا۔ ہم پہلے ایک اعلیٰ انگریز افسر کے پاس گئے پھر مقامی پولیس سٹیشن میں پیش ہوئے۔ اسٹیشن کے انچارج نے ہمیں ایک فوجی اہلکار کے ساتھ کچھ کاغذات بنوانے کے لئے روانہ کر دیا۔ بہر حال یہ ایک طویل کارروائی تھی جس کا ذکر یہاں بے محل ہے۔ قریباً 48 گھنٹے کی بھاگ دوڑ کے بعد ہم اس چکر سے نکل سکے اور عبداللہ مجھے اپنے ساتھ لے کر واپس کھاڑی والے مکان میں آیا۔ یہاں بوٹ کا سارا عملہ موجود تھا اور میری مشکل آسان ہونے پر خوش نظر آتا تھا۔ اگر بوٹ کے ساتھیوں میں سے کوئی موجود نہیں تھا تو وہ کوشیلا تھی جو عبداللہ نصیری سے گالم گلوچ کے بعد اس ٹھکانے کو چھوڑ چکی تھی۔

اگلے روز رات کو میں راجہ سے ملنے ناڈو کالونی جا رہا تھا کہ ایک آواز سن کر چونک گیا۔ یہ راجہ کے خستہ حال اسکوٹر کی آواز تھی۔ اسکوٹر میرے سامنے تاریک گلی میں داخل ہوا اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ ناڈو کالونی کی وہی گلی تھی جس میں چار روز پہلے نرس شمیم سے میری ملاقات ہوئی تھی اور میں نے اس کے کوارٹر میں بیٹھ کر اس کی دردناک کہانی سنی تھی۔ میں نے سوچا، ہو نہ ہو راجہ اسی نرس سے ملنے جا رہا ہے۔ نرس شمیم سے راجہ کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ یہ ایک اہم سوال تھا اور اس سوال کی کشش مجھے کھینچ کر اس گلی میں لے گئی۔ رات کے نو بج چکے تھے، گلی سنسان نظر آ رہی تھی۔ میں نے سوڈیڑھ سو قدم کا فاصلہ طے کیا اور میرا اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ راجہ کا اسکوٹر نرس شمیم اور دایہ جانکی کور کے گھر کے عین سامنے کھڑا تھا۔

میں معمول کی رفتار سے چلتا ہوا دروازے کے سامنے سے گزر گیا۔ دروازہ ادھ کھلا تھا اور برآمدے میں روشنی ہو رہی تھی۔ نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں واپس مڑا اور ادھ کھلے دروازے سے گزر کر نرس شمیم کے گھر میں داخل ہو گیا۔ اگر مجھے دیکھ لیا جاتا تو بھی کوئی زیادہ پریشانی کی بات نہیں تھی۔ میں کہہ سکتا تھا کہ اہلِ خانہ سے ملنے کے لئے آیا ہوں لیکن مجھے دیکھا نہیں گیا اور میں اطمینان سے چلتا اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا جہاں دایہ جانکی کور اور شمیم راجہ کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ ساتھ والے کمرے میں دوسری نرس گہری نیند

سو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کوارٹر میں ایسا کوئی شخص موجود نہیں تھا جو مجھے دیکھ سکتا۔ میں دروازے کے پاس ہی تاریکی میں کھڑا ہو گیا اور اندر ہونے والی گفتگو سننے لگا۔

جانکی بلند آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''پتر! اگر تیرے من میں اس کے لئے تھوڑی بہت بھی محبت ہے تو پھر اس سے بیاہ کر لے۔ دیر مت کر۔ میں تو کہتی ہوں کل ہی نکاح پڑھوا کر اسے گھر لے جا۔''

''لیکن خالہ! اتنی جلدی کیسے ہو سکتا ہے۔'' راجہ کی آواز آئی۔

''تجھے پتہ ہے، میں قیدی ہوں۔ مجھے پہلے جیل کے دفتر سے اجازت نامہ لینا ہوگا۔ پھر میری پہلی بیوی بھی ہے۔ معلوم نہیں، وہ کیا کہے گی......''

''تو بس پھر سوچتا رہ۔'' جانکی بھڑک کر بولی۔ ''وہ حرام زادہ اس کو اٹھا کر لے جائے گا اور مار کر لاش کہیں پھینک دے گا۔ کل وہ پھر آیا تھا۔ ساری رات اس نے گزاری ہے یہاں..... دیکھ کیا حال کر دیا ہے اس نے بچی کا۔''

شمیم سسکیوں سے رونے لگی۔ راجہ اسے دلاسا دیتے ہوئے بولا۔ ''تم کیوں روتی ہو۔ میں آ گیا ہوں ناں یہاں۔ دیکھ لوں گا آج اس سور ما کو۔ حرامی کی وردی اتار کر کفن نہ پہنا دیا تو راجہ نام نہیں۔''

اگلے تین چار منٹ میں کمرے کے اندر جو گفتگو ہوئی اس نے صورتِ حال بہت حد تک واضح کر دی۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے عثمانی کیس کے سلسلے میں نرس شمیم اور ایک دوسری نرس کو پکڑ لیا گیا تھا اور پولیس والوں نے انہیں سخت تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ اس سلسلے میں ایک انسپکٹر اور سب انسپکٹر کا خاص طور پر نام لیا جا رہا تھا۔ اب صورتِ حال یہ ہوئی تھی کہ سب انسپکٹر جگدیش نے ابھی تک شمیم کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ تین چار بار رات کے اندھیرے میں اس کوارٹر میں آ چکا تھا۔ کبھی ڈرا دھمکا کر اور کبھی پیار محبت سے وہ اپنا کام نکال لیتا تھا..... آج بھی اس کے آنے کا امکان موجود تھا اور شمیم نے راجہ کو اطلاع دے کر یہاں بلا لیا تھا۔ (راجہ اور شمیم کا تعلق زیادہ پرانا نہیں تھا۔ یہ تعلق شمیم کے ساتھ ہونے والی پے در پے زیادتیوں کے بعد قائم ہوا تھا۔ عثمانی کو ہسپتال سے فرار کرانے والا راجہ خود تھا لہٰذا وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر اور دونوں نرسیں بے قصور ہیں اور انہیں خواہ مخواہ تھانے کچہری میں گھسیٹا جا رہا ہے)

ابھی کمرے میں ہونے والی گفتگو جاری تھی کہ باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ ایک خوف و ہراس سا فضا میں سرایت کرتا محسوس ہوا۔ ''تم یہیں رکو، میں دیکھتا ہوں۔'' کمرے سے راجہ سے آواز ابھری۔

پھر کوئی بھاری قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے خود کو تاریکی میں سمیٹ لیا۔ دروازہ کھلا اور راجہ لمبے ڈگ بھرتا باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار تھا۔ تاریکی کے سبب میں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ چند لمحے بعد باہر سے بولنے کی آوازیں آئیں۔ پھر ایک چنگھاڑتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”پیچھے ہٹ جا۔“

یہ راجہ کی آواز نہیں تھی۔ ایکا ایکی محسوس ہوا کہ دروازے کے اندر یا باہر دھما چوکڑی ہو رہی ہے۔ کوئی بُری طرح کراہا پھر دھڑام سے پختہ فرش پر گرا۔ میں نے اپنا ریوالور نکالا اور بھاگتا ہوا صحن میں آیا۔ یہاں تاروں کی چھاؤں میں ایک سنسنی خیز منظر نظر آیا۔ ایک دراز قد شخص جس نے پتلون قمیص پہن رکھی تھی صحن میں چت پڑا تھا۔ اس کے سینے میں ایک بڑا چاقو دستے تک گھسا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی راجہ گھٹنوں کے بل گرا ہوا تھا۔ اس نے اپنا پیٹ دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑکھڑا کر پہلو کے بل گر گیا۔ میں نے لپک کر اسے سنبھالا۔ اس کا بایاں پہلو خون سے بھیگتا چلا جا رہا تھا۔ اس دوران جانکی باہر آئی اور اس نے صحن کی بتی روشن کر دی۔ میں نے دیکھا راجہ کے پاؤں میں ایک خون آلود سریا پڑا تھا۔ یہی سریا اس کے پہلو میں گھونپا گیا تھا۔ ظاہر ہے گھونپنے والا وہی شخص تھا جو اب چت پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں موت کے خوف اور اذیت کے باعث باہر نکلی ہوئی تھیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آخری ہچکی لی اور بے سدھ ہو گیا۔

راجہ کراہ رہا تھا اور ایک پہلو پر جھکتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر شمیم بلند آواز سے رونے لگی۔ میں نے اسے ڈانٹ کر چپ کرایا اور جانکی سے کہا کہ وہ گھر کا دروازہ اندر سے بند کر دے۔ جانکی نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے دونوں عورتوں کے ساتھ مل کر زخمی راجہ کو اٹھایا اور کمرے میں لے آیا۔ کمرے کی روشنی میں میں نے اچھی طرح اس کا زخم دیکھا اور زخم دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ راجہ صرف چند گھڑیوں کا مہمان ہے۔ اس کا زخم جان لیوا تھا۔ نوک دار سریا قریباً ریڑھ کی ہڈی تک چلا گیا تھا۔ خون اس کے زخم سے فوارے کی مانند چھوٹ رہا تھا۔

راجہ کو بھی جیسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے کاری زخم لگ گیا ہے۔ جب میں نے اسے کہا کہ میں اسے ہسپتال لے جانے کے لئے سواری لے کر آتا ہوں تو اس نے بے اختیار میرا بازو تھام لیا۔ نحیف آواز میں بولا۔ ”رہنے دے یار! میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں اب بچوں گا نہیں۔“

میں نے اپنا رومال اس کے زخم پر رکھا اور شمیم کا دوپٹہ کس کر باندھ دیا۔ ہم اس کا خون روکنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جتنی کوششیں کر رہے تھے خون اتنا ہی زیادہ خارج ہو رہا تھا۔ بے حد سنگین صورتِ حال تھی۔ اسی چار دیواری میں ایک شخص کی لاش پڑی تھی اور دوسرا جاں بلب تھا۔ مرنے والا پولیس کا آدمی تھا اور یہی اس واقعے کا سب سے خطرناک پہلو تھا۔ میرے علم میں یہ بات آئی تھی کہ جزیرے میں سرکاری آدمی پر حملہ نہایت سنگین جرم تصور ہوتا ہے اور سرکاری آدمی کے قتل کی سزا صرف اور صرف موت ہے۔

راجہ نے اشارے سے شمیم، جانکی اور دوسری نرس کو کمرے سے باہر نکلنے کی ہدایت کی وہ باہر چلی گئیں تو اس نے مجھے اپنے بالکل قریب بٹھا لیا اور کراہتی ہوئی آواز میں رک رک کر بولا۔ ”انسپکٹر! میں تمہیں جو بتا رہا ہوں...... بہت غور سے سنو...... مجھے لگ رہا ہے کہ میرے پاس اتنی مہلت نہیں کہ کوئی بات دہرا سکوں..... اگر تم...... عثمانی کی مدد کرو...... تو وہ یہاں سے نکل سکتا ہے بس تمہارے معمولی سے سہارے کی ضرورت ہے...... باقی سارا کام میں انجام دے چکا ہوں۔“

اس تمہید کے بعد راجہ نے اپنی ڈوبتی ابھرتی آواز میں جو تفصیل بتائی وہ اس طرح تھی۔ ٹھیک تین روز بعد جزیرہ بدو سے ایک قیدی رہا ہو کر واپس ہندوستان جا رہا تھا۔ اس کا نام اسمٰعیل تھا اور اسے اٹھارہ برس کی سزا ہوئی تھی۔ اس کا تعلق مسلمانوں کی ایک مذہبی تنظیم سے تھا اور اس پر الزام تھا کہ اس نے انگریز حکمرانوں کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کی ہیں۔ ابھی اس کی سزا پوری ہونے میں ایک سال باقی تھا، تاہم انگریز حکومت نے جزائر انڈیمان کے لئے کچھ نئے قوانین ترتیب دیئے تھے اور ان قوانین کی رُو سے اسمٰعیل کی رہائی عمل میں آ گئی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ قیدی اب یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے یہاں ایک مقامی عورت سے شادی کر لی تھی۔ اس کے دو بچے تھے۔ مکان تھا اور اس کے ساتھ چھوٹا سا کاروبار بھی اس نے کر رکھا تھا۔ دوسری طرف ہندوستان میں اس کی پہلی بیوی اور بچے ایک وباء کی لپیٹ میں آ کر راہیِ عدم ہو چکے تھے۔ اس کا کوئی قریبی عزیز بھی ہندوستان میں موجود نہیں تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہاں اس کی زبردست دشمنی تھی۔ ایک جنونی ہندو فرقے کے لوگ اس کی جان لینے کی قسمیں کھائے بیٹھے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ جو تھوڑی بہت زندگی رہ گئی ہے وہ جزیرے میں ہی کٹ جائے۔ راجہ کو کسی طرح اس قیدی کی عجیب و غریب خواہش کا علم ہو گیا تھا۔ اس نے اسمٰعیل نامی اس قیدی سے رابطہ کیا تھا اور عثمانی کی رہائی کا ایک زبردست منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اس منصوبے کے تحت عثمانی کو اسمٰعیل کے

شناختی کاغذات پر جزیرہ بدو سے باہر جانا تھا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اسمٰعیل اور عثمانی کی عمر، قد کاٹھ اور خدوخال میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ عثمانی نے اسمٰعیل ہی کی طرح مونچھیں اور داڑھی چھوڑ دی تھی۔ بالوں کی سفیدی میں سیاہی بھرنے کے لئے وہ خضاب لگا لیتا تھا۔ بے شک شناختی کاغذات پر تصویر موجود تھی لیکن جب تک تصویر کو بہت غور سے نہ دیکھا جاتا کسی قسم کا شک کرنا مشکل تھا۔ شناختی نشان کا حل بھی راجہ نے بڑی خوش اسلوبی سے حل کر دیا تھا۔ اسمٰعیل کی گردن پر تیز دھار آلے کا ایک پرانا نشان تھا۔ شناختی کاغذات پر اسی نشان کا ذکر تھا۔ راجہ نے عثمانی کی گردن پر ایک ایسے ہی نشان کا انتظام کر دیا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے عثمانی کی گردن پر ایک چند ماہ پرانا زخم تھا۔ میں نے عثمانی سے اس بارے میں پوچھا بھی تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ زخم راجہ سے ہونے والے جھگڑے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ کوئی اور چکر ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ زخم اس شناختی نشان کی کمی پوری کرنے کے لئے عثمانی کی گردن پر لگایا گیا تھا۔ اس زخم کا اب صرف نشان رہ گیا تھا اور جب تک بہت غور نہ کیا جاتا اندازہ لگانا مشکل تھا کہ زخم کتنا پرانا ہے۔

اب تمام انتظامات مکمل تھے۔ مجھے صرف یہ کرنا تھا کہ اسمٰعیل کے شناختی کاغذات اور اس کی رہائی کا پروانہ عثمانی تک پہنچانا تھا اور پھر عثمانی کو ساتھ لے کر جیل سپرنٹنڈنٹ کے آفس جانا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں ایک شخص راجہ کا قریبی دوست تھا۔ اس نے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ ضابطے کی تمام کارروائی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں مکمل کروا دے گا۔ اس کے بعد آخری مرحلہ رہ جانا تھا اور یہ مرحلہ عثمانی نے خود طے کرنا تھا۔ یعنی پورٹ پر پہنچنا اور وہاں سے کلکتہ جانے والے جہاز پر سوار ہونا۔

اس رات دو تین بجے راجہ نے دم توڑ دیا...... اب مکان میں دو لاشیں تھیں۔ ایک سب انسپکٹر جگدیش کی، دوسری راجہ کی۔ ان دونوں لاشوں کے سبب نرس شمیم اور اس کی دونوں ساتھی عورتیں سخت مصیبت میں گرفتار ہو سکتی تھیں۔ خاص طور پر سب انسپکٹر جگدیش کی لاش تو انہیں سیدھا سیدھا پھانسی کے تختے پر پہنچا سکتی تھی۔ ضروری تھا کہ ان دونوں لاشوں کو موقعہ سے ہٹا دیا جائے۔ یہ لاشیں کسی ویران مقام پر پڑی پائی جاتیں تو پولیس کی سردردی بھی ختم ہو جاتی۔ فوری طور پر یہ تسلیم کر لیا جاتا کہ راجہ اور جگدیش میں چونکہ عداوت تھی لہٰذا دونوں میں دو بدو لڑائی ہوئی اور کاری زخم لگنے کے سبب دونوں ہلاک ہو گئے...... خس کم جہاں پاک۔

اب تک میں وارداتوں کا سراغ ہی لگاتا رہا تھا لیکن جزیرہ بدو کی اس کالونی میں مجھے

ایک واردات کا سراغ مٹانا پڑ رہا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط اور عرق ریزی سے موقعے کی تمام شہادتیں ختم کیں اور یکے بعد دیگرے دونوں لاشوں کو کوارٹر سے کافی فاصلے پر ایک اُجاڑ احاطے میں پھینک آیا۔ اس کام میں تاریکی میری بہت مددگار ثابت ہوئی۔ لاشیں اٹھانے اور لے جانے کے دوران میرا لباس خون آلود ہو گیا تھا۔ میں نے یہ لباس باورچی خانے میں جا کر جلا دیا اور راکھ نالی میں بہا دی۔ جانکی بڑی ہوشیار عورت تھی۔ اس نے کسی طرح میرے لئے ایک دھوتی کُرتے کا انتظام کر دیا تھا۔ صحن کے فرش سے سارا خون بھی دھو ڈالا گیا۔ آلہ قتل دو تھے یعنی خنجر اور سریا۔ یہ دونوں چیزیں میں ایک کپڑے سے پکڑ کر لاشوں کے قریب ہی پھینک آیا تھا۔ اپنے پیشہ وارانہ تجربے کی روشنی میں ایک آدھ گھنٹے کے اندر میں نے موقعۂ واردات سے ہر کھوج کھرا مٹا کر رکھ دیا۔ نرس شمیم اور دایہ جانکی کو میں نے اچھی طرح سمجھا بجھا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اگر خدانخواستہ پولیس ان تک پہنچے تو انہیں کیا بیانات دینے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ان عورتوں نے میری ہدایات پر عمل کیا تو تفتیش سے بچ نکلیں گی۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ریاض عثمانی سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ نرس شمیم کے کوارٹر میں کیا سانحہ پیش آیا ہے۔ عثمانی حیرت زدہ رہ گیا۔ ایک دم ہی اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی تھی۔ غالباً اسے اپنے منصوبے کی تباہی کا یقین ہو گیا تھا...... بہرطور اگلے چوبیس گھنٹے میں مَیں نے اس کے تمام خدشات غلط ثابت کر دیئے۔ میں نہ صرف اسمٰعیل سے ملا اور اس سے شناختی کاغذات لے آیا بلکہ بھاگ دوڑ کر کے عثمانی کے دیگر دفتری کام بھی کروا دیئے۔ اس سلسلے میں انسپکٹر سنت سنگھ نے ہماری بے حد مدد کی۔ وہ اس سارے منصوبے سے پوری طرح آگاہ ہو چکا تھا اور میری امداد پر کمربستہ تھا۔

آخر وہ سنسنی خیز صبح طلوع ہو گئی جب ریاض عثمانی کو اسمٰعیل کے کاغذات پر جزیرہ بدو سے کلکتہ روانہ ہونا تھا۔ ٹھیک 36 گھنٹے بعد مجھے بھی بدو سے روانہ ہو جانا تھا۔ میں عثمانی کو لے کر پورٹ کی طرف روانہ ہوا۔ تین چار افراد اور بھی ہمارے ساتھ تھے۔ یہ راجہ کے قریبی ساتھی تھے۔ انہیں ساتھ لانا ضروری تھا۔ ایک قیدی اٹھارہ سال بعد رہا ہو کر جاتا ہے تو اسے الوداع کہنے کے لئے کافی لوگ موجود ہوتے ہیں اور یہی ظاہر کرنے کے لئے ہم انہیں ساتھ لائے تھے۔ کاغذات کے مطابق عثمانی کا نام اسمٰعیل تھا اور وہ جزیرے میں موجود اپنی بیوی کو طلاق دے چکا تھا۔ یہاں موجود اس کا مکان بیوی کے نام ہو گیا تھا اور کاروبار اس نے اپنے ایک قریبی دوست کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ یہ ساری تفصیلات عثمانی بہت اچھی طرح رٹ چکا تھا اور امید تھی کہ وہ کہیں غلطی نہیں کرے گا..... لیکن بندرگاہ پر چیکنگ اور پوچھ گچھ سے

پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس کی ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی۔ ہم بندرگاہ کی طرف پیدل ہی روانہ ہوئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس روز چھٹی تھی اور سڑک پر کوئی سواری نظر نہیں آ رہی تھی۔ عثمانی کا سامان ایک ہتھ گاڑی پر تھا۔ یہ ہتھ گاڑی کافی بڑی تھی اور اسے دو بنگالی مزدور کھینچ رہے تھے۔ ایک مزدور کافی بوڑھا تھا اور اس کی پیشانی پر مقامی رواج کے مطابق اس کا نام اور نمبر وغیرہ کندہ تھا۔ مزدور کے ساتھ ساتھ انسپکٹر سنت سنگھ چل رہا تھا۔ ہماری مختصر ٹولی میں انسپکٹر سنت سنگھ بھی شامل تھا۔ تاہم وہ سادہ لباس میں تھا اور مقامی رواج کے مطابق اس نے اپنا چہرہ ایک ٹوپی نما پگڑی کے پلو میں چھپا رکھا تھا۔ ہتھ گاڑی کے سامان میں چند صندوق تھے جن میں کپڑے تھے اور کچھ تحائف قسم کی چیزیں تھیں۔ اس کے علاوہ دو بڑی بڑی بوریاں تھیں ان میں جزیرہ بدو میں پایا جانے والا ایک خاص قسم کا پھل ''مارجی'' تھا۔ خشک مارجی کو طاعون کے لئے اکسیر سمجھا جاتا تھا اور خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں میں اس کی کافی قیمت ملتی تھی۔ ابھی ہم بندرگاہ سے چار پانچ فرلانگ دور ہی تھے کہ ایک جیپ بے حد تیز رفتاری کے ساتھ ہمارے قریب سے گزری۔ یہ فوجی جیپ تھی اور اس میں ایک عورت بھی بیٹھی تھی۔ ہمیں اوور ٹیک کرنے کے بعد جیپ کے بریک چرچرائے اور وہ دھیمی رفتار سے چلتی ہمارے سامنے آ رکی۔ جیپ میں ایک انگریز کیپٹن اس لڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا جسے میں عبداللہ نصیری کی محبوبہ کے طور پر جانتا تھا اور جو اس جزیرے میں مجھے نقصان پہنچانے کی زبردست کوشش کر چکی تھی۔ میری مراد کوشیلا سے ہے۔ وہ گہرے سرخ اسکرٹ میں تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا۔ چشمہ اتار کر اس نے بڑی نفرت سے مجھے گھورا اور بولی۔

''کہاں جا رہے ہو نوسرباز؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی میں بدو میں 36 گھنٹے رہ سکتا ہوں اور جہاں چاہے جا سکتا ہوں۔''

اچانک انگریز کیپٹن غرایا۔ ''میم صاحب جو پوچھتا ہے اس کا ٹھیک جواب دو۔ ورنہ ہم مکہ مار کر تمہارا بھیجہ ہلا دیں گا۔''

اس موقع پر میرا کسی سے الجھنا مناسب نہیں تھا اور یہ شخص تو پھر ایک با اختیار عہدے دار تھا۔ میں نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا دوست اسمٰعیل ہے۔ آج اس کی رہائی کا دن ہے۔ ہم اسے کھاڑی پر چھوڑنے جا رہے ہیں......''

عین اس وقت جب میں یہ الفاظ کہہ رہا تھا میں نے محسوس کیا کہ کوشیلا بے حد غور سے عثمانی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ جیپ سے چھلانگ لگا کر اُتری اور ہمارے بالکل قریب پہنچ گئی۔ اس کی نگاہیں عثمانی کے چہرے پر جمی تھیں۔ میرے بدن میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ کوئی

سنگین گڑبڑ ہونے والی تھی۔ دفعتاً کوشیلا غرائی۔ ''کیپٹن ڈیوس! یہ شخص وہ نہیں ہے جو یہ نوسرباز بتا رہا ہے۔ میں...... میں اس کی تصویر دیکھ چکی ہوں۔ اسی شخص کے پاس ہے۔ میں نے کشتی میں ایک رات اس کے لباس کی تلاشی لی تھی۔ اس وقت یہ سویا ہوا تھا۔'' کوشیلا نے شہادت کی انگلی سے سیدھا میری جانب اشارہ کیا۔

''تو...... پھر کون ہے...... یہ؟'' کیپٹن نے انگریزی میں پوچھا۔ اس کی نگاہ عثمانی پر مرکوز تھی۔ کوشیلا کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ہیجانی انداز میں بولی۔ ''مجھے یقین ہے...... مجھے یقین ہے ڈیوس! یہ وہی شخص ہے جس کے چکر میں یہ دھوکے باز یہاں آیا ہوا ہے۔''

یہ بڑے فیصلہ کن لمحات تھے۔ میں نے کیپٹن کے تاثرات دیکھے اور مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا ہاتھ اپنے ریوالور کی طرف بڑھنے والا ہے۔ ایک ساعت کی تاخیر ہمیں کہیں سے کہیں پہنچا سکتی تھی۔ میں نے انسپکٹر سنت سنگھ کو اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنا ریوالور نکال کر کیپٹن کے پہلو سے لگا دیا۔ یہ دھچکا کیپٹن کے لئے بے حد سخت تھا۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا اور اپنے ہولسٹر کی طرف بڑھتا ہوا اس کا ہاتھ بھی ٹھٹک گیا۔ دوسری طرف سنت سنگھ نے بھی اپنا پسٹل کوشیلا کی کمر سے لگا دیا تھا۔ وہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ اردگرد موجود راہ گیروں میں سے کوئی بھی اس واقعے کا نوٹس نہ لے سکا۔ حتیٰ کہ وہ دو بنگالی مزدور بھی جو عثمانی کے سامان والی ہتھ گاڑی کھینچ رہے تھے لاعلم رہے۔

''چلو کیپٹن اپنی جیپ میں۔'' میں نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔

اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر چپ چاپ جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ اسے جیپ کی طرف بڑھتے دیکھ کر کوشیلا نے بھی قدم اٹھانے میں ہی خیریت سمجھی۔ ہم دونوں ان دونوں ''پریمیوں'' کو جیپ میں لے آئے۔ وہ جیپ میں بیٹھ چکے تو میں نے راجہ کے ساتھیوں سے کہا کہ وہ سامان لے کر کھاڑی پر پہنچیں ہم ابھی آ رہے ہیں۔

ڈرائیونگ سیٹ سنت سنگھ نے سنبھال لی تھی۔ اس نے جیپ کو طوفانی رفتار سے چلایا اور چند ہی منٹ میں اُڑا کر کہیں سے کہیں لے گیا۔ ایک بار پھر اس نے جیپ عین اسی پارک کے سامنے روکی جہاں چند روز پہلے اس نے اپنی کار روکی تھی اور پہلی بار مجھ سے بات چیت کی تھی۔ جونہی جیپ رکی میں نے آنکھوں آنکھوں میں اس سے پوچھا کہ اب کیا کرنا ہے۔ میرے اس سوال کا جواب اس نے ایک زوردار ضرب سے دیا۔ یہ ضرب اس نے اپنے

پستول سے کیپٹن کے سر پر لگائی تھی۔ بڑی جچی تلی اور بے حد ماہرانہ ضرب تھی۔ یوں لگتا تھا کہ سنت سنگھ نے اس کام کی خاص تربیت لی ہوئی ہے۔ انگریز کیپٹن پہلو کے بل نشست پر لڑھک گیا۔ کوشیلا یہ منظر دیکھ کر چیخی لیکن اس کی یہ چیخ حلق میں ہی گھٹ گئی۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پانچ منٹ کے اندر اندر ہم نے کیپٹن اور کوشیلا کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کے منہ میں کپڑے گھسیڑ دیئے اور انہیں جیپ کی نشستوں کے نیچے لڑھکا دیا۔ ممکن ہے وہاں سے گزرتے ایک دو افراد نے ہمیں جیپ میں کچھ کرتے دیکھا بھی ہو لیکن کسی نے بھی خاص طور سے غور نہیں کیا۔ ہم دونوں جیپ سے اُتر آئے۔ انسپکٹر سنت سنگھ نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ دبی آواز میں بولا۔ ''جاؤ دوست! واہگرو تمہاری رکھشا کرے۔''

میں نے کہا۔ ''اور تم؟''

وہ بولا۔ ''بس، اب تمہارا اور میرا راستہ جدا ہوتا ہے۔ میں ان دونوں حرامیوں کو (یعنی کیپٹن اور کوشیلا کو) کسی ایسی جگہ رکھنا چاہتا ہوں کہ جب تک تم اور عثمانی ہندوستان نہ پہنچ جاؤ یہ سورج کی روشنی بھی نہ دیکھ سکیں۔''

میں سنت سنگھ کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ کیپٹن اور کوشیلا کی آزادی کا مطلب ہماری فوری گرفتاری ہی تھا۔ میں نے کہا۔ ''سنت سنگھ! تم نے مجھ پر بہت احسانات کئے ہیں لیکن یہ آخری احسان کچھ زیادہ ہی بھاری ہے۔''

وہ بولا۔ ''کوئی بھاری نہیں۔ ایسے شہدوں سے نمٹنا میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے کوشیلا سے کچھ سادے کاغذات پر دستخط کروائے تھے۔ بس انہی کاغذوں سے میں اسے اور اس کے یار کیپٹن کو اس طرح جکڑوں گا کہ چیخیں مار مار کر روئیں گے۔ تُو بالکل فکر نہ کر یار...... بس اب اِدھر سے کوئی سواری پکڑ اور جلدی سے پورٹ کی طرف نکل جا۔ ہوسکتا ہے وہاں عثمانی کو تیری مدد کی ضرورت ہو۔''

اس نے مجھ پر الوداعی نگاہ ڈال کر رب راکھا کہا اور زبردستی سڑک کی طرف دھکیل دیا۔ میں نے کہا۔ ''تم جاؤ...... میں چلا جاتا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''نہیں تم مہمان ہو۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ تم جاؤ، میں یہاں کھڑا ہوں۔''

بڑا ضدی اور جذباتی قسم کا شخص تھا۔ وہ اینگلو انڈین کم لگتا تھا اور سکھ زیادہ۔ میں نے بحث میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اسے خدا حافظ کہہ کر سڑک کی طرف بڑھ گیا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد میں پورٹ پر پہنچ سکا۔ راستے میں کوئی سواری نہیں ملی تھی لہٰذا پیدل ہی جانا پڑا۔ پورٹ پر ایک خوشخبری میری منتظر تھی۔ ریاض عثمانی کاغذات کی جانچ پڑتال کے مرحلے سے بخیریت گزر کر جہاز پر سوار ہوگیا تھا۔

اگلے روز صبح دس بجے میں بھی موٹر بوٹ جھانسی پر سوار ہو رہا تھا۔ موٹر بوٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہی میں نے ایک نگاہ جزیرہ بدو پر ڈالی۔ ناریل، کیلے اور پام کے بلند و بالا درختوں میں گھرا ہوا یہ جزیرہ دور سے کس قدر پُرسکون اور خاموش نظر آ رہا تھا لیکن اس کے گلی کوچوں میں بے شمار چیخیں گونج رہی تھیں، اَن گنت ہنگامے پرورش پا رہے تھے اور اس کی فضاؤں میں ان ہزار ہا قیدیوں کی روحیں بھٹک رہی تھیں جو ایک روز راجہ کی طرح قید ہو کر اس بندی خانے میں آئے تھے اور پھر وطن واپس لوٹنے کی خواہش دل میں لئے کسی قبرستان یا شمشان گھاٹ میں جا سوئے تھے۔

☆======☆======☆

میرے کلکتہ پہنچنے سے دو روز پہلے عثمانی کلکتہ پہنچ چکا تھا۔ کلکتہ سے ہم دونوں ایک ساتھ ہوشیار پور کے لئے روانہ ہوئے۔ ایک طویل اور کٹھن سفر کے بعد ہم بذریعہ دہلی پہنچے اور دہلی سے بس کے ذریعے ہوشیار پور روانہ ہوئے۔ وہ میری زندگی کے ناقابلِ فراموش لمحات تھے جب اگست کی اس ٹھٹھرتی ہوئی دوپہر کو میں نے ریاض عثمانی کو اپنے گھر کے دروازے پر دستک دیتے دیکھا۔ کچھ دیر بعد اس کی بچی حمیدہ نے دروازہ کھولا۔ وہ اب نو سال کی تھی۔ جب اس کا باپ اسے چھوڑ کر گیا تھا تو اس کی عمر صرف چار سال تھی۔ وہ بھلا اسے کیسے پہچانتی۔ اتنے میں اس کی ماں کلثوم بھی دروازے پر آگئی۔ اس نے پہلی نگاہ مجھ پر ڈالی پھر اپنے شوہر کو غور سے دیکھا۔ ایک دم اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کے ہونٹ لرزے۔ ''ہائے اللہ۔'' اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ پھر یکایک اسے چکر سا آگیا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا وہ بے ہوش ہوچکی تھی۔

کچھ دیر بعد ہم اسے بمشکل ہوش میں لائے۔ میاں بیوی کا یہ ملاپ قابلِ دید تھا۔ چند لمحے کے لئے وہ بھرے پُرے کمرے میں ''تنہا'' ہو کر ایک دوسرے کی بانہوں میں کھو گئے۔ وہ باتیں جو گھنٹوں اور پہروں میں نہیں ہوسکتی تھیں آنسوؤں نے لمحوں میں کہہ ڈالیں۔ بچے بھی باپ سے بری طرح لپٹے ہوئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ تین ہفتے جو عثمانی کو انڈیمان سے نکالنے میں صرف کئے ہیں اس تمام جدوجہد پر بھاری ہیں جو میں اب تک قانون کی بالادستی کے لئے کرتا رہا ہوں۔

ہوشیار پور میں میرے اور عثمانی کے بال بچوں کے سوا کسی کو خبر نہیں تھی کہ عثمانی کالا پانی سے رہا ہو کر واپس آ گیا ہے اور اب میرے ساتھ امرتسر کے نواحی علاقے میں اس مقام کی تلاش میں ہے جہاں پانچ برس پہلے ایک اندھیری رات کو انگریز افسر مسٹر اینڈرسن راک نے بے گناہ انسانوں کا خون بہایا تھا...... بلکہ ابھی تک میرے افسروں کو بھی یہ بات معلوم نہیں ہوئی تھی کہ میں اپنی چھٹی مختصر کر کے واپس ہوشیار پور پہنچ چکا ہوں۔ اگر ہم آصف خان اور مسٹر راک سے ٹکر لئے بغیر خاموشی سے وہ اجتماعی قبر تلاش کر لیتے تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی تھی۔

میں نے اپنے تعلقات استعمال کر کے تین پرائیویٹ جیپیں حاصل کیں اور اپنے چند نہایت قابل اعتماد ساتھیوں کو تلاش کے کام میں شامل کر لیا۔ ان میں بلال شاہ اور اے ایس آئی فرزند علی بھی شامل تھا۔ قریباً دو ہفتے تک ہم نے ریاض عثمانی کے ساتھ مل کر دن رات اس ویرانے کی خاک چھانی۔ نہ ہمیں کھانے پینے کا ہوش تھا نہ آرام کا۔ اس دوران ایک موقعے پر ہماری ایک پولیس پارٹی سے بھی مڈبھیڑ ہو گئی۔ تاہم ہم کسی نہ کسی طرح ان سپاہیوں اور کانسٹیبلوں کو جُل دینے میں کامیاب ہو گئے۔ دو ہفتے بعد جب ہم تھک ہار کر گہری مایوسی کا شکار ہونے والے تھے اچانک ایک آوارہ گرد شخص نے ہمیں اس قبر کا سراغ دے دیا۔ وہ خود کو سنیاسی کہتا تھا اور جڑی بوٹیوں کی تلاش میں اس علاقے میں گھومتا رہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ پچھلی بارشوں میں نوح ندی (ایک مقامی نالہ) کے پاس ایک جگہ سے کچھ انسانی ہڈیاں اور پنجر وغیرہ ملے تھے۔ اب وہاں مقامی دیہاتیوں نے چھوٹی سی خانقاہ بنا دی ہے اور دیئے وغیرہ جلاتے ہیں۔

ہم اس نوجوان سنیاسی کو لے کر خانقاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی ہم خانقاہ سے قریباً ایک میل دور ہی تھے کہ ریاض عثمانی چلا اٹھا۔ ''یہی ہے وہ جگہ...... یہی ہے۔'' وہ ہم سب کو چھوڑ کر دیوانہ وار ایک سمت میں بھاگنے لگا۔ مجبوراً ہمیں بھی اس کے پیچھے بھاگنا پڑا۔ آٹھ دس منٹ بعد اندھا دھند بھاگنے کے بعد وہ اس ویران مقام پر پہنچ گیا جہاں درختوں پر دو تین بوسیدہ جھنڈے لہرا رہے تھے اور ایک چھوٹی سی کچی چار دیواری نظر آ رہی تھی۔ ہم مشترکہ قبر تک پہنچ چکے تھے۔

اگلے چند روز میں بہت تیزی کے ساتھ کئی اہم واقعات رُونما ہوئے۔ سب سے پہلے مشترکہ قبر کی کھدائی ہوئی اور وہاں سے چند سلامت اور چند ٹوٹے پھوٹے انسانی ڈھانچے برآمد ہوئے۔ ان کی کل تعداد آٹھ تھی۔ یہ کھدائی اعلیٰ افسروں کی موجودگی میں کی گئی تھی۔ اس

کارروائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مسٹر راک سمیت دس افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ سب لوگ کسی نہ کسی طرح مسٹر راک کے ساتھ جرائم میں شریک رہے تھے۔ ان میں ایک نوعمر لڑکی کی زندگی خراب کرنے والا درندہ صفت آصف خان بھی شامل تھا۔

اجتماعی قبر والا کیس دوبارہ کھل گیا۔ گرد آلود فائلوں پر سے گرد جھاڑ کر انہیں اعلیٰ افسروں کی میزوں پر سجا دیا گیا۔ مسٹر راک کے قریبی ساتھیوں میں سے ہی رام داس نامی ایک انسپکٹر سلطانی گواہ بن گیا۔ اس نے مشترکہ قبر کی ساری کہانی کھول کر عدالت کے سامنے رکھ دی۔ اس نے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ ہے۔

''قریباً پانچ برس پہلے قتل کئے جانے والے ان دیہاتیوں کا تعلق صوبہ اُتر پردیش کے ایک دور دراز علاقے نواب گنج سے تھا۔ وہاں دو برادریوں میں دیرینہ دشمنی چلی آ رہی تھی۔ ایک برادری کا سربراہ بابو ہری بہادر انگریز ڈپٹی کمشنر کا خاص پٹھو تھا۔ اس نے اپنی دشمن برادری کے ہتھ چھٹ اور اتھرے افراد کو پولیس مقابلے میں ختم کرانے کا پروگرام بنایا۔ یہ منصوبہ کسی طرح وقت سے پہلے فاش ہو گیا اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ کن کن افراد کو قتل کئے جانے کی سازش تھی۔ یہ کل بارہ افراد تھے۔ ان میں سے آٹھ افراد نے فوری طور پر نواب گنج چھوڑنے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ بذریعہ ٹرین نواب گنج سے بھاگ نکلے۔ پولیس ان کی تلاش میں تھی۔ ہر جگہ ان کا کھوج لگایا جا رہا تھا۔ قریبی شہروں اور علاقوں کے تمام پولیس ہیڈ کوارٹرز میں اطلاع پہنچائی جا چکی تھی...... آخر چوتھے پانچویں روز جان بچا کر بھاگنے والے دیہاتی نواب گنج سے سینکڑوں میل دور ضلع ہوشیار پور کی حدود میں پکڑے گئے۔ اتفاق یہ ہوا کہ ہوشیار پور کا سب سے بااختیار اور دبنگ افسر مسٹر راک اینڈرسن اس ڈپٹی کمشنر کا سگا بھائی نکلا جس نے دیہاتیوں کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا اور اب موت کی طرح ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بہت خاص ذریعے سے یہ پیغام بھجوایا کہ ان آٹھوں افراد کو ہمیشہ کے لئے ''لاپتہ'' کر دیا جائے یعنی مار دیا جائے۔ چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کے احکامات پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ سرما کی اس تاریک شب میں آٹھوں بدنصیب افراد کو گاڑی میں سوار کر کے اس ویران و سنسان جنگل میں لایا گیا اور شوٹ کر کے ایک ہی گڑھے میں دبا دیا گیا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اس وقت سماچار اخبار کا چیف رپورٹر ریاض عثمانی شراب کی بھٹیوں کے چکر میں وہاں موجود تھا، اس نے اس منظر کو اپنی آنکھوں میں اور اپنے کیمرے میں محفوظ کر لیا ورنہ بے شمار دوسرے جرائم کی طرح یہ جرم بھی ہمیشہ کے لئے دفن ہو گیا ہوتا اور یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آتی کہ جو لوگ دسمبر کی ایک رات کو نواب

گنج کے ایک گاؤں سے روپوش ہوئے تھے۔ان کی قبر امرتسر کے قریب نوح ندی کے کنارے گھنے درختوں میں ہے۔

مسٹر راک اور اس کے ساتھیوں پر بے حد مضبوط اور جان لیوا کیس بن چکا تھا۔اب مسئلہ یہ تھا کہ ریاض عثمانی کا کیا کیا جائے۔وہ کالا پانی سے بھاگ کر آیا تھا اور آیا بھی ایک دوسرے قیدی کے کاغذات پر تھا۔میرے ایس پی صاحب کے خیال میں اب وقت آگیا تھا کہ ریاض عثمانی قانون کے سامنے پیش ہو جاتا اور ساری بات کھول کر بیان کر دیتا۔چند دیگر افسران اور وکیلوں سے مشورے کے بعد ہم نے ریاض عثمانی کو عدالت میں پیش کر دیا۔ریاض عثمانی نے عدالت میں اعتراف کر لیا کہ وہ ایک نامعلوم جہاز راں کی مدد سے کالا پانی سے فرار ہوا۔اس نے جیوری کو جو کہانی سنائی اس میں اسمٰعیل کا یا میرا کوئی ذکر نہیں تھا۔کالے پانی سے فرار ایک ایسا جرم تھا جس نے انگریز حکام کو ہلا کر رکھ دیا۔کئی ہفتے اس واقعے پر تبصرے ہوتے رہے۔بہت دور تک اور بہت دیر تک اس خبر کی گونج سنی گئی۔یقیناً کالے پانی سے راہِ فرار اختیار کرنے کی سزا بہت سخت ہوتی لیکن انصاف کرنے والوں کو ریاض عثمانی کے خلاف نرم ترین رویہ اختیار کرنا پڑا۔مشترکہ قبر کا کھوج دے کر اس نے اپنے فرار کا ٹھوس جواز پیش کر دیا تھا۔اسے مختلف دفعات کے تحت صرف ایک برس قید محض کی سزا ہوئی۔مسٹر راک کو قیدی کی حیثیت سے انگلستان روانہ کر دیا گیا۔وہاں اس کے ساتھ کتنی بھی رعایت کی جاتی انگریزی قانون کے تحت اسے عمر قید کی سزا ہونا تو یقینی تھا۔اس کہانی کے ایک اہم کردار اور کمسن حمیدہ بی بی کے مجرم آصف خان کو تعزیراتِ ہند کی دفعات 325, 377 اور 307 کے تحت عمر قید کی سزا سنائی گئی۔

☆======☆======☆

خون کا بدلہ خون

قبائلیوں کے اصول ”خون کا بدلہ خون“ کے گرد گھومتی ہوئی ایک سنسنی خیز کہانی۔

ایک معصوم انسان کی کہانی جو موت کے آگے بھاگ رہا تھا، سب رشتے ساتھ چھوڑ گئے تھے، موت اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھی کہ......

وہ عورت برقعے میں تھی۔ یہ برقعہ بھی عجیب طرح کا تھا۔ ٹوپی والا نسواری رنگ کا برقعہ تھا۔ دور ہی سے نظر آتا تھا کہ اس کا کپڑا ریشمی ہے۔ ایسے برقعے عورتیں عموماً صوبہ سرحد میں پہنتی ہیں۔ برقعے والی بڑی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ چال ڈھال سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نوجوان ہے اور بہت گھبرائی ہوئی ہے۔ برآمدے میں کھڑے سنتری نے اسے روک کر کچھ پوچھنا چاہا لیکن وہ رکے بغیر آگے بڑھ آئی۔ ایک لمحے کے لیے گردن اٹھا کر اس نے مختلف دروازوں پر لگی ہوئی تختیاں دیکھیں۔ پھر سیدھی اس دروازے کی طرف آئی جس پر "ایس ایچ او" لکھا ہوا تھا۔ یہ میرے ہی کمرے کا دروازہ تھا۔ لڑکی کے انداز سے ظاہر ہو گیا کہ وہ پڑھی لکھی ہے۔

کمرے کے دروازے پر رک کر وہ ذرا ہچکچائی۔ پھر اندر آئی اور لرزتی کانپتی سی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"فرمایئے۔ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"ام آپ سے مدد لینے آیا ہے جی۔ ام بڑا مصیبت میں ہے۔ آپ کو خدا اور رسول کا واسطہ امارا امداد کریں۔" وہ پشتو آمیز اُردو میں بولی۔ اس کا لہجہ بہت کھنک دار تھا۔

"میں سن رہا ہوں بی بی۔ جو بات ہے کھل کر بتاؤ۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ایک دم وہ رونے لگی۔ نسواری رنگ کے برقعے میں جیسے ایک زلزلہ آ گیا۔ وہ اپنی آواز دبانے کی کوشش کر رہی تھی اور جتنی کوشش کر رہی تھی آواز اتنی ہی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "انسپکٹر صاحب۔ ام کو ایک بات بتائیں۔ کیا پولیس میں اتنا طاقت نہیں ہے کہ وہ ایک شخص کا زندگی بچا سکے۔ کیا کسی میں اتنا انمت (ہمت) نہیں کہ ایک مجبور شخص کو مارنے والوں سے چھڑا سکے؟ کیا یہ ملک یہاں کا اکومت یہاں کا بڑا بڑا افسر لوگ سب بے بس ہے؟

بھرے پُرے شہر میں کوئی ایسا نہیں..... کوئی ایسا نہیں جو قاتلوں کا آتھ روک سکے؟"

بڑا خوفناک سوال کیا تھا اس برقعہ پوش عورت نے۔ ایک لمحے کے لیے میں سناٹے میں رہ گیا۔ میں نے کہا۔ "بی بی! میں یہاں اس لیے بیٹھا ہوں کہ اپنے علاقے میں کوئی غیر قانونی کام نہ ہونے دوں۔ تم کھل کر بتاؤ کہ کیا مسئلہ ہے؟ کس شخص کو جان کا خطرہ ہے اور کس طرف سے ہے؟"

وہ بولی۔ "اگر ام بتا دے تو کیا آپ اس کو بچا لے گا؟"

میں نے کہا۔ "بچانے والی اللہ کی ذات ہے بی بی۔ ہمارا کام کوشش کرنا ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں تم سے کہ میں پوری کوشش کروں گا۔"

وہ بولی۔ "ایسا وعدہ پہلے بھی ایک تھانیدار نے کیا تھا۔ پھر اس نے دس روز تک اپنا صورت نہیں دکھایا تھا۔ چھٹی لے کر چلا گیا تھا وہ۔"

"بی بی! میں کسی دوسرے کا ذمے دار نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ کیس میرے علاقے کا ہے اور واقعی کوئی غیر قانونی کام ہو رہا ہے تو میں یہ کام ضرور روکوں گا، لیکن تم پہیلیاں نہ بجھواؤ تو بہتر ہے۔ ابھی تک تم نے اپنا نام پتہ بتایا ہے اور نہ ٹھکانہ...... تم پنجابی تو نہیں لگتی ہو۔ آخر کہاں سے آئی ہو تم؟"

وہ کچھ دیر برقعے کی جالی کی اوٹ سے میرا جائزہ لیتی رہی۔ پھر ایک خوبصورت ہاتھ برقعے کی سلوٹوں میں سے برآمد ہوا اور اس نے برقعے کو سامنے سے اٹھا کر سر پر رکھ لیا۔ وہ ایک خوبصورت پٹھان لڑکی تھی۔ رنگ سفید، آنکھیں بادامی، صورت سے اندازہ ہوتا تھا کہ تھوڑا بہت پڑھی لکھی بھی ہے۔ اس نے "ایس ایچ او" کے نام کی تختی پڑھ لی تھی تو ظاہر ہے آٹھ دس جماعتیں تو پڑھی ہی ہوں گی۔ اس نے اپنا چہرہ پورا نہیں کھولا تھا۔ نصف چہرہ اب بھی برقعے میں تھا۔ میں نے دیکھا رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ وہ عجیب سی آواز میں بولی "ام لوگ پارہ چنار سے آیا ہے۔ امارا والد اور شوہر بھی ساتھ ہے۔ ان کو کچھ پتہ نہیں کہ ام تھانے میں آیا ہوا ہے۔ وہ تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔ ام اپنے شوہر سے پانچ منٹ کا کہہ کر آیا ہے۔ اگر دیر ہوا تو وہ امارے پیچھے آئے گا۔ ام کو ڈھونڈتا پھرے گا۔ ام کل کسی وقت آپ کے پاس آئے گا اور سب کچھ آپ کو بتا دے گا....." وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ "انسپکٹر صاحب! آپ کو آپ کے بال بچے کا واسطہ ام پر رحم کرو۔ ام بہت بڑا مشکل میں ہے۔"

اتفاقاً اس وقت "چمبا" سے ایس پی صاحب تھانے کے معائنے پر آ گئے۔ ان کی جیپ تھانے کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس پٹھان دوشیزہ سے کہا

"دیکھو بی بی! جانا نہیں۔ میں نے تمہارے لیے چائے منگوائی ہے۔ یہیں بیٹھو۔ میں ابھی دومنٹ میں واپس آتا ہوں۔"

ایس پی صاحب سے بات کرنے میں مجھے پانچ دس منٹ لگ گئے۔ امید نہیں تھی کہ لڑکی اب تک میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں واپس آیا تو یہ اندازہ درست نکلا۔ وہ جا چکی تھی۔

اس نے کہا تھا کہ اگلے روز آئے گی۔ نہیں آئی، اس سے اگلے روز بھی نہیں آئی۔ میں سوچنے لگا، پتہ نہیں کون تھی۔ دماغ بھی صحیح تھا یا نہیں۔ بعض لوگ بغیر وجہ کے کسی انہ جانے خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ کوئی انہیں یا ان کے کسی پیارے کو جان سے مار ڈالے گا۔ خاص کر مائیں اپنے بچوں کے بارے میں ایسے وہم کا شکار ہو جاتی ہیں۔ میں نے سوچا شاید یہ بھی کوئی اسی طرح کا کیس تھا۔ اگر لڑکی کا رونا دھونا سچ تھا تو پھر اسے فوراً سے پہلے اپنا مسئلہ بتانا چاہیے تھا لیکن وہ پانچ دس منٹ تک گفتگو کرنے کے باوجود اصل موضوع پر نہیں آئی تھی۔

جب وہ دوسرے روز بھی تھانے نہیں آئی تو ایک دم میرے ذہن سے اس کا خیال نکل گیا۔ یہ کوئی ایک مسئلہ تو نہیں تھا۔ درجنوں مسائل تھے جنہیں توجہ کی ضرورت تھی۔ اسی طرح پانچ چھ روز گزر گئے۔

یہ واقعہ جو میں بیان کر رہا ہوں گورداسپور کے ایک نواحی تھانے کا ہے۔ یہ شہر کا کم آباد علاقہ تھا۔ زیادہ تر آبادی سکھوں کی تھی۔ سوڈیڑھ سو گھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے بھی ہوں گے۔ بلال شاہ ان دنوں میرے ساتھ ہی تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ ایک دن وہ اور میں صحن کی دھوپ میں بیٹھے تھے کہ سرکاری ہسپتال سے ٹیلیفون آ گیا۔ رات پچھلے پہر ایک مریض کو اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں داخل کرایا گیا۔ اس کے سینے میں پستول کی گولی لگی تھی۔ گولی نکال دی گئی تھی لیکن مضروب ابھی تک بے ہوش تھا۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے حسب دستور پولیس کو اطلاع دے دی تھی تاکہ ہم مضروب کا بیان لے سکیں۔

فوری طور پر جانا ضروری نہیں تھا کیونکہ مریض ابھی تک بے ہوش تھا۔ ویسے بھی میرا اے ایس آئی ایک تفتیش پر گیا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دس گیارہ بجے تک آ جائے گا اور میں اسے بھیج دوں گا لیکن جب وہ بارہ بجے بھی نہیں آیا تو مجھے خود جانا پڑا۔

میں اسپتال کے نگہداشت وارڈ میں پہنچا تو مریض کو خون اور گلوکوز لگا ہوا تھا۔ وہ پینتالیس پچاس برس کا ایک فربہ شخص تھا۔ خوب گورا چٹا تھا۔ اس کے قریب ایک لڑکی کھڑی تھی۔ غالباً ڈاکٹر کی نظر بچا کر اندر آ گئی تھی۔ اس نے ٹاسے کی ایک لمبی سی چادر اوڑھ رکھی

تھی۔ میری چاپ سن کر وہ جلدی سے گھومی۔ میں اس کی صورت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ وہی نسواری برقعے والی تھی جس سے تھانے میں ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک دم گھبرا گئی اور چادر میں منہ چھپا کر باہر نکل گئی۔

میں نے زخمی کو غور سے دیکھا اور مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بھی پٹھان ہے۔ گولی اس کے بائیں کندھے کے قریب لگی تھی۔ زخم زیادہ سنگین نظر نہیں آتا تھا۔ مریض کی حالت ایسی تھی کہ اس سے بیان لیا جا سکتا تھا۔ لڑکی نے بتایا تھا کہ اس کا والد اور شوہر بھی اس کے ساتھ ہیں۔ میرے سامنے لیٹا ہوا شخص بڑی عمر کا تھا، لہٰذا اس کا والد ہی ہو سکتا تھا۔

ہیڈ کانسٹیبل نے کاغذ قلم سنبھال لیا اور میں نے زخمی سے سوال جواب شروع کیے۔ وہ پہلے تو کراہتا اور ہائے ہائے کرتا رہا لیکن جب میں نے زور دے کر کہا کہ اسے بیان دینا ہی پڑے گا تو اسے مجبوراً زبان کھولنی پڑی۔ اس نے اپنا نام ابراہیم خان بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ روزگار کی تلاش میں یہاں آیا ہوا ہے۔ اس نے اپنا جو ایڈریس لکھوایا اس سے پتہ چلا کہ وہ کرشن کالونی کے پوسٹ آفس کے باہر 18 نمبر مکان میں رہتا ہے۔

اپنی بیٹی کی طرح وہ بھی ٹوٹی پھوٹی اردو بولتا تھا۔ میرے مختلف سوالوں کے جواب دیتے ہوئے اس نے بتایا کہ پارہ چنار کے ایک قریبی گاؤں میں اس کی تین چار ایکڑ زمین تھی لیکن پانی نہ ملنے کی وجہ سے فصل اچھی نہیں ہوتی تھی۔ ویسے بھی اب وہ زمین کڑوی ہوتی جا رہی تھی۔ اس لیے اس نے وہ زمین بیچ ڈالی۔ اس کی سب سے چھوٹی بیٹی اور داماد بھی پارہ چنار چھوڑنے کا ارادہ رکھتے تھے لہٰذا وہ ان دونوں کو بھی ساتھ لے آیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یہاں کوئی مناسب سا کاروبار کر لے گا۔ ممکن ہے لکڑی کا ٹال ہی کھول لے۔ اس کا داماد کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹا سکتا تھا۔ گورداسپور میں وہ دو تین دفعہ پہلے بھی آ چکا تھا اور یہ اس کا دیکھا بھالا شہر تھا لہٰذا اس نے گورداسپور میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی صرف ایک مہینہ پہلے انہوں نے کرشن کالونی والا مکان کرائے پر لیا تھا اور اب کاروبار کا سوچ رہے تھے۔

ابراہیم خان نے اپنے پشتو آمیز لہجے میں بتایا۔ "چند دن سے میں اور میرا داماد گل حسن پراپرٹی کا کام کرنے والوں سے مل رہے تھے۔ شاید اسی سے کسی نے اندازہ لگا لیا کہ ہمارے پاس پیسہ ہے۔ کل رات کوئی چور اُچکا گھر میں گھس آیا۔ اس نے میرے سر پر پستول تان کر مجھ سے صندوق کی چابیاں مانگیں۔ میں نے انکار کیا۔ وہ مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا۔ اسی دوران گولی چل گئی۔ میں زخم کھا کر اپنی چارپائی پر گر گیا۔ وہ جس کھڑکی میں سے آیا تھا اسی سے کود کر بھاگ گیا۔"

میں چند روز پہلے ابراہیم خان کی بیٹی سے نہ ملا ہوتا تو بھی میرے لیے اس بیان پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنا ممکن نہیں تھا اور اب تو میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس بیان میں سچ برائے نام ہی ہے۔ ابراہیم اصل بات چھپا رہا تھا۔ اسے کسی چور اُچکے کے ہاتھوں گولی نہیں لگی تھی۔ اسے کسی اور شخص نے نشانہ بنایا تھا اور عین ممکن تھا کہ جان سے مارنے کے لیے نشانہ بنایا ہو۔ یہ کوئی بہت گہرا چکر تھا۔ میرے کانوں میں ابراہیم کی روتی بلکتی بیٹی کے الفاظ گونجنے لگے۔ ''کیا پولیس میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ ایک شخص کی زندگی بچا سکے۔ کیا کسی میں اتنا اقت نہیں کہ ایک مجبور شخص کو مارنے والوں سے چھڑا سکے.....''

آخر اس روز لڑکی نے کس کا ذکر کیا تھا؟ عین ممکن تھا کہ وہ اس کا باپ ہی ہو۔ لڑکی کے خوف کے عین مطابق قاتل نے ابراہیم کی جان لینے کی کوشش کی ہو۔ اس معاملے پر لڑکی ہی روشنی ڈال سکتی تھی (ویسے بھی مریض سے پوچھ گچھ کر کے اس کو تنگ کرنا مناسب نہیں تھا) میں ابراہیم کو اس کے حال پر چھوڑ کر وارڈ سے باہر آ گیا۔ یہاں بینچوں پر اور فرش پر کپڑے بچھا کر اکا دکا افراد بیٹھے تھے لیکن وہ لڑکی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے دوسرے چہروں پر غور کیا۔ ان میں سے کوئی بھی پٹھان نظر نہیں آیا۔ مجھے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں لڑکی پھر ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو تو وہیں ابراہیم خان کے پہرے پر چھوڑا اور خود جیپ پر سوار ہو کر کرشن کالونی پہنچ گیا۔ مکان کا پورا ایڈریس میری جیب میں موجود تھا اور مجھے امید تھی کہ لڑکی اسپتال سے سیدھی اپنے گھر ہی آئی ہو گی۔

لیکن جب میں ابراہیم کے بتائے ایڈریس پر پہنچا تو تمام اندازے غلط ثابت ہوئے۔ ابراہیم خان کے پڑوسیوں سے پتہ چلا کہ رات والے واقعے کے بعد سے ابراہیم کے گھر کو تالا لگا ہوا ہے۔ نہ اس کی بیٹی نظر آئی ہے اور نہ داماد۔ میں نے پڑوسیوں سے پوچھ گچھ کی اس سے پتہ چلا کہ ابراہیم خان نے قریباً ایک مہینہ پہلے یہ مکان کرائے پر لیا تھا۔ ابراہیم کا داماد گل حسن اونچا لمبا خوبرو نوجوان تھا لیکن معلوم نہیں کیا بات تھی وہ زیادہ وقت گھر ہی میں رہتا تھا۔ خود ابراہیم بھی گھر سے زیادہ نہیں نکلتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ یہاں کوئی کاروبار کرنا چاہتا ہے۔ پراپرٹی ڈیلروں سے مل کر زمین وغیرہ بھی دیکھ رہا تھا۔ یہ لوگ شریف ہونے کے باوجود پہلے دن سے ہی کچھ پُراسرار سے نظر آ رہے تھے۔ محلے داروں میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ شاید پیچھے ان لوگوں کی کوئی دشمنی ہے جس کی وجہ سے وہ یہاں آ گئے ہیں۔ ابراہیم کے مکان کے ساتھ ہی ایک درزی محمد سلیم کا گھر تھا۔ محمد سلیم نے بتایا کہ کل رات دو ڈھائی بجے کے قریب چوکیدار نے پستول چلنے کی آواز سنی۔ اوپر نیچے تین فائر کیے گئے۔ چوکیدار بھاگ کر

یہاں پہنچا۔ اس دوران میں بھی باہر نکل آیا۔ گھر کے اندر سے ابراہیم کی بیٹی کے رونے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم نے بند دروازے پر کئی بار دستک دی۔ آخر ابراہیم کے داماد گل حسن نے دروازہ کھولا اور ہمیں اندر لے گیا۔ گل حسن کے اپنے ہاتھوں پر بھی خون لگا تھا اور اس کے ایک کندھے پر مٹی لگی تھی، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی کہیں گرا ہے۔ ہم اندر پہنچے تو ابراہیم چارپائی پر پڑا تھا۔ اور پشتو زبان میں کسی کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ وہ بہت غصے میں دکھائی دیتا تھا۔ ہم نے فوراً اسے ایک ٹیکسی کار میں ڈالا اور اسپتال لے آئے۔

پڑوسیوں اور محلے داروں کے بیان سے یہ شبہ اور مضبوط ہوتا تھا کہ یہ سیدھا سادا چوری یا ڈکیتی کا کیس نہیں بلکہ اس کے پیچھے کوئی اور معاملہ ہے۔ نہ جانے کیوں میری چھٹی حس اعلان کرنے لگی کہ اب گل حسن اور اس کی بیوی جلد ہی گھر واپس نہیں آئیں گے۔ عین ممکن تھا کہ وہ شہر ہی چھوڑ گئے ہوں یا کسی ایسی جگہ شفٹ ہو گئے ہوں۔ جہاں کوئی واقف حال ان تک نہ پہنچ سکتا ہو۔

ان حالات میں ہمارے پاس واحد راستہ یہ تھا کہ ابراہیم خان سے پوچھ گچھ کریں اور پتہ چلائیں کہ یہ پٹھان گھرانہ آخر کس چکر میں یہاں پہنچا ہے اور اگر انہیں کچھ لوگوں سے خطرہ ہے تو وہ کون لوگ ہیں.....؟ کرشن کالونی سے میں تھانے پہنچا اور دوپہر کا کھانا کھاتے ہی واپس اسپتال روانہ ہو گیا۔ اسپتال میں نئے سال کی سب سے حیرت ناک خبر میری منتظر تھی۔ ابراہیم خان شدید زخمی حالت میں اسپتال سے فرار ہو گیا تھا۔ اس کا بستر خالی تھا۔ وہاں ایک اسٹینڈ پر گلوکوز اور دوسرے پر خون کی بوتل جھول رہی تھی۔ پہرے پر موجود ہیڈ کانسٹیبل کا رنگ خوف سے پیلا ہو رہا تھا۔

اس نے کہا۔ ''جناب! میں چھوٹے پیشاب کے واسطے ایک منٹ کے لیے برانڈے میں گیا تھا۔ واپس آیا تو خان غائب تھا۔''

میرے خیال میں ہیڈ کانسٹیبل جھوٹ بول رہا تھا۔ دراصل اس نے لاپرواہی کی تھی۔ اس نے سوچا کہ بندے کو خون اور گلوکوز لگا ہوا ہے۔ اس حالت میں اس نے کہاں دفع ہو جانا ہے۔ وہ ''چائے پانی'' کے لیے وارڈ سے باہر نکل گیا تھا۔ اسی دوران ابراہیم فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

☆======☆======☆

میں نے اپنے مخبروں کو چوکس کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ تھانے کے عملے کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ وہ جہاں کسی مشکوک پٹھان کو دیکھیں فوراً پوچھ گچھ کریں۔ کوئی اور تھانیدار ہوتا تو

ابراہیم کے فرار ہونے کے بعد شکر کرتا کہ مصیبت سر سے ٹلی لیکن میرے اندر جو تجسس جاگ چکا تھا وہ مجھے بے چین کیے ہوئے تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیا خوف ہے جو ابراہیم اور اس کے اہلِ خانہ کو یوں بھگائے پھرتا ہے۔ ممکن تھا کہ اس خوف کا پتہ چل جاتا تو میں ایک قیمتی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتا۔

آٹھ دس روز گزر گئے لیکن ابراہیم یا اس کی بیٹی اور داماد کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ ان میں سے کوئی وہ سامان لینے بھی نہیں آیا جو کرائے کے مکان میں پڑا رہ گیا۔ بے شک یہ سامان زیادہ نہیں تھا، مگر سامان تو تھا۔ اس کے علاوہ ''آٹھ نو سو روپیہ'' پیشگی رقم بھی تھی جو انہوں نے مالک مکان کو دے رکھی تھی۔ ایک روز میں نے مکان کا تالا کھلوا کر ابراہیم کا چھوڑا ہوا سامان دیکھا۔ یہ کل دو صندوق تھے۔ اس کے علاوہ کھانے کے ضروری برتن اور ایک دو لحاف تھے۔ یہ چیزیں ان لوگوں نے گورداسپور پہنچنے کے بعد خریدی تھیں۔ میں نے صندوق کھلوا کر دیکھے۔ ایک صندوق میں زنانہ کپڑے تھے۔ پانچ چھ جوڑے رہے ہوں گے لیکن سب کے سب قیمتی تھے۔ کپڑوں کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ ابراہیم کی بیٹی کے ہیں اور چند ماہ یا ہفتے پہلے ہی اس کی شادی ہوئی ہے۔ دوسرے صندوق میں داماد اور سسر کے نئے و پرانے کپڑے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ''کولٹ ۴۵'' پستول کی چند گولیاں اور دو میگزین بھی کپڑوں کی تہوں سے برآمد ہوئے۔ تلاش کے باوجود پستول کہیں نظر نہیں آیا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا مکان چھوڑتے وقت گل حسن پستول اور ایک کاربین اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

چند روز بعد بلال شاہ کا پروگرام امرتسر جانے کا بن گیا۔ اس کی بیوی روٹھ کر میکے گئی ہوئی تھی اور بلال شاہ نے اسے منا کر واپس لانا تھا۔ کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی میاں بیوی میں۔ جھگڑے کے آغاز کا تو مجھے علم نہیں تھا مگر انجام کی ضرور خبر تھی۔ یقینی بات تھی کہ اب ڈیڑھ دو مہینے بلال شاہ بہت بھلے مانسوں کی طرح گزارے گا۔ رات کو جلدی گھر جائے گا۔ صبح جلدی اٹھے گا۔ دودھ دہی کی دکان پر کم جائے گا اور گھر میں خرچا وغیرہ دیا کرے گا۔ اس کے علاوہ اس ڈیڑھ دو مہینے میں جو سب سے خاص بات ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ بلال شاہ کے گھر میں نئے مہمان کی آمد کی بنیاد پڑ جاتی تھی۔ یہ بالکل پکی پکی بات تھی۔ کیونکہ پچھلے آٹھ دس برسوں سے یہی کچھ ہو رہا تھا۔ جھگڑا کسی بھی طرح کا ہو سکتا تھا۔ مگر اس کا انجام ایک ''نیا بچہ'' تھا۔

بہر طور میں نے بلال شاہ کو نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کیا اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ وہ امرتسر میں ابراہیم کا کھوج لگانے کی کوشش کرے۔ اگر ابراہیم گورداسپور سے نکل چکا تھا تو اس بات کا روشن امکان تھا کہ وہ قریب ترین شہر امرتسر میں پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ میں

نے بلال شاہ کو ہدایت کی کہ وہ سادہ لباس میں ایک کانسٹیبل کو بھی ساتھ لے جائے اور سنجیدگی سے ''کوشش'' کرے۔ ''کوشش'' کا طریقہ بہت آسان تھا۔ ابراہیم زخمی تھا اور عین ممکن تھا کہ وہ طبی امداد کے لیے کسی پرائیویٹ کلینک یا دواخانے میں پہنچے۔ ایسی جگہوں سے اس کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔

میں نے امرتسر کے ''تالاب'' میں جو بلال شاہ والی ''کنڈی'' پھینکی تھی وہ بڑی کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ صرف ۴۸ گھنٹے بعد بلال شاہ نے آ کر مجھے اطلاع دی کہ وہ کامیاب ہو گیا ہے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ وہ بیوی کو منا کر لے آیا ہے اور اس کو کامیابی کہہ رہا ہے لیکن جب اس نے بتایا کہ ابراہیم کا کھوج مل گیا ہے تو میں ششدر رہ گیا۔

وہ بولا۔ ''خان صاحب! میری گھر والی جیسی بھی ہے، ہے بڑی بھاگوان۔ اس سے ملنے گیا اور دیکھئے کتنی جلدی قسمت نے ساتھ دیا۔''

میں نے کہا۔ ''بھاگوان نہ ہوتی تو تمہارے جیسا شوہر کیسے ملتا۔ مل جاتا کوئی کھٹو۔ اپنے ہی پیٹ پر ہاتھ پھیرنے والا اور ٹوکرا بھر بچوں کو فاقے کرانے والا۔''

بلال شاہ نے چونک کر میری طرف دیکھا لیکن جب چہرے پر گہری سنجیدگی دیکھی تو اس کی تسلی ہو گئی کہ میں مذاق نہیں کر رہا۔ کہنے لگا۔ ''بس جی، ہم نے پانچ چھ کلینک ہی دیکھے تھے کہ میری نگاہ نسواری برقعے پر پڑ گئی۔ بھلا اس برقعے کو میں کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دوہرے بدن کا بندہ تھا۔ اس نے منہ سر کمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔ بالکل آہستہ آہستہ چل رہا تھا جیسے بخار چڑھا ہوا ہو۔ وہ دونوں گلاب سنگھ ڈسپنسری سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ کمبل والا ابراہیم خان ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اس کی شکل بھی دیکھ لی۔ اس کے بعد سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ میں اس کا پیچھا چھوڑتا۔ وہ جس بس میں سوار ہوئے میں بھی اس میں بیٹھ گیا...... کانسٹیبل بھگت سنگھ بھی میرے ساتھ تھا۔ بڑے کے گھر تک پہنچ کر چھوڑا ہم نے۔''

بلال شاہ نے ابراہیم کا مکمل ایڈریس مجھے لکھا دیا اور پھر لکیریں کھینچ کر سارا پتہ ٹھکانہ سمجھا دیا۔ یہ لونگاں والی کھوئی سے تھوڑا آگے ''چڑے والے چوک'' کا علاقہ تھا۔ ابراہیم نے اس دفعہ چھپنے کے لیے گنجان آبادی پسند کی تھی۔ بالکل جیسے کوئی بکری قصائی کے ہاتھوں سے بچنے کے لیے بکریوں کی بھیڑ میں گھس جاتی ہے۔ فوری طور پر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ابراہیم اور اس کی بیٹی کا ٹاکرا کیسے ہو گیا۔ اس کی بیٹی بارہ بجے کے قریب اسپتال سے نکل گئی تھی جبکہ ابراہیم پچھلے پہر ڈھائی تین بجے غائب ہوا تھا۔ میں نے سوچا شاید انہوں نے

یاد رہے کہ ابراہیم یہ ساری باتیں پشتو نما اردو میں کر رہا تھا۔ میں قارئین کی آسانی کے لیے ان باتوں کو سیدھے سادے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں۔

میں نے ابراہیم کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کی اور اسے کہا کہ پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔ وہ آبدیدہ ہو گیا۔ اور پھر سسکیاں لینے لگا۔ اندر سے وہ بہت دُکھا ہوا شخص تھا۔ میں نے کوشش کر کے اسے بولنے پر آمادہ کیا ..... اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اس نے اپنے اور اہلِ خانہ کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

ابراہیم آزاد قبائلی علاقے پارہ چنار کا رہنے والا تھا۔ آج سے دو برس پہلے وہ پارہ چنار کے ایک نواحی گاؤں "ترانڈی" میں امن چین کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ تھوڑی سی زمین تھی اور کھیتی باڑی سے با آسانی گزارا ہو رہا تھا۔ ابراہیم اپنی تین بیٹیوں کی شادی کر چکا تھا اور اب سب سے چھوٹی بیٹی ثمر کی باری تھی۔ مقامی رواج کے مطابق ابراہیم نے ثمر کا رشتہ تین ہزار روپے کے عوض گل حسن سے طے کر دیا۔ گل حسن ایک محنتی نوجوان تھا اور لکڑی منڈی میں سودے خریدتا اور فروخت کرتا تھا۔ ایک بیمار والدہ کے سوا آگے پیچھے اس کا کوئی نہیں تھا۔ گل حسن سے ثمر کا رشتہ طے ہونے کے چار ماہ بعد ایک حادثہ ہو گیا۔ گل حسن اپنے دوستوں کے ساتھ کونج کے شکار پر گیا ہوا تھا۔ وہاں اس کا جھگڑا موسیٰ زئی قبیلے کے چند نوجوانوں سے ہو گیا اور موسیٰ زئی قبیلے کا ایک لڑکا گل حسن کے ہاتھوں گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔

قبائلی علاقوں کی دشمنی قدیم زمانے سے مشہور ہے۔ یہاں خون کا بدلہ خون ہوتا ہے اور مقتول کے وارث گل حسن کے پیچھے پڑ گئے اور ہر جگہ اسے ڈھونڈنے لگے۔ دوسری طرف گل حسن میں بھی جان بچانے کی فطری خواہش موجود تھی۔ وہ اپنے خون کے پیاسوں سے چھپتا پھر رہا تھا...... موسیٰ زئی قبیلے کے سردار کی ابراہیم خاں سے علیک سلیک تھی۔ ایک روز وہ ابراہیم خاں سے ملا اور اسے کہنے لگا کہ وہ گل حسن سے اپنی بیٹی کا رشتہ ختم کر دے۔ کیونکہ کچھ بھی ہو جائے انہوں نے گل حسن کو زندہ نہیں چھوڑنا۔ وہ کیوں اپنی بیٹی کی زندگی کو روگ لگانا چاہتا ہے۔ جواب میں ابراہیم خاں نے کہا۔ "میں زبان دے چکا ہوں اور ہم جان دے دیتے ہیں لیکن زبان سے نہیں پھرتے۔" موسیٰ زئی کے سردار نے کہا۔ "زبان تم نے زندہ انسان سے شادی کرنے کی دی تھی۔ بیٹی کو مُردے سے بیاہنے کا وعدہ نہیں کیا تھا اور گل حسن زندہ ہونے کے باوجود مُردہ ہے۔ اسے ایک ایسے مرغ کی طرح سمجھو جس کی گردن کٹ چکی ہے اور پھر بھی بھاگ رہا ہے۔"

ابراہیم نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔ "دیکھو! میرے اور گل حسن کے درمیان جو معاملہ

طے ہوا ہے اس کے مطابق ٹھیک چار مہینے بعد مجھے بیٹی کی رخصتی کرنی ہے۔ اگر ان چار مہینوں کے اندر اندر تم گل حسن کو قتل کر سکو تو ٹھیک ہے ورنہ میں قول کے مطابق اسے بیٹی دینے پر مجبور ہوں گا۔" موسیٰ زئی سردار نے کہا۔ "چار مہینے تو بہت ہیں ہم اس سے پہلے اس کا قصہ پاک کر دیں گے۔"

یوں دو پٹھانوں کے درمیان یہ عجیب و غریب معاملہ طے پا گیا کہ موسیٰ زئی والے چار ماہ کے اندر اندر گل حسن کا کام تمام کر دیں گے۔

موسیٰ زئی کا سردار اٹھ کر جانے لگا تو ابراہیم خاں نے کہا۔ "لیکن ایک بات یاد رکھنا سردار! بیٹی کی رخصتی ہو گئی تو پھر گل حسن میرا داماد ہو گا اور اگر تم میرے داماد کو مارنے آؤ گے تو مجھے اس کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہونا پڑے گا۔"

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ پارہ چنار کے برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں پر شام اور صبح کے رنگ چڑھتے رہے۔ چٹانوں میں دشمنی پلتی رہی اور کھیتوں کھلیانوں میں "انتقام" سرگوشیاں کرتا رہا۔ آخر چار مہینے گزر گئے۔ کوشش کے باوجود موسیٰ زئی والے گل حسن کو قتل نہیں کر سکے اور ..... بہار کی ایک چمکتی دمکتی خوش گوار صبح کو بڑی خاموشی کے ساتھ ثمر، گل حسن کی دلہن بن گئی۔ وہ اسے بیاہ کر اپنے گاؤں مشک خیل لے گیا۔

اسی دوران مقتول لڑکے کا ایک بھائی جو مزدوری کے سلسلے میں رنگون گیا ہوا تھا۔ وہاں سے واپس آ گیا اور گل حسن کو قتل کرنے کی کوششوں میں نئے سرے سے جان پڑ گئی۔ پہلے تو گل حسن کا کوئی والی وارث نہیں تھا لیکن اب ابراہیم خاں کا داماد بننے کے بعد اسے بھی ایک گھرانے کی حمایت مل گئی تھی۔ اپنے اعلان کے مطابق ابراہیم خاں خم ٹھونک کر میدان میں آ گیا اور داماد کی حمایت کرنے لگا۔ دشمنی اور انتقام کی یہ آنکھ مچولی جاری رہی۔ پہلے گل حسن پر ایک عرس میں فائرنگ کی گئی۔ پھر گاؤں کے راستے میں اسے قتل کرنے کی ناکام کوشش ہوئی۔ آخر عید کے موقع پر موسیٰ زئی قبیلے کے چار جوان برقعے پہن کر مشک خیل پہنچے اور انہوں نے اندھا دھند فائرنگ کر کے ابراہیم خان کے دو بھائیوں اور گل حسن کی والدہ سمیت پانچ افراد قتل کر دیے۔ گل حسن اس خوفناک قاتلانہ حملے میں معجزانہ طور پر بچ گیا۔ موسیٰ زئی کے قاتلوں کو چونکہ علاقے کے ایک بہت بااثر ملک کی حمایت بھی حاصل ہو گئی تھی لہٰذا ابراہیم ایک دم تنہا اور بے آسرا رہ گیا لیکن وہ بزدل نہیں تھا۔ اس نے قول دیا تھا کہ وہ اپنے داماد کی حفاظت کرے گا۔ اور اس قول کی خاطر اپنی جان دینا اس کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ دشمن زور مار رہا تھا اور گل حسن کی زندگی کا ٹمٹماتا چراغ کسی بھی وقت بجھ سکتا تھا۔ ابراہیم خاں نے بڑی

راز داری سے اپنی زمین اونے پونے بیچی اور بیٹی اور داماد کو لے کر راتوں رات پارہ چنار سے نکل آیا۔ کرم ایجنسی میں اسے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں وہ اپنے دشمنوں سے محفوظ رہتا۔ اس نے کہیں دور نکل جانے کا فیصلہ کیا اور پارہ چنار سے سینکڑوں میل دور کپورتھلہ کے چھوٹے سے قصبے میں پہنچ گیا۔ کپورتھلہ میں وہ قریباً دو مہینے ایک کرائے کے مکان میں رہا۔ وہاں سے وہ گورداسپور آ گیا۔ اس نے کرشن کالونی میں ایک مکان کرائے پر لے لیا اور ایک دوسرا مکان امرتسر کے ''چڑے والا چوک'' میں خرید لیا۔

دراصل وہ محسوس کر رہا تھا کہ کچھ مشکوک افراد اس کے اردگرد گھوم رہے ہیں اور وطن سے کئی سو میل دور آ کر بھی اس کا داماد اور بیٹی دشمنوں سے محفوظ نہیں۔ پھر جلد ہی اس کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ گل حسن کے خون کے پیاسے ان کی بو سونگھتے ہوئے گورداسپور تک بھی پہنچ چکے تھے۔ معلوم نہیں یہ کھوج انہوں نے کیونکر اور کیسے لگایا تھا مگر جو حقیقت تھی اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ گورداسپور میں موجود تھے اور ابراہیم خاں نے انہیں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کی دید ابراہیم اور ثمر کے لیے ایک انتہائی دہشت ناک تجربہ تھی۔ جو دشمن ان کا کھوج لگا کر اتنی دور آ سکتا تھا وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ ثمر کو یقین ہونے لگا کہ دشمن عنقریب اس کا سہاگ اجاڑ دیں گے۔ صدمے سے لاچار ہو کر وہ تھانے پہنچ گئی اور رو رو کر مجھے اپنے دل کا حال سنایا لیکن اس نے ساری بات کھول کر نہیں بتائی۔ وہ کش مکش میں تھی۔ باپ نے اسے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کرے گی اور پولیس سے تو بالکل نہیں۔ اس کا خیال تھا کہ پولیس بیچ میں آ گئی تو گل حسن کے دشمنوں کا کام اور آسان ہو جائے گا۔

جس روز ثمر مجھ سے تھانے میں مل کے گئی اس سے چھ دن بعد گل حسن کے دشمنوں نے اس پر ایک بھرپور وار کیا۔ رات کے وقت دو مسلح قبائلی ابراہیم کے گھر میں گھس آئے۔ شاید وہ بڑی خاموشی سے گل حسن کا گلا کاٹ کر چلے جاتے لیکن ابراہیم ایک بار پھر ہوشیار تھا۔ وہ کسی چوکس محافظ کی طرح جاگ رہا تھا لہٰذا حملہ آوروں کو زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ابراہیم نے گل حسن کو حملہ آوروں سے دور رکھنے کے لیے اس کے کمرے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی تھی۔ گل حسن اور ثمر اندر سے دروازہ پیٹتے رہے جبکہ ابراہیم باہر حملہ آوروں سے گتھم گتھا رہا۔ اتفاقاً ابراہیم کے اڑوس پڑوس والے بھی جلد جاگ گئے اور حملہ آوروں کو بھاگنا پڑا۔ تاہم وہ جاتے جاتے بھی ابراہیم کو گولی مار گئے۔

ابراہیم زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا۔ اسپتال جانے سے پہلے اس نے داماد اور بیٹی کو

ہدایت کر دی تھی کہ وہ فوراً امرتسر والے مکان میں چلے جائیں۔ وہ مکان اس نے کسی ایسی ہی ہنگامی ضرورت کے لیے خرید رکھا تھا...... بعد میں ابراہیم خود بھی اسپتال سے فرار ہو کر امرتسر پہنچ گیا۔ میں حیران تھا کہ ابراہیم اور گل حسن دوبارہ کیسے اکٹھے ہو گئے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ انہوں نے پہلے سے امرتسر میں ایک مکان خرید رکھا ہے۔ اب یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ گل حسن ہر وقت گھر میں کیوں گھسا رہتا ہے اور کیوں لوگوں سے زیادہ ملتا جلتا نہیں۔

ہماری باتوں کے دوران ہی گل حسن بھی پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ ایک خوبصورت سا نوجوان تھا۔ محبت کرنے والا، مسکراہٹیں بکھیرنے والا اور آنکھوں میں سہانے خواب سجا کر رکھنے والا۔ پتہ نہیں کیسے اس کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ اب وہ خود بھی موت کے نشانے پر تھا اور ''دشمن ہاتھ'' اس کی شہ رگ سے خون نچوڑنے کے لیے لپک رہے تھے۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں افسردگی اور مایوسی کی دھند سی پھیلی ہوئی ہے۔ موت کا خوف کوئی معمولی خوف نہیں ہوتا اور پھر ایسی موت جو پُراسرار سائے کی طرح اردگرد منڈلا رہی ہو اور کسی بھی وقت انسان کو دبوچ سکتی ہو۔ اس موت کا خوف کسی عفریت کی طرح انسان کا لہو پیتا رہتا ہے اور بعض اوقات وہ موت سے پہلے ہی خود کو مُردہ سمجھنے لگتا ہے۔

ایک بار جب ابراہیم نے زبان کا تالا کھول دیا تو پھر کچھ بھی نہیں چھپایا۔ اس نے کہا۔ ''تھانیدار صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ میں اپنے داماد کو یہاں بھی محفوظ نہیں سمجھ رہا۔ اللہ کرے میرا قیافہ غلط ہو لیکن...... مجھے لگ رہا ہے...... موسیٰ زئی والے یہاں بھی پہنچ گئے ہیں۔ ایک محلے دار نے بتایا ہے کہ پرسوں ایک شخص بازار میں پوچھتا پھر رہا تھا کہ اس مکان میں کون لوگ آئے ہیں۔ وہ پٹھان تھا اور ٹوٹی پھوٹی اردو بولتا تھا...... اب آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے سامنے گلی کی نکڑ پر ایک رکشہ کھڑا تھا۔ اس میں دو پنجابی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک پنجابی کو میں گورداسپور میں بھی اپنے گھر کے آس پاس دیکھ چکا ہوں......''

میں نے دیکھا کہ ابراہیم کے سرخ و سپید چہرے پر تشویش کے سائے تھے۔ کچھ یہی کیفیت گل حسن کے چہرے پر بھی دکھائی دے رہی تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے وہ اپنی زندگی سے مایوس نظر آ رہا تھا۔ اس کی ''مایوسی'' سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ جو لوگ صرف اس کی جان لینے کے لیے پانچ بے گناہوں کو قتل کر چکے تھے اور اب اتنی دور اس کے پیچھے آ گئے تھے وہ یونہی ناکام جانے والے نہیں تھے۔

میں نے کہا۔ ''ابراہیم! میرا خیال ہے اب تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہونا چاہیے۔ تمہارے پیچھے آنے والے خاصے طاقتور لوگ ہیں اور پولیس کی مدد کے بغیر تم ان سے بچ نہیں

سکو گے۔ تم نے کافی وقت ضائع کر دیا ہے۔ بہر حال اب بھی ہم سے جو کچھ بن پڑا ہم کریں گے۔ میں تمہارے لیے پولیس گارڈ کا انتظام کرتا ہوں۔ اس کے بعد سوچا جائے گا کہ تمہاری مستقل حفاظت کا کیا انتظام ہو سکتا ہے۔ ... ویسے تم اپنے طور پر تیاری رکھو ممکن ہے تمہیں کسی اور جگہ شفٹ کرنا پڑے۔ ...''

ابراہیم اور گل حسن خاموشی سے میری باتیں سنتے رہے۔ لگتا تھا پریشانی نے ان کے ذہن ماؤف کر رکھے ہیں۔ میں نے جیب سے کولٹ پسٹل کے میگزین اور گولیاں نکالتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ چیزیں تمہارے سامان سے نکلی ہیں، پستول کہاں ہے؟''

ابراہیم ہچکچا کر بولا۔ ''ہمارے پاس ہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے اس کے علاوہ تمہارے پاس ایک رائفل بھی ہے۔'' وہ خاموش رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ آزاد علاقہ نہیں۔ یہاں ان ہتھیاروں کے لیے لائسنس ضروری ہوتا ہے لہٰذا وہ یہ چیزیں میرے حوالے کر دے۔ اسی اثنا میں دروازے پر نازک سی دستک ہوئی۔ یہ ثمر تھی۔ اس نے پردے کی اوٹ سے چائے کی پیالیاں گل حسن کو تھما دیں۔ گل حسن نے ایک پیالی واپس کرتے ہوئے پشتو میں کچھ کہا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا اس نے کہا تھا کہ ابا جان (ابراہیم) چائے نہیں پئیں گے۔ ان کے لیے قہوہ لے آؤ۔ ثمر قہوہ بنانے کے لیے واپس لوٹ گئی۔ چائے سے فارغ ہوتے ہی میں اور بلال شاہ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے مقامی تھانیدار سے مل کر ابراہیم کے گھر کی حفاظت کا انتظام کرلوں۔

جب ہم ابراہیم کے گھر سے نکلے رات کے دس بج چکے تھے۔ سردی عروج پر تھی۔ امرتسر کے گلیاں کوچے سنسان نظر آ رہے تھے۔ ہم نے ایک ٹیکسی روکی اور تھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں اچانک مجھے خیال آیا کہ اسلحے والی بات تو درمیان میں ہی رہ گئی۔ میں نے ابراہیم سے ہتھیار لانے کو کہا تھا پھر چائے آ گئی اور چائے پیتے ہی ہم باہر نکل آئے۔ میں نے سوچا کہ ٹیکسی والے کو واپس چلنے کا کہوں لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ ابھی تھوڑی دیر میں مجھے ابراہیم کے ہاں آنا تھا۔ اس وقت ان سے ہتھیار لیے جا سکتے تھے۔

ابھی ہماری ٹیکسی ''لونگاں والی کھوئی'' کے پاس پہنچی تھی کہ اس کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ سکھ ڈرائیور ٹائر بدلنے میں مصروف ہو گیا اور ہم ایک دکان کے چھجے تلے کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ بلال شاہ کبھی ڈرائیور کو کوس رہا تھا کبھی پنکچر ہونے والے ٹائر کو گالیاں دے رہا تھا۔ دراصل اسے سخت نیند آ رہی تھی اور نیند اور بھوک تو اس سے برداشت ہوتی ہی نہیں تھی۔

دکان کے سامنے کھڑے اچانک میری نگاہ ایک رکشہ پر پڑی۔ وہ بڑی تیزی سے ''چڑے والا چوک'' کی طرف جا رہا تھا۔ رکشے میں دو کی جگہ تین افراد بیٹھے تھے اور ان میں سے کم از کم دو پٹھان تھے۔ نہ جانے کیوں میری چھٹی حس کسی خطرے کا اعلان کرنے لگی۔ میں نے بلال شاہ سے پوچھا۔ ''تم نے رکشہ دیکھا ہے؟''

''نہیں تو۔'' بلال شاہ نے جواب دیا۔

''دو تین پٹھان گئے ہیں چوک کی طرف اور مجھے شک ہے کہ مسلح بھی ہیں۔'' میں نے کہا۔

سکھ ڈرائیور پہیے کے نٹ کستے ہوئے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے چہرے کی پریشانی پڑھ کر بولا۔ ''کی گل اے جناب؟ گھبرا جئے گئے او!''

میں نے کہا۔ ''سردار! جلدی کرو۔ ایک بندے کا پیچھا کرنا ہے۔''

میں وردی میں تھا لہٰذا سکھ ڈرائیور نے بڑے جوش و خروش سے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم دروازے کھول کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ اپنے اوزار ڈگی میں پھینک کر سکھ ڈرائیور نے بھی اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ ہم تیزی سے واپس مڑے اور ''چڑے والا چوک'' کی طرف روانہ ہو گئے۔

ابھی ہم ابراہیم خاں کے گھر سے سو پچاس قدم دور ہی تھے کہ پستول کے تین چار فائر ہوئے۔ یہ فائر میرے ساتھ ساتھ بلال شاہ نے بھی سنے۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ہولسٹر سے اپنا ریوالور نکال کر چیک کیا۔ اتنے میں ٹیکسی مکان کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ میرے کہنے پر ڈرائیور نے ٹیکسی روک دی۔ اس وقت خود کار رائفل کی تڑتڑ سنائی دی۔ یہ آواز بہت صاف تھی، اور یقینی بات تھی کہ ابراہیم کے مکان کے اندر سے آئی ہے۔ میں نے دیکھا کچھ راہگیر دوڑ کر مکان کے ادھ کھلے دروازے کی طرف جا رہے ہیں۔ پھر مجھے وہ رکشہ بھی نظر آ گیا جو چند منٹ پہلے میں نے ''لونگاں والی کھوئی'' پر دیکھا تھا۔ اب شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ابراہیم کے مکان میں کوئی گڑبڑ ہو چکی تھی۔ میں اور بلال شاہ تیزی سے باہر نکلے۔ میں نے بلال شاہ کو دروازے پر کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور خود ریوالور ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوا۔ میں تاریکی میں تھا اور بالکل دیوار کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔

مکان میں ایک چھوٹی سی گیلری بھی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے گیلری کی چھوٹی سی کھڑکی میں دو شعلے چمکے اور دھماکوں کی آواز آئی۔ پھر میں نے زینوں کے پاس ایک سائے کو تیزی سے حرکت کرتے دیکھا۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ گل حسن کی زندگی شدید خطرے میں

ہے۔ یہ غور وفکر کرنے کا موقع نہیں تھا کہ وہ کون ہے..... جونہی میں برآمدے سے گزر کر ایک اندرونی کمرے کے دروازے پر پہنچا ایک شخص میرے سامنے آگیا۔ میرا چہرہ تاریکی کی طرف تھا اور اس کا روشنی کی طرف۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے ٹھیک طرح دیکھ سکتا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ اہلِ خانہ میں سے نہیں تھا۔ وہ بڑے سے پگڑ والا قبائلی تھا۔ اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں خودکار رائفل نظر آئی اور میں سمجھ گیا کہ ابھی جو تڑ تڑ گونجی تھی وہ اسی طاقتور رائفل کی آواز تھی۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے اس رائفل پر ہاتھ ڈالا اور ٹانگ کی بھرپور ضرب قبائلی کی چھاتی پر رسید کی۔

یہ بہت جچا تلا وار تھا۔ رائفل قبائلی کے ہاتھ سے نکل گئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا اندر کسی شیشے سے ٹکرایا اور اسے چکنا چور کر گیا۔ یہی وقت تھا جب مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ مجھے جھکنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی ہوتی تو ڈبل بیرل شاٹ گن کا وزنی دستہ عین میرے سر پر پڑتا۔ یہ دوسرا قبائلی تھا جو میرے برآمدے میں آنے سے پہلے ہی ایک ستون کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ میں نے شاٹ گن کی ضرب بچا کر ریوالور والا ہاتھ پوری شدت سے اس کے منہ پر مارا وہ اچھل کر اسی ستون سے ٹکرایا جس کے عقب میں کھڑا تھا اور پھر ایک دم صحن کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا اس کی شاٹ گن خالی ہو چکی تھی اور اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اسے دوبارہ لوڈ کر سکتا۔ جونہی وہ صحن عبور کر کے بیرونی دروازے پر پہنچا وہاں کھڑا بلال شاہ جن کی طرح اسے چمٹ گیا۔ میں نے پہلے دونوں کو بغل گیر ہوتے دیکھا۔ پھر وہ الٹ کر زمین پر گرے اور اوپر نیچے ہونے لگے۔

میری ٹانگ کھا کر کمرے کی تاریکی میں گرنے والا شخص گرنے کے بعد سنبھلا اور بڑے طیش کے عالم میں مجھ پر جھپٹا لیکن اپنے طیش میں وہ یہ بھول گیا کہ اس سے چھینی ہوئی رائفل میرے دائیں ہاتھ میں ہے۔ میں نے ایک دم دائیں طرف ہٹ کر خود کو اس کی زد سے بچایا اور رائفل کی بڑی ''کراری'' ضرب اس کی کنپٹی پر لگائی۔ وہ چیخ کر ایک کرسی سے ٹکرایا اور اسے برابر کرتا ہوا صحن میں گرا۔ عین اس لمحے زینوں پر کسی نے ریوالور سے مجھ پر گولی چلائی۔ یہ نشانہ خطا گیا۔ میں نے ستون کی اوٹ میں ہو کر اپنے ریوالور سے دو جوابی فائر کیے۔ اس دوران گیلری سے بھی کولٹ پسٹل کے دو تین فائر ہوئے پھر خاموشی چھا گئی۔ خاموشی سے مراد یہ نہیں کہ سناٹا چھا گیا تھا۔ دھماکوں کی جگہ اور بہت سی آوازوں نے لے لی تھی۔ ان میں محلے داروں کی آوازیں تھیں جو گلی میں اور بیرونی دروازے کے قریب جمع ہو چکے تھے۔ پھر اس میں بلال شاہ کی چیخ و پکار تھی جس نے ایک قبائلی کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا اور اب مجھے مدد کے

لیے بلا رہا تھا۔ گیلری کی طرف سے کسی کے پکارنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔

میں نے سب سے پہلے بلال شاہ کی طرف دھیان دیا۔ اس نے بڑی مہارت سے قبائلی کو کوئی پہلوانی لاک لگا رکھا تھا۔ مگر قبائلی بھی ایک کایاں تھا وہ زور لگا کر اس لاک میں سے پھسلتا جا رہا تھا۔ میں نے دو محلے داروں کے ساتھ مل کر اس قبائلی پر قابو پا لیا۔ اس کی جامہ تلاشی لینا ضروری تھا لیکن اس سے پہلے میں دوسرے دو افراد کا اتہ پتہ لگانا چاہتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ ابھی تک مکان میں ہی کہیں چھپے ہوں۔ میں زینوں کے پاس پہنچا تو ایک کھٹکے سے گیلری کا دروازہ کھلا اور اندر سے گل حسن بمعہ اپنی بیوی کے برآمد ہوا۔ کولٹ پسٹل ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے کا ہراس کسی حد تک کم ہو گیا۔ ثمر رو رہی تھی اور شوہر کے بازو سے چپکی ہوئی تھی۔

گل حسن کے ساتھ مل کر میں نے گھر کی ساری بتیاں جلا دیں۔ کونے کھدروں میں جھانکا الماریوں کے اندر دیکھا، کہیں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ پھر ہم بیٹھک کی طرف بڑھے۔ اچانک ثمر نے چیخ ماری اور بھاگ کر اس جسم سے لپٹ گئی جو فرش پر لہولہان پڑا تھا..... یہ ابراہیم خان تھا..... ثمر نے اس کا چہرہ سیدھا کیا اور ہم سکتے میں رہ گئے۔ وہ مر چکا تھا۔ خودکار رائفل کی آدھ چھٹانک وزنی گولی اس کی پیشانی میں لگی تھی اور کنپٹی پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ اس کا مغز کنپٹی کے سوراخ سے نکل کر رخسار پر بہہ رہا تھا۔ خدا کی پناہ..... کتنا خوفناک نظارہ تھا۔ ابھی بیس پچیس منٹ پہلے یہ شخص اسی جگہ میرے سامنے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں روشنی تھی، جسم میں حرارت تھی اور ذہن میں سوچیں تھیں۔ اب کچھ نہیں تھا۔ ایک بے جان لاشہ تھا جو اپنے لیے چند گز لٹھے اور ایک قبر کے سوا کچھ نہیں مانگ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی الائچی والے قہوے کی پیالی اوندھی پڑی تھی۔ یہ قہوہ اس کی قسمت میں نہیں تھا لہٰذا اس کے حلق میں جانے کی بجائے فرش پر بچھی دری میں جذب ہو گیا تھا۔ ثمر نے اس بے جان لاشے کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا اور دلدوز آواز میں بین کرنے لگی۔

میں اس دلخراش منظر سے نگاہیں بچا کر بیٹھک سے باہر آ گیا۔ اب گھر کے اندر اور باہر درجنوں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ میں نے ہدایت کی کہ سب لوگ مکان سے باہر چلے جائیں۔ لوگ باہر نکل گئے تو ہم نے گرفتار شدہ قبائلی کی جامہ تلاشی لی۔ اس کے لباس سے ایک خنجر برآمد ہوا اس کے علاوہ اس کے پیٹ سے کارتوسوں والی ایک پٹی بھی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے ایک قریبی گھر سے مقامی تھانے میں فون کر دیا تاکہ متعلقہ تھانیدار موقع پر پہنچ جائے۔

پورے گھر میں گولیوں اور کارتوسوں کے خول بکھرے ہوئے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ

تین چار منٹ تک کھلم کھلا فائرنگ ہوئی تھی۔ میں ابراہیم اور گل حسن سے ہتھیار لیے بغیر تھانے روانہ ہو گیا تھا۔ اگر میں یہ غلطی نہ کرتا تو شاید ابراہیم کے ساتھ ساتھ گل حسن اور ثمر کی لاشیں بھی اس چھت تلے موجود ہوتیں۔ ان کے پاس ہتھیار تھے اس لیے وہ اپنا دفاع کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ گل حسن نے بیان دیتے ہوئے کہا۔ ”میں ابراہیم خان کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اتنے میں ثمر نے آواز دی۔ وہ گیلری میں اپنی چارپائی پر لیٹی تھی۔ اس نے کہا کہ اس کا دل ڈوب رہا ہے۔ جب سے چچا ابراہیم حملے میں زخمی ہوئے تھے، ثمر ایک رات کے لیے بھی چین سے نہیں سو سکی تھی۔ ساری رات کمرے میں چکراتی رہتی تھی یا مصلیٰ بچھا کر نفل وغیرہ پڑھنے لگتی تھی۔ تین چار مرتبہ اسے دل ڈوبنے کی شکایت بھی ہو چکی ہے۔ میں اس کے پاس بیٹھ کر ہتھیلیوں کی مالش وغیرہ کرنے لگا۔ اتنے میں نیچے فائرنگ ہو گئی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ حملہ آوروں نے میرے سسر کو زندہ نہیں چھوڑا۔ میرے پاس بھرا ہوا پستول تھا۔ میں نے گیلری کا دروازہ اندر سے بند کیا اور حملہ آوروں کی فائرنگ کا جواب فائرنگ سے دینے لگا۔“

گل حسن کے علاوہ ہم نے چوکیدار سمیت پانچ چھ مزید افراد کے بیان قلمبند کیے۔ جائے واردات کی تصویریں وغیرہ بنائیں اور مقتول کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال روانہ کر دی۔ بعد ازاں ہم نے گل حسن کا پستول اور ابراہیم کی کاربین رائفل بھی قبضے میں لے لی اور تھانے آ گئے۔

دن چڑھنے تک اس سنسنی خیز قتل اور پولیس مقابلے کی خبر پورے امرتسر میں پھیل گئی۔ اور ہر کوئی یہ جاننے کے لیے بے قرار نظر آنے لگا کہ آزاد علاقے سے آنے والے قبائلی خودکار ہتھیاروں سے لیس ہو کر امرتسر کے ”چڑے والا چوک“ تک کیسے پہنچے اور کیسے ایک شخص کو قتل کرنے میں کامیاب ہوئے...... اس قتل کے مجرموں تک پہنچنے کے لیے ہمارے پاس واحد سراغ وہ گرفتار شدہ قبائلی تھا جسے امرتسر کے مرکزی تھانے میں رکھا گیا تھا۔ اس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ اس نے اپنا نام نصیب خان بتایا اور کہا کہ وہ خرلاچی کی لکڑی منڈی میں پانڈی کا کام کرتا ہے۔ نصیب خان ایک خر دماغ اور جوشیلا شخص تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بولتا تھا۔ اس نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”ام پٹھان کا بچہ ہے۔ اپنے دشمن کا پیچھا قبر کی دیوار تک کرتا ہے۔ ام ابراہیم خاں کے داماد کو چوڑے گا نئیں۔ ام گرفتار ہو گیا تو کیا ہوا۔ سو پچاس آدمی بھی پکڑا جائے تو کیا ہو گا؟ جب تک موسیٰ زئی کا ایک مرد بھی جیل اور قبر سے باہر ہے گل حسن خود کو زندہ نہیں سمجھ سکتا۔ یہ پولیس مولیس تو رہا ایک طرف ام قسم کھاتا ہے کہ فرنگی فوجی بھی

کوشش کرے تو گل حسن کا جان نہیں بخشوا سکتا۔ اس نے امارا قبیلے کا بے گناہ آدمی مارا ہے اور وہ بھی زمین کے اوپر نہیں چلے گا۔“

بڑے ٹیڑھے قسم کے لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑا تھا۔ ہندو انسپکٹر جگ جیون رام کے تو پسینے چھوٹنے لگے۔ کہنے لگا۔ ”نواز خان! میں بھگوان کے بعد کسی سے ڈرتا ہوں تو ان قبائلی قاتلوں سے۔ جس کے پیچھے پڑ جائیں اسے تو چھوڑتے نہیں۔ اسے بچانے والے کو بھی ٹھنڈا کر کے دم لیتے ہیں۔ نہ ان کے دماغوں میں بُدی (عقل) ہوتی ہے نہ چمڑی میں خوف۔ جو خر دماغ موت سے ہی نہ ڈرے اسے حوالات بھلا کیا ڈرائے گی۔“ پھر وہ مجھے ایک واقعہ سنانے لگا کہ کس طرح زیارت میں چند بلوچیوں نے ایک لڑکی لڑکے سمیت پولیس کے چار اہلکاروں کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ جگ جیون اس واقعے کا نہ صرف چشم دید گواہ تھا بلکہ خود بھی بڑی مشکل سے جان بچا کر وہاں سے بھاگا تھا۔ اس نے بیڑی سلگاتے ہوئے کہا۔ ”نواز خان! میں تو ایک نتیجے پر پہنچا ہوں۔ یہ لوگ اب اس لڑکے کو چھوڑیں گے نہیں۔ اس نے اب مرنا ہی مرنا ہے۔ ہم خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کریں گے اور پران خطرے میں ڈالیں گے...... ہاں ہم یہ کر سکتے ہیں کہ یہ قتل ہمارے علاقے میں نہ ہو۔ یہ کام کچھ ایسا مشکل نہیں۔ لڑکے کو ”چڑے والا چوک“ چھوڑنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ مجبور کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہم نے اسے زبردستی نہ روکا تو وہ اگلے بیس چوبیس گھنٹے میں خود ہی مکان چھوڑ جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”جیون رام! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ہم سب کچھ جانتے بوجھتے آنکھیں کیسے بند کر لیں۔ ٹھیک ہے کہ مجرم طاقتور ہیں اور ان کے پاس قبائلی طاقت ہے لیکن ہیں تو وہ مجرم۔ ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم قانون کی شکست تسلیم کر رہے ہیں اور ایک بے سہارا شخص کو قاتلوں کے سپرد کر رہے ہیں جو آخری امید کے طور پر ہماری طرف دیکھ رہا ہے...... کم از کم مجھ سے تو ایسا نہیں ہو سکے گا جیون رام۔“

انسپکٹر جیون رام برا سا منہ بنا کر چپ ہو گیا۔ جیسے اسے مجھ سے ایسی ہی بے وقوفی کی توقع تھی۔ جیون رام جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ سارا غلط بھی نہیں تھا۔ قبائلی لوگ جب کسی کا پیچھا کرتے ہوئے کہیں پہنچتے ہیں تو پھر انہیں روکنا قریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ جرم بھی جہاد سمجھ کر کرتے ہیں اور اس ”جہاد“ میں بڑی سے بڑی مصیبت جھیلنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اس کی ایک مثال گرفتار شدہ قبائلی نصیب خاں کی صورت میں ہمارے سامنے تھی۔ وہ بڑے دھڑلے سے اعتراف کر رہا تھا کہ اس نے نہ صرف ابراہیم کے قتل میں تعاون کیا ہے بلکہ گل حسن کو

قتل کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور اس کے علاوہ پولیس مقابلے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ اب ایسے حوالاتی کو بندہ کیا ڈرائے دھمکائے اور کیا مارے پیٹے؟

میں نے بڑے حیلے بہانوں سے نصیب خاں کو بولنے پر آمادہ کیا۔ میں نصیب خاں سے اس دشمنی کی وجہ جاننا چاہتا تھا جو اَب ''موت'' بن کر گل حسن کا پیچھا کر رہی تھی۔ ابراہیم خان نے جو کچھ بتایا تھا وہ تصویر کا ایک رخ تھا، ممکن تھا کوئی دوسرا رخ بھی ہو۔

نصیب خاں ٹھنڈے ٹھار حوالات میں گرم چادر کی بُکل مارے ''پرالی'' پر بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں رخسار پر ایک نیلگوں ابھار نظر آ رہا تھا اور اس ابھار میں سے تھوڑا تھوڑا رسنے والا خون بلب کی زرد روشنی میں چمک رہا تھا۔ ابراہیم کے گھر میں نے نصیب خاں کے چہرے پر ریوالور سے ضرب لگائی تھی اور یہ نیلگوں ابھار اسی ضرب کی نشانی تھا۔ نصیب خاں نے میرے سوالوں کے جواب میں جو کچھ بتایا وہ اس طرح تھا۔

قریباً ڈیڑھ برس پہلے ایک معمولی بات پر گل حسن اور موسیٰ زئی کے نوجوان اکبر میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ اکبر ایک کھاتے پیتے شخص کا بیٹا تھا اور ان لوگوں نے گھوڑے وغیرہ پال رکھے تھے۔ ایک روز اکبر کا ایک گھوڑا گل حسن کی بستی میں آ گیا اور وہاں ایک غریب کوچبان نذر خان کی گھوڑی سے ''مل'' گیا۔ کسی غریب کوچبان کی گھوڑی یوں ''گابھن'' ہو جائے تو اس کے گھر میں فاقوں کی نوبت آ جاتی ہے۔ نذر خاں کے سر پر بھی مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ فریاد لے کر اکبر کے باپ کے پاس گیا لیکن بجائے اس کے کہ نذر محمد کی کوئی مالی امداد کی جاتی اسے برا بھلا کہہ کر وہاں سے نکال دیا گیا۔

چند روز بعد بستی کے لڑکوں میں یہی بات ہو رہی تھی کہ اکبر خاں بھی مُشکی گھوڑے پر سوار وہاں پہنچ گیا۔ گل حسن نے کوئی بات کی جس پر اکبر آگ بگولا ہو گیا اور اس نے کہا کہ نذر خاں کی گھوڑی ہی تھی تمہاری کچھ لگتی تو نہیں تھی...... گل حسن بھڑک کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اکبر خان کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ گل حسن یہ رائفل چھیننے کی کوشش کر رہا تھا، اسی کوشش میں رائفل چل گئی اور گولی اکبر کے سینے میں لگی۔ وہ وہیں گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔ گل حسن، مقتول اکبر کے گھوڑے پر سوار ہو کر نکل بھاگا۔ اسی روز شام کو موسیٰ زئی کا جرگا ہوا اور اس میں فیصلہ کیا گیا کہ گل حسن کو جلد سے جلد تلاش کر کے انجام تک پہنچایا جائے گا۔''

اس کے بعد نصیب خان نے جو کچھ بتایا وہ میں اس سے پہلے ابراہیم خان سے بھی سن چکا تھا۔ یعنی موسیٰ زئی کے سردار کا ابراہیم سے ملنا اور اس سے کہنا کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ گل حسن سے نہ کرے کیونکہ اسے جلد ہی قتل ہو جانا ہے...... ابراہیم کا چار مہینے انتظار کرنا اور پھر بیٹی کا

ہاتھ گل حسن کے ہاتھ میں تھما دینا...... وغیرہ وغیرہ۔ اس روداد کے آخر میں نصیب خان نے یہ انکشاف بھی کیا کہ گل حسن کو قتل کرنے کے لیے کم از کم بیس افراد امرتسر میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی جتنے لوگوں کی ضرورت ہو گی وہ دو دن کے اندر اندر کرم ایجنسی سے یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس نے کہا کہ گل حسن کا مسئلہ اب پورے قبیلے کا مسئلہ بن چکا ہے۔ اور ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ گل حسن کا قصہ اب جلد پاک ہو۔

نصیب خان جو کچھ بتا رہا تھا وہ بہت لرزہ خیز تھا۔ اپنی دس سالہ سروس کے دوران پہلی بار میرے دل میں ایک مایوسی سی ابھرنے لگی۔ جیسے واقعی ہم گل حسن کے لیے کچھ نہیں کر سکتے اور قاتلوں کے ہاتھوں عین جوانی میں زندگی سے محروم ہونا گل حسن کا مقدر ہے۔ میری نگاہوں میں ثمر کی روتی بلکتی صورت ابھری اور اس کا وہ سوال میرے کانوں میں گونجا جو اس نے میرے کمرے میں بیٹھ کر مجھ ہی سے کیا تھا۔ ''انسپکٹر صاحب! ام کو ایک بات بتائیں۔ کیا پولیس میں اتنا طاقت نہیں کہ وہ ایک شخص کا جان بچا سکے؟ کیا کسی میں اتنا اِمّت نہیں کہ ایک مجبور و بے سہارا شخص کو، مارنے والوں سے چھڑا سکے۔ کیا یہ ملک، یہاں کا اکومت یہاں کا بڑا بڑا افسر لوگ سب بے بس ہے؟''

☆======☆======☆

پارہ چنار سے ابراہیم کے وارث آئے اور اس کی لاش لے کر واپس چلے گئے۔ وہ گل حسن اور ثمر دونوں سے سخت خفا محسوس ہوتے تھے۔ خاص طور پر گل حسن ان کے نزدیک زیادہ قابلِ صد نفرت تھا۔ وہ اپنی دشمنی ان کے خاندان میں لے آیا تھا اور دشمنی بھی ''ایسے طاقتور دشمنوں سے'' جن کے سامنے پیش جانی بہت مشکل تھی۔

تین چار روز بعد میں گل حسن اور ثمر سے ملا۔ وہ دونوں بے حد افسردہ اور لاچار نظر آتے تھے۔ میں نے ان کی ڈھارس بندھائی اور گل حسن کو مشورہ دیا کہ اس کے لیے یہاں شدید خطرہ ہے۔ وہ مناسب سمجھے تو میں ان دونوں کو کسی محفوظ مقام تک پہنچانے کا بندوبست کر سکتا ہوں۔

وہ افسردگی سے بولا۔ ''کہاں جائیں گے جناب! میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اب بھاگوں گا نہیں۔ موت آنی ہے تو آ ہی جانی ہے۔ کہاں تک پیچھا چھڑاؤں گا اس سے۔ آپ اگر کر سکتے ہیں تو مجھ پر ایک مہربانی کریں مجھے پستول یا رائفل کا لائسنس بنوا دیں۔''

میں نے کہا۔ ''تم آزاد علاقے کے رہائشی ہو۔ یہاں تمہارا لائسنس بننا بہت مشکل ہے۔ بہر طور میں کوشش کروں گا۔''

میں واپس گورداسپور چلا گیا تاہم جانے سے پہلے اپنی طرف سے گل حسن کی حفاظت کا پورا انتظام کر گیا۔ کم از کم دو سفید پوش مسلح کانسٹیبلوں کو ہر وقت گل حسن کے ساتھ رہنا تھا۔ مگر اس طرح کہ وہ خود بھی اس نگرانی سے بے خبر رہے۔ اس کے گھر کے پاس مسلح آدمی تعینات کر دیئے گئے۔ میں چاہتا تھا کہ گورداسپور پہنچ کر ایس پی سے بات کروں اور اس سے پوچھوں کہ اس کے نزدیک اس مسئلے کا کیا حل ہے۔ اور کیا مجرم یونہی دندناتے رہیں گے یا ہم ان پر کسی طرح قابو بھی پا سکتے ہیں؟

میں بلال شاہ کو بھی امرتسر ہی چھوڑ آیا تھا۔ امرتسر رہ کر ایک تو وہ اپنی بیوی کو منا سکتا تھا، دوسرے گل حسن کے حالات پر بھی نگاہ رکھ سکتا تھا۔

بلال شاہ دو ہفتے بعد گورداسپور پہنچا۔ وہ بیوی کے ساتھ ساتھ اہم اطلاعات بھی لایا تھا۔ بیوی کو ”پیغامِ محبت“ تو اس نے رات ہی کو پہنچانا تھا بہر حال مجھے اطلاعات پہنچانے کے لیے وہ دوپہر کو ہی تھانے آ گیا۔ اس نے کہا۔ ”خان صاحب! میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ یوں لگ رہا ہے کہ موسیٰ زئی والوں سے گل حسن کی خفیہ خفیہ کوئی بات ہو گئی ہے۔ یا پھر یہ سارا معاملہ ہی فراڈ ہے۔“

”کیا فراڈ نظر آیا ہے تمہیں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

وہ اپنے بہرے کان میں انگلی گھماتے ہوئے بولا۔ ”کوئی خاص بات تو نہیں ہے جی، لیکن کبھی کبھی کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھیں کہ چھ سات روز تک تو گل حسن بالکل گم صم رہا ہے۔ نہ کہیں آیا گیا ہے نہ کسی سے بات کی ہے۔ مگر کل ایک دم میاں بیوی کے موڈ بدلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ دونوں شاپنگ کے لیے نکلے۔ خوب گھوم پھر کر امرتسر کی سیر کی۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کی نگرانی ہو رہی ہے۔ لہٰذا وہ آزادی سے پھر رہے تھے۔ جس شخص کو ہر گھڑی کسی اندھی گولی کا خطرہ ہو وہ یوں موج میلہ کیسے کر سکتا ہے۔ انہوں نے کمپنی باغ کی سیر کی پھر ”جلیانوالہ“ دیکھنے گئے۔ واپسی پر انہوں نے ہربنس روڈ سے مرغ چھولے کھائے اور رکشے پر بیٹھ کر نہر کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے واپس گھر پہنچے۔ یہ ساری باتیں مجھے کانسٹیبل قدرت اللہ نے بتائی ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اس میں کوئی ایسی عجیب بات تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے گل حسن بیوی کا غم غلط کرنے کے لیے اسے گھمانے پھرانے لے گیا ہو۔ آخر کسی کے سوگ میں کوئی کب تک گھر میں بند رہ سکتا ہے۔“

بلال شاہ بولا۔ ”جناب! بات سوگ کی نہیں، ڈر خوف کی ہے۔ قدرت اللہ کہہ رہا تھا کہ

وہ دونوں بالکل بے خوف ہو کر گھوم پھر رہے تھے۔ اور اس کا اندازہ تھا کہ وہ آج پھر نکلیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”چلو جو بھی ہے۔ مجھے پرسوں ایک کام سے امرتسر جانا ہے۔ گل حسن سے بھی مل کر آؤں گا۔“

☆======☆======☆

میں دوپہر کے بعد فارغ ہوا اور امرتسر کے بڑے تھانے سے سیدھا ”چڑے والا چوک“ پہنچا۔ گل حسن گھر میں تھا۔ میری دستک پر اس نے دروازہ کھولا۔ وہ صاف ستھرے کپڑوں میں تھا۔ شیو بنی ہوئی تھی۔ سر کے بالوں میں خوشبودار تیل لگا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا سا چونکا۔ پھر جلدی سے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ کسی اندرونی کمرے سے ریڈیو بجنے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔

گل حسن نے جلدی سے اندر جا کر پہلے ریڈیو بند کیا، پھر میرے لیے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر لے گیا۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے پوچھا۔ ”بڑے تیار شیار ہو۔ کہیں گئے ہوئے تھے۔“

وہ بولا۔ ”ہاں جی! بڑی عید آ رہی ہے ناں۔ میری گھر والی نے اور تو کوئی تیاری نہیں کی۔ بس ایک جوڑا رنگنے کے لیے دیا ہوا تھا وہ لینے بازار گئے تھے۔“

میں نے ذرا تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا بات ہے۔ آج کل تم دونوں بازار وغیرہ بہت جا رہے ہو۔ دو تین ہفتے پہلے تک تو تمہیں گھر میں بھی بہت فکر مندی رہتی تھی۔“

میرے لہجے نے اسے ٹھٹکا دیا۔ اس نے بڑے غور سے میری آنکھوں میں دیکھا۔ پھر ایک دم اس کے چہرے سے بشاشت رخصت ہو گئی اور وہ رنجیدہ نظر آنے لگا۔ اتنا رنجیدہ کہ میں حیران رہ گیا۔ مجھے لگا کہ ابھی اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئیں گے۔ وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔ ”شاید...... آپ...... مجھ پر کسی طرح کا شک کر رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”شک کی بات نہیں۔ جو سوال میرے ذہن میں ابھرا ہے میں نے اس کا جواب تم سے مانگا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ میں دل سے تمہاری بہتری چاہتا ہوں......“

گل حسن کچھ دیر خاموش رہا۔ لگتا تھا شدید تذبذب میں ہے۔ پھر وہ اٹھا اور اس نے بیوی کو پشتو میں کچھ کہنے کے بعد بیٹھک کا دروازہ اندر سے اچھی طرح بند کر دیا۔ میرے سامنے بیٹھ کر بے حد بوجھل اور تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ ”انسپکٹر صاحب! میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ اسے آپ اپنے تک ہی رکھیں گے۔“

میں نے کہا۔ ’’میں تمہاری امید پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔‘‘

وہ بولا۔ ’’جناب پچھلے ہفتے کے شروع میں، میں ملک بخت خاں سے ملنے گیا تھا۔‘‘

’’یہ ملک بخت کون ہے؟‘‘ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

موسیٰ زئی قبیلے کا چھوٹا سردار ہے۔ وہ یہاں امرتسر میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ پندرہ بیس بندے بھی ہیں۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ وہ یہاں کیوں آئے ہوئے ہیں۔ ان کا ایک ہی مقصد ہے۔ جس طرح بھی ہو جلد سے جلد میرا کام تمام کریں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’لیکن تم ان سے ملنے کیوں چلے گئے۔ اور تمہیں پتہ کیسے چلا کہ ملک بخت کہاں ہے؟‘‘

وہ بولا۔ ’’مجھے ایک خاص بندے کی زبانی پتہ چلا تھا کہ ملک بخت فلاں ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے..... اور اس سے ملنے میں اس واسطے گیا تھا کہ اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ یہ بات اب طے ہے کہ وہ لوگ میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ اگر میرا قبیلہ میرا ساتھ دیتا تو پھر اور بات تھی، لیکن اب مجھے گھیر کر مار لینا ان کے لیے کوئی مشکل بات نہیں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے کہ خواہ مخواہ بھاگے پھرنے اور اپنے ساتھ ساتھ ’’گھر والی‘‘ کی زندگی بھی خطرے میں ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے ملک بخت سے کہا تھا کہ دیکھو میں چل کر تمہارے پاس آگیا ہوں اس لیے اس بات پر بھی یقین رکھو کہ میں اپنے وعدے کا پاس کروں گا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ٹھیک ایک ماہ بعد خود کو تمہارے حوالے کر دوں گا..... ملک بخت نے میری بات مان لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگلے پندرہ بیس دن تک مجھے اپنے دشمنوں کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ میرے ارد گرد موجود ہوں لیکن مہلت ختم ہونے تک وہ مجھے کہیں گے کچھ نہیں۔‘‘

میں نے دیکھا گل حسن کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہیں۔ وہ بولا۔ ’’انسپکٹر صاحب! آپ کو اندازہ نہیں کہ قبائلی دشمنی کتنی خطرناک ہوتی ہے۔ اس معاملے میں بالکل جنونی ہوتے ہیں ہم لوگ۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علاقے میں بے شمار ہتھیار اور گولہ بارود ہونے کے باوجود بہت کم قتل ہوتے ہیں۔ لوگ جانتے ہیں کہ کسی کو نقصان پہنچا کر وہ خود بھی بچ نہیں سکیں گے..... میں بھی یہ بات اچھی طرح جانتا تھا اور میں ایسا بندہ نہیں تھا کہ کسی کی جان لیتا۔ پتہ نہیں قدرت کو کیا منظور تھا کہ میرے ہاتھوں یہ کام ہو گیا۔‘‘

وہ اپنے کیے پر بہت پشیمان نظر آ رہا تھا۔ یقیناً اس کا یہ خیال تھا کہ جو چھ دوسری جانیں گئی ہیں، ان کا سبب بھی وہ خود ہے۔ بیٹھک میں کچھ دیر گھمبیر خاموشی طاری رہی۔ پھر میں

نے کہا۔ ’’تمہارا کیا خیال ہے۔ ان پندرہ بیس دنوں میں حالات بہتر ہو جائیں گے؟‘‘

’’سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!‘‘ اس نے کہا۔ ’’اور میں نے یہ مہلت اس امید پر لی بھی نہیں۔ میں..... میں چاہتا تھا کہ.....‘‘ ایک دم اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے آنکھیں پھیلا کر آنسو پیتے ہوئے کہا۔ ’’جب سے بیاہ ہوا ہے میں نے بیوی کو ایک دن کے لیے بھی خوش نہیں دیکھا۔ جس دن سے میرے پلے بندھی ہے۔ وہ روتی ہی رہی ہے۔ میں اس کے آنسو پونچھنا چاہتا ہوں۔ یہ چاہتا ہوں کہ جہاں اسے اتنے دن روتے دیکھا ہے، چند دن خوش بھی دیکھ لوں اور پھر.....‘‘

اچانک وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ جیسے روانی میں کوئی ایسی بات اس کے منہ سے نکلنے لگی تھی جو وہ نہیں نکالنا چاہتا۔ میں نے اس کے چہرے پر حیا کی مدھم سرخی پھیلتے دیکھی۔

’’کیا بات ہے۔ چپ کیوں ہو گئے؟‘‘ میں نے اسے کریدتے ہوئے پوچھا۔

وہ نگاہیں جھکائے ہوئے بولا۔ ’’آٹھ دس روز میں مجھے پتہ چل جائے گا کہ میری بیوی امید سے ہے یا نہیں.....‘‘

ایک دم مجھے اس نوجوان پر شدت سے ترس آنے لگا۔ وہ اس پرندے کی طرح تھا جسے عین بہار میں چمن چھوڑنے کا حکم مل رہا تھا۔ ایک پردیسی کی طرح وہ ہر شے کو اوپری نگاہ سے دیکھنے پر مجبور تھا۔ میں اس کا درد اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ ہر انسان کی طرح اس کی خواہش تھی کہ اس دنیا میں اس کا نام ونشان باقی رہے۔ وہ مر بھی جائے تو کوئی اس کا نام لینے والا یہاں ہو۔ خود کو اپنے قاتلوں کے حوالے کرنے سے پہلے وہ اپنی بیوی کو ’’امید‘‘ سے دیکھنا چاہتا تھا اور اگر اس کی خواہش پوری ہو جاتی تو شاید موت کا غم اس کے لیے آدھا رہ جاتا.....

اب تمام صورتِ حال میرے سامنے کھل گئی تھی۔ وہ تفریح جو گل حسن کر رہا تھا، تفریح نہیں تھی۔ وہ جشنِ مرگ تھا۔ وہ ایک ٹمٹماتے چراغ کی آخری لو تھی۔ میں نے گل حسن سے پوچھا۔ ’’تمہاری بیوی یہ نہیں کہتی کہ باہر گھومنے پھرنے میں تمہارے لیے خطرہ ہے۔‘‘

وہ بولا۔ ’’میں نے اس سے جھوٹ بول رکھا ہے..... اسے کہا ہے کہ ملک بخت سے میری بات ہو گئی ہے اور امید ہے کہ صلح صفائی ہو جائے گی۔‘‘

’’اور تمہاری بیوی نے یقین کر لیا ہے؟‘‘

’’یقین کا تو پتہ نہیں جی..... لیکن وہ پہلے کی طرح پریشان نہیں رہی۔ اب اس کی طبیعت بھی کافی بہتر ہے۔‘‘

میں نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور گل حسن کی آنکھوں

میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت اس بے چاری کی طبیعت کا کیا بنے گا جب وہ شام کو دہلیز پر بیٹھ کر تمہارا انتظار کرے گی اور پھر اسے پتہ چلے گا کہ تمہاری خون میں لت پت لاش فلاں چوراہے میں پڑی ہے۔''

گل حسن نے سر جھکا لیا۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اور حقیقت میں یہ سوال اس سے پوچھا ہی نہیں جانا چاہیے تھا۔ یہ سوال مجھ سے پوچھا جانا چاہیے تھا اور ہر اس شخص سے پوچھا جانا چاہیے تھا جو قانون کی بالادستی کا ذمے دار تھا...... وہیں بیٹھے بیٹھے چند سیکنڈ کے اندر اندر میں نے فیصلہ کیا کہ میں گل حسن کی جان بچانے کے لیے موسیٰ زئی والوں سے ملوں گا۔

میں نے گل حسن سے پوچھا۔ ''ملک بخت اب کہاں ہے؟''

وہ بولا۔ ''مجھے ٹھیک طرح معلوم نہیں۔ اس سے میری ملاقات ہری سنگھ ہوٹل کے پندرہ نمبر کمرے میں ہوئی تھی لیکن اس کے بعد وہ ہوٹل چھوڑ گیا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کسی اور سے اس کا پتہ چل سکتا ہے؟''

''بہت مشکل ہے جی!'' گل حسن نے کہا۔ ''وہ لوگ پوری طرح چوکس ہیں...... اور جناب...... میری ایک درخواست بھی ہے آپ سے...... آپ اس معاملے میں نہ پڑیں۔ کوئی فائدہ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ آپ اپنی جان بھی خطرے میں ڈالیں گے۔''

میں نے تھوڑی دیر گل حسن سے اس موضوع پر گفتگو کی اور اندازہ لگایا کہ وہ مجھے ملک بخت وغیرہ سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ اور عین ممکن تھا کہ اسے ملک بخت کے نئے ٹھکانے کا پتہ بھی نہ ہو۔

حوالاتی نصیب خان ایک ایسا شخص تھا جس کے ذریعے میں موسیٰ زئی کے لوگوں تک پہنچ سکتا تھا لیکن اس کے لیے حکمتِ عملی کی ضرورت تھی۔ سختی سے یہ مسئلہ حل ہونے والا نہیں تھا۔ سوچ بچار کے بعد میں نے نصیب خاں کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا لیکن اس طرح سے کہ نصیب خان کو اصل بات کا پتہ نہ چلے۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ اسے رہا کیا گیا ہے بلکہ یہ خیال کرے کہ وہ تھانے سے نکل بھاگا ہے۔

دو روز بعد بڑی عید تھی۔ جس تھانے میں نصیب خاں کو رکھا گیا تھا اس کا زیادہ تر عملہ چھٹی پر جا چکا تھا جو چند ایک رہ گئے تھے ان میں سے بھی دو تین عید کی رات کو چلے گئے۔ میرے پروگرام پر عملدر آمد کے لیے یہ موقع بہت مناسب تھا۔ لاک اَپ میں نصیب خان کے علاوہ کوئی حوالاتی نہیں تھا۔ میں نے سنتری کو حکم دیا کہ وہ شام کے بعد لاک اَپ کو تالہ لگانا

''بھول'' جائے۔

مجھے یقین تھا کہ نصیب خان کتنا بھی سیدھا سادا ہے، پنجرہ کھلا دیکھ کر اُڑنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ میں نے اس کے تعاقب کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔

ہم نے جو جال بچھایا تھا اس میں پاؤں رکھنے میں نصیب خان نے کافی دیر لگائی بہر حال ہمیں مایوس نہیں کیا۔ رات دس بجے کے قریب اس نے سنتری کو دبی دبی آوازیں دیں پھر لاک اَپ سے نکلا اور دیوار کے سائے سائے چلتا تھانے کے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ غالباً اس نے سوچا تھا کہ جب سارا تھانہ ہی عید منانے میں مصروف ہے تو وہ کیوں اس ''خوشی'' سے محروم رہے۔

میں سادہ کپڑوں یعنی شلوار قمیص میں تھا۔ اوپر گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔ اس دور کے رواج کے مطابق سر پر گول گرم ٹوپی تھی۔ اسکوٹر پر سوار ہو کر میں نصیب خان کے پیچھے گیا۔ نصیب خان نے ''لونگاں والی کھوئی'' تک دو ڈھائی فرلانگ کا فاصلہ بڑی تیزی سے طے کیا۔ پھر ایک تنگ گلی میں گھس گیا اور عام رفتار سے چلنے لگا۔ میں بھی پیدل ہو گیا اور اسکوٹر کو ساتھ کھینچتا اس کے پیچھے چلنے لگا۔ نصیب خان گاہے گاہے مڑ کر دیکھ لیتا لیکن گلی میں چونکہ چہل پہل تھی لہٰذا اسے شک ہونے کا چانس بہت کم تھا۔

اگلے چوک میں پہنچتے ہی وہ ایک بس پر سوار ہو گیا اور الگو ینڈر گراؤنڈ کے علاقے میں پہنچ گیا۔ یہاں ایک چھوٹی سی گلی میں صرف کابلی پٹھانوں کے گھر تھے۔ اس کے علاوہ لکڑی کے چند ٹال اور کوئلے کے گودام بھی تھے۔ جب نصیب خان بس سے اُتر کر اس علاقے میں پہنچا تو مجھے بے حد محتاط ہونا پڑا۔ میں نے اسکوٹر ایک زیر تعمیر مکان کے سامنے کھڑا کیا اور پیدل ہی نصیب خان کے پیچھے چل دیا...... قریباً ایک فرلانگ چلنے کے بعد نصیب خان لکڑی کے ایک ٹال میں داخل ہو کر میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ ٹال کے سامنے سے گزرتے ہوئے، میں نے اچھی طرح اس جگہ کا جائزہ لیا۔ وہ ایک بہت بڑا ٹال تھا۔ دو تین کینال جگہ ہو گی۔ بلندی تک لکڑی کے ڈھیر لگے تھے۔

ٹال سے چالیس پچاس گز آگے جا کر میں ایک ٹی اسٹال پر رک گیا۔ ٹی اسٹال کا مالک بھی کابلی تھا لیکن کسی پیدائشی سکھ کی طرح پنجابی بولتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ سامنے والا ٹال کس کا ہے؟ اس نے کسی حاجی مرجان کا نام لیا۔

میں نے پوچھا کہ حاجی مرجان اس وقت کہاں ہو گا۔

جب ٹی اسٹال کا کوتاہ قد مالک میرے اس سوال کا جواب دے رہا تھا، اچانک پیچھے

سے دو افراد نمودار ہوئے اور میرے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ دونوں کابلی تھے اور انہوں نے گرم چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ ایک شخص جس کا رنگ سرخ و سپید تھا تیکھے لہجے میں بولا۔
"تم کو لالہ بلاتا ہے۔"

"کون لالہ؟" میں نے اپنی اندرونی پریشانی کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔ وہ بولا
"امارے ساتھ آؤ...... ام تم کو بتاتا ہے۔" میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اس شخص کا لہجہ خطرناک تھا۔ یہ لہجہ بتا رہا تھا کہ مجھ سے درخواست نہیں کی جا رہی بلکہ حکم دیا جا رہا ہے اور حکم دینے والوں نے حکم پر عمل کروانے کے لیے ضروری انتظام بھی کر رکھا ہے۔ یقینی بات تھی کہ گرم چادروں کے نیچے آتشیں ہتھیار موجود تھے۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ تن تنہا اس بستی میں آ کر میں نے غلطی کی ہے۔ نصیب خان اتنا بے خبر نہیں تھا جتنا میں نے اسے سمجھ لیا تھا۔ وہ راستے میں تعاقب سے خبردار ہو گیا تھا اور اب اس کی نشان دہی پر چادر پوش قبائلی میری "خبر" لینے پہنچ گئے تھے۔ میں نے چند لمحے سوچا اور پھر دونوں افراد کے ساتھ چل دیا۔

وہ مجھے اپنے درمیان لے کر حاجی مرجان کے تال میں داخل ہوئے اور لکڑیوں کے بڑے بڑے انباروں سے گزار کر نیچی چھت والے ایک کشادہ کمرے میں لے آئے۔ اس کمرے میں ایک بڑی انگیٹھی دہک رہی تھی اور اس کے دھوئیں سے کمرے کی چھت سیاہ نظر آ رہی تھی۔ اس نیم تاریک کمرے میں چار افراد مزید موجود تھے۔ وہ سب بڑی بڑی پگڑیوں والے قبائلی تھے۔ ان میں سے دو تین کی ڈاڑھیاں بھی تھیں۔ وہ سب خشمگیں نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جونہی میں اندر داخل ہوا، انہوں نے آپس میں کھسر پھسر کی۔ اس کے بعد تین افراد وہاں سے رخصت ہو گئے اور باہر کھڑی ٹیکسی میں بیٹھ کر کہیں چلے گئے۔ کمرے میں اب تین افراد رہ گئے تھے۔

موٹی گردن اور بارعب چہرے والے ایک قبائلی نے مجھ سے کہا۔ "پولیس کا آدمی ہے تم؟"

میں نے کہا۔ "اگر میں کہوں 'ہاں' تو پھر؟"

اس نے ایک دم چادر کے اندر سے کوئی دو فٹ لمبا چھرا نکال لیا۔ کچھ عجیب سی بناوٹ تھی اس چھرے کی۔ کچھ کچھ کرپان جیسا اور کچھ تلوار جیسا۔ قبائلی بے حد خونخوار لہجے میں بولا۔
"ام جو پوچھتا ہے اس کا سیدھا سیدھا جواب دو ورنہ ابھی مار کر یہاں فرش میں گاڑ دے گا۔ قیامت تک کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ کہاں گیا پولیس والا۔ ام قبائلی ہے پولیس کے باپ کا باپ بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

ایک دم میرا دماغ گھوم گیا۔ کمرے میں اس وقت کل تین آدمی تھے۔ ایک دونوں ہاتھ بغل میں دیئے ایک بغلی دروازے کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ یہ دروازہ ایک اور چھوٹی سی کوٹھڑی میں کھلتا تھا۔ چھرے والا اس شخص کے بالکل قریب موجود تھا۔ میں نے اچانک چھرے والے کو دھکا دیا، وہ دہلیز پر کھڑے شخص سے ٹکرایا اور دونوں کوٹھڑی کے اندر جا گرے۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کوٹھڑی کے دروازے کو تاڑ لیا تھا۔ اس میں باہر کی طرف آہنی کنڈی موجود تھی۔ جونہی دونوں افراد کوٹھڑی میں گرے میں نے لپک کر دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ ایک سیکنڈ کے اندر دونوں افراد کوٹھڑی میں بند ہو چکے تھے۔

تیسرا شخص لپک کر میری طرف آیا، میں نے اس کے سینے پر لات جمائی اور وہ حلق سے بری سی آواز نکالتا ہوا واپس دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کے نیفے میں چھوٹا پسٹل تھا۔ پسٹل نکالنے کے لیے اس نے پیٹ سے قمیص اوپر اٹھائی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے اس سے کہیں پہلے اپنا ۳۸ بور ریوالور ہاتھ میں لے لیا تھا۔ "خبردار" میں نے بازو سیدھا کر کے مدمقابل کو نشانے پر لے لیا۔ وہ ذرا ٹھٹکا تو میں نے دو قدم چل کر ریوالور کی سیاہ نال اس کی کنپٹی سے لگا دی۔ اس کا سرخ و سپید رنگ ایک دم برف کی مانند سفید ہو گیا۔

اندر پھنس جانے والے افراد زور شور سے دروازہ پیٹ رہے تھے اور پشتو میں پتہ نہیں کیا واویلا کر رہے تھے۔ باہر رہ جانے والا شخص جسے میں نے ریوالور کے نشانے پر رکھ لیا تھا ان دونوں سے زیادہ تجربہ کار اور بارعب دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی بے حد گہری آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔ "پولیس کو اتنا بھی کمزور مت سمجھو خان! میں چاہوں تو تمہیں بھی یہاں کسی کمرے میں بند کر دوں اور ایک ٹیلیفون کر کے دو درجن پولیس والے یہاں بلا لوں لیکن میں یہاں مار دھاڑ کے لیے نہیں، بات چیت کے لیے آیا ہوں۔ بے شک دو ہفتے پہلے میرے تھانے کی حدود میں قتل ہو چکا ہے لیکن میں کسی کو گرفتار کرنا نہیں چاہتا اور نہ پوچھ کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر کس لیے آیا ہے یہاں؟" بارعب قبائلی نے پوچھا۔

"یہ جھگڑا ختم کرنے کے لیے...... میں ملک بخت سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کون ملک بخت؟" قبائلی نے لاپرواہی سے پوچھا۔

میں نے ریوالور نیچے جھکا کر ہولسٹر میں رکھ لیا۔ اور آگے بڑھ کر کوٹھڑی کا دروازہ بھی کھول دیا۔ دونوں بپھرے ہوئے قبائلی باہر نکل آئے۔ ایک کے ہاتھ میں رائفل اور دوسرے

کے ہاتھ میں چھرا نظر آ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو یوں لگا کہ وہ مجھ پر جھپٹ پڑیں گے لیکن پھر صورت حال دیکھ کر وہ ذرا ٹھنڈے پڑ گئے۔ میں نے بارعب شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''خان! مجھے پولیس والا مت سمجھو۔ میں ایک خیر خواہ کی حیثیت سے تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ اور زیادہ وقت بھی نہیں لوں گا تمہارا۔ صرف چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

بارعب شخص کے چہرے پر کشمکش کے آثار نظر آئے۔ پھر وہ چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''بیٹھو!''

میں بیٹھ گیا۔ رائفل بردار نے اپنی رائفل ایک طرف رکھ دی۔ چھرا بردار نے بھی چھرا چادر کے نیچے چھپا لیا تاہم وہ ابھی تک مجھے خونی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بارعب شخص بولا۔ ''ام کو یقین ہے کہ تم پولیس والا ہے کیونکہ تم نصیب خان کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آیا ہے...... امارا بات پتہ نہیں تمہاری سمجھ میں آئے یا نہیں لیکن ام بتانا اپنا فرض سمجھتا ہے، جس طرح تم لوگوں کا قانون ہے، اس طرح امارا بھی قانون ہے اور امارے قانون کے مطابق ابراہیم خان کا داماد قتل کا مجرم ہے۔ ام نے اس کو مارنا ہے اور ہر صورت میں مارنا ہے...... ہاں اس بات کا ام تم سے وعدہ کرتا ہے کہ اسے یہاں نہیں مارے گا۔ اس نے ام سے کچھ دن کا مہلت لے رکھا ہے، جب مہلت ختم ہو جائے گا ام اس کو پکڑ کر اپنے وطن لے جائے گا...... اور وہاں جا کر اسے گولی مارے گا۔ امارا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ اس لیے ام تم کو یہ برادرانہ مشورہ دیتا ہے کہ اس معاملے سے نکل جاؤ۔ کوئی فائدہ نہیں ہے کہ تم اس معاملے میں پڑنے کا......''

میں نے کہا۔ ''تم بخت خان ہو؟''

وہ بولا۔ ''نہیں۔ بخت خان امارا بڑا بھائی ہے لیکن تم جو اس سے کہنا چاہتا ہے وہ مجھ سے کہہ سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھو خان صاحب! قبائلی قانون کا تھوڑا بہت مجھے بھی پتہ ہے۔ اکثر قبیلوں میں خون کا بدلہ خون ہوتا ہے...... لیکن آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ ایک شخص کے بدلے آپ ابراہیم کا پورا کنبہ اجاڑ چکے ہیں، یہاں تک کہ وہ خود بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ کیا اب بھی آپ لوگوں کے نزدیک انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوئے؟ میرے خیال میں تو......''

اچانک مجھے چپ ہونا پڑا۔ کمرے میں موجود قبائلی بھی چونک کر دروازے کی طرف

دیکھنے لگے۔ اک عورت زور سے چیخی تھی۔ پھر دروازہ دھماکے سے کھلا اور چیخنے والی اندر آ گئی۔ میں حیران رہ گیا۔ وہ ایک جاذب نظر فیشن ایبل لڑکی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے، دوپٹہ بازو پر جھول رہا تھا۔ اور ایک پاؤں جوتی کے بغیر تھا۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے جھاڑ جھنکار ڈاڑھی والا ایک قبائلی اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹا رسہ تھا جسے اس نے دوہرا کر کے بل دے رکھے تھے۔ قبائلی نے یہ رسہ بالکل کوڑے کی طرح تھام رکھا تھا۔ لڑکی نے خوفزدہ نگاہوں سے ہم چاروں کو دیکھا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر چلانے لگی۔ ''بھگوان کے لیے مجھے اس سے بچاؤ۔ بھگوان کے لیے رحم کرو......''

اچانک میں نے لڑکی کو پہچان لیا۔ وہ ایک مشہور ہندی اخبار کی رپورٹر تھی۔

مجھے یاد آیا کہ اس کا نام کملا سنہا ہے۔ کملا کی قمیص اور جرسی کندھے سے پھٹی ہوئی تھی۔

اس کی نرم و نازک جلد پر رسے کا ابھرا ہوا سرخ نشان نظر آ رہا تھا۔ ایسا ہی ایک نشان اس کی کلائی اور گردن پر بھی تھا۔ لگتا تھا جھاڑ جھنکار داڑھی والے قبائلی نے لڑکی کو بری طرح پیٹا ہے۔

بارعب قبائلی نے جلدی سے آگے بڑھ کر کملا کو کوڑا بردار قبائلی سے بچایا۔ کوڑا بردار کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا اور وہ اجنبی زبان میں لڑکی کو جانے کیا کیا دھمکیاں دے رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''خان! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اس اخبار والی کو کیوں مار رہے ہو تم؟''

قبائلی نے میری بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے کوڑا بردار سے کچھ کہا اور وہ منہ میں بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔ کملا جان گئی تھی کہ میں پنجابی ہوں۔ وہ بھاگ کر آئی اور میرا بازو پکڑ لیا۔ روتے ہوئے بولی۔ ''بھگوان کے لیے بھائی صاحب! مجھے ان سے بچا لو۔ یہ مجھے مار دیں گے۔''

بارعب شخص نے کمرے کا ایک بغلی دروازہ کھولا۔ یہ بھی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ مشکل سے چھ ضرب چھ کا ہو گا۔ یہاں ایک چارپائی پر چند میلے کچیلے لحاف پڑے تھے اور دیواروں سے بدبودار کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ بارعب شخص نے لڑکی سے کہا کہ وہ اس کمرے میں آ کر بیٹھ جائے۔ یہاں اسے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ بارعب شخص کا لہجہ نرم تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا لیکن کملا سہمی ہوئی تھی اور بے اختیار میری بغل میں گھستی چلی جا رہی تھی۔ وہ گداز جسم کی خوش شکل لڑکی تھی۔ شاید عام حالات میں وہ یوں کسی اجنبی مرد کو تھامنے اور اس کے ساتھ لپٹنے کا تصور بھی نہ کرتی لیکن خوف نے اسے حواس باختہ کر رکھا تھا۔ بارعب شخص نے کملا کو کھینچ کر مجھ سے علیحدہ کیا اور بمشکل ساتھ والے کمرے میں بھیجا۔ جب وہ کمرے میں

چلی گئی تو اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

ہم ایک بار پھر انگیٹھی کے اردگرد آ بیٹھے۔ میں نے بارعب شخص سے کہا۔ ''اس لڑکی سے ایسا سلوک کیوں کر رہے ہو تم؟''

وہ بولا۔ ''اس میں سارا قصور اس لڑکی کا ہے۔ یہ لڑکی امارا جاسوسی کرتا پھرتا تھا۔ کل دوپہر یہ امارے پاس آیا تھا اس کے پاس ایک کیمرہ بھی تھا۔ ام سے کہتا تھا کہ ام اخبار میں کوئی مضمون وغیرہ لکھتا ہے۔ آپ کے ٹال کا فوٹو آئے گا اور ام یہ بھی لکھے گا کہ آپ لکڑی کہاں سے لاتا ہے۔ اسے کیسے خشک کرتا ہے اور کیسے کاٹتا واٹتا ہے...... ام نے سمجھا شاید یہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔ جو یہ پوچھتا رہا ام اس کو بتاتا رہا۔ اتنے میں وہ بندہ آ گیا جو تمہارے آنے سے پہلے یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بولا کہ یہ لڑکی بالکل فراڈ ہے۔ یہ ملک بخت خان کا کھوج لگاتا پھرتا ہے اور اس سے پہلے بھی ایک دو ٹالوں پر جا چکا ہے۔ بس پھر امارے لیے ضروری ہو گیا کہ اس کو پکڑ لیں۔ ام نمازی آدمی ہے۔ غیر عورت پر بُری نظر ڈالنا بھی گناہ سمجھتا ہے لیکن اگر کوئی ام سے دھوکا کرے تو ام اس کو معاف نہیں کرتا ہے۔ ام اس لڑکی کو اس وقت تک نہیں چھوڑے گا جب تک ام واپس اپنے علاقے میں نہیں پہنچ جاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''خان صاحب۔ عورت کی عزت بڑی نازک شے ہوتی ہے جو عورت ایک رات بھی کہیں گم رہے لوگ اس پر شک کرنے لگتے ہیں۔ اگر یہ لڑکی دس پندرہ یا بیس پچیس روز آپ کے پاس رہی تو اس کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ میں تو حیران ہوں کہ اب تک اس کے بارے میں پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی گئی اور اخباروں میں اس کی گمشدگی کا شور کیوں نہیں مچا۔''

بارعب شخص بولا۔ ''ام خود بھی اس کو اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا۔ کوئی شوق نہیں ہے ام کو ایسی مصیبت پالنے کا، لیکن ام اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔ چھوڑے گا تو یہ امارے خلاف رپٹ درج کرائے گا۔ پورے شہر کی پولیس امارے پیچھے لگا دے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اگر میں ضمانت دوں کہ یہ ایسا نہیں کرے گی اور پولیس بھی تمہارے پیچھے نہیں لگے گی تو پھر؟''

''پھر بھی ام کچھ نہیں کر سکتا۔ ملک بخت کی اجازت کے بغیر اب اس لڑکی کو چھوڑنا امارے بس کا بات نہیں ہے۔''

میں نے اس بارے میں بارعب شخص سے کھل کر بات چیت کی۔ بارعب شخص نے اپنا نام سعد خاں بتایا۔ وہ شکل وصورت سے نیک بندہ نظر آتا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی طرح غصہ تو

اس میں بھی بہت تھا تاہم وہ کسی کی بات سننے اور سمجھنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ لڑکی کو چھوڑ دے، میں اس کی طرف سے اخبار والوں کی طرف سے اور پولیس کی طرف سے ہر طرح کی ضمانت دینے کو تیار ہوں۔

سعد خاں نے اپنے ساتھیوں سے طویل صلاح مشورہ کیا اور آخر اس شرط پر راضی ہو گیا کہ لڑکی آج کی رات ان کے پاس ہی رہے گی۔ وہ اپنے سردار ملک بخت سے اجازت لینے کے بعد کل دوپہر تک اسے رہا کر دیں گے۔

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ قبائلی بے حد سخت مزاج ہونے کے باوجود بدکار نہیں ہیں اور کملا کی عزت ان کے پاس محفوظ رہے گی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ کملا کے ساتھ مار پیٹ بھی نہ کرتے لیکن چونکہ اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اس لیے وہ غضب ناک ہو گئے تھے۔

میں نے سعد خاں سے کہا۔ ''تم نے کافی سخت شرط لگائی ہے۔ ایک پولیس والے کی حیثیت سے تو میں یہ شرط قبول نہیں کر سکتا لیکن ایک دوست کی حیثیت سے گنجائش نکال سکتا ہوں...... میں چاہتا ہوں کہ ہم یہ سارے معاملات صلح صفائی سے طے کریں۔ میری خواہش ہے کہ تم بخت خاں سے میری ایک ملاقات کرا دو۔ اس ملاقات کے لیے تم مجھے جہاں کہو گے میں آ جاؤں گا اور جس جگہ کہو گے پہنچ جاؤں گا۔''

سعد خاں نے کہا۔ ''ام اس بارے میں کل بخت خاں سے بات کر کے تم کو بتائے گا۔''

ساری باتیں طے کر کے اور کملا سنہا نامی اس اخباری رپورٹر کو تسلی وغیرہ دے کر میں رات ایک بجے کے قریب ٹال سے واپس آ گیا۔

اگلے دن سعد خاں وغیرہ نے بارہ بجے کملا کو رہا کرنا تھا لیکن وہ صبح ساڑھے آٹھ بجے ہی تھانے پہنچ گئی۔ وہ گیٹ کے سامنے ایک رکشے سے اُتری تھی۔ اس کے پاؤں ننگے، بال بکھرے ہوئے اور سفید چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

وہ رپورٹ درج کرانے تھانے میں آئی تھی لیکن ایس ایچ او کی کرسی پر مجھے بیٹھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یہ بالکل فلمی طرز کا ڈرامہ ہوا تھا۔ ''تو...... تو...... تم، میرا مطلب ہے آپ تھانیدار ہیں'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''بالکل ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن تم اتنی جلدی کیسے؟''

''بہت افسوس کی بات ہے۔'' وہ برہم ہو کر بولی۔ ''ایک تھانیدار ہو کر آپ مجھے ان بدمعاشوں کے رحم وکرم پر چھوڑ آئے۔''

میں نے کہا۔ ''ایسا میں نے مجبوری کے تحت کیا تھا لیکن اس میں رحم وکرم پر چھوڑنے

والی کوئی بات نہیں تھی۔ اگر مجھے ذرا سا بھی شبہ ہوتا کہ تمہیں وہاں کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے تو میں تمہیں ساتھ لے کر آتا...... لیکن...... تم اتنی جلدی کیسے آ گئی ہو؟''

''بھاگ کر آئی ہوں وہاں سے۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ''وہ خبیث...... بخت خاں۔ مجھے چھوڑنے پر رضامند نہیں ہوا تھا۔ میں نے رات سعد خاں اور بخت خاں میں ہونے والی ساری گفتگو سن لی تھی۔ ساری رات میں ایک بند دروازے کے نیچے سے مٹی کھودتی رہی اور پھر اوندھے منہ وہاں سے رینگ کر باہر نکل آئی۔''

میں نے کہا۔ ''بخت خاں کب آیا تھا ٹال پر؟''

وہ بولی۔ ''آنا اس نے کہاں سے تھا، وہ وہیں پر تھا۔ وہ شخص جس نے سرخ جرسی پہن رکھی تھی ملک بخت ہی تو تھا۔ وہ بڑا گم صم اور نچرا شخص ہے۔ دیکھنے والوں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ ایک خونی ٹولے کا سردار ہے۔ جب آپ ٹال سے واپس آ گئے تو ملک بخت اور سعد خاں وغیرہ نے صلاح مشورہ کیا۔ بخت خاں کا خیال تھا کہ آپ ان کو دھوکا دے رہے ہیں۔ جونہی آپ کو پتہ چل گیا کہ ملک بخت کون ہے آپ سب کو گرفتار کر لیں گے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ صبح فجر کی نماز کے فوراً بعد وہ ٹال چھوڑ کر چلے جائیں گے اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے...... بس میں نے فوراً وہاں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ کمرے کی زمین کچی تھی اور دروازے کے نیچے چار پانچ انچ کی درز بھی تھی۔ میں نے چینی کی ایک ٹوٹی ہوئی پلیٹ سے فرش کھودنا شروع کیا اور کھودتے کھودتے اتنی جگہ بنالی کہ دروازے کے نیچے سے رینگ کر نکل سکوں۔''

میں نے کہا۔ ''ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ سعد خاں نے میرے سامنے تمہیں اس چھوٹے سے کمرے میں بند کیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ بڑے کمرے میں جو بات چیت ہو گی وہ تمہارے کانوں تک بھی پہنچ جائے گی۔ اس کے باوجود وہ لوگ بڑے کمرے میں بیٹھ کر مشورے کرتے رہے۔''

کملا سنہا بولی۔ ''جناب تھانیدار صاحب! وہ پشتو میں گفتگو کر رہے تھے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ میں پشتو بول اور سمجھ سکتی ہوں۔ میرا بچپن اور لڑکپن کوہاٹ میں گزرا ہے۔ میں نے کوہاٹ سے بی اے کیا تھا۔ پھر پشاور سے ایم اے کیا۔ پشتو شاعری میں مجھے شروع سے دلچسپی رہی ہے۔ میں نے افغانستان کابل وغیرہ میں رہنے والے ہندوؤں کے بارے میں ایک معلوماتی کتاب بھی لکھ رکھی ہے...... آج کل میں ''سماچار'' میں کام کر رہی ہوں۔''

اس نے مختصر الفاظ میں بڑے اچھے طریقے سے اپنا تعارف کرا دیا تھا۔ میں نے کہا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس بخت خاں والے معاملے سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

وہ بڑی ادا سے بولی۔ ''وہی جو آپ کا ہے۔ جیسے آپ یہ تفتیش کر رہے ہیں کہ آزاد علاقے سے آنے والے قبائلی خودکار ہتھیاروں سے لیس ہو کر امرتسر کے ''چڑے والا چوک'' تک کیسے پہنچے اور کیسے گل حسن کے سسر کو قتل کرنے میں کامیاب ہوئے ایسے ہی مجھے بھی اس معاملے کی جستجو تھی۔ جب مجھے پتہ چلا کہ قاتلوں کا اصل نشانہ گل حسن تھا اور وہ اپنی نوبیاہتا بیوی کے ساتھ قاتلوں سے چھپتا پھرتا ہے تو میرے دل میں آئی کہ میں اس دشمنی کی اصل وجہ معلوم کروں۔ اسی دوران مجھے پتہ چلا کہ قبائلیوں کا سردار ملک بخت نامی شخص ہے۔ میں ملک بخت کو کھوجتی ہوئی الگزینڈر گراؤنڈ کے اس ٹال تک جا پہنچی۔''

میں اس نوجوان اور باہمت پریس رپورٹر کے پختہ ارادے سے متاثر ہوا۔ بے شک وہ ہندو تھی اور مسلمان پولیس والوں سے ہندو اخبار والوں کا رویہ اچھا نہیں ہوتا تھا لیکن میں کملا سنہا کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

میری تھوڑی سے تعریف نے کملا کو اور بھی شیر کر دیا۔ وہ بولی۔ ''نواز خاں صاحب! یہ بات تو یقینی ہے کہ سعد خاں اور ملک بخت اب ٹال پر نہیں رہے ہوں گے۔ ملک بخت اب کہاں ہے؟ یہ بڑا اہم سوال اور اس سوال کا جواب آپ کو صرف اور صرف میں دے سکتی ہوں۔''

''تم کو کیسے معلوم؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھ کو ایسے معلوم کہ میں نے کشٹ اٹھایا ہے۔ وقت صرف کیا ہے۔ تجل خراب ہوئی ہوں۔ پورے چار دن ہو گئے ہیں کہ دفتر سے غیر حاضر ہوں۔ نہ گھر والوں کو کچھ بتا کر آئی ہوں اور نہ دفتر والوں کو۔ اور شاید یہ غلطی ہی تھی میری۔ اگر یہ قبائلی مجھے اٹھا کر لے جاتے تو کسی کو خبر بھی نہ ہوتی کہ کہاں گئی کملا۔''

اس کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خاصے آزاد خیال گھرانے سے ہے اور اپنے کام کے سلسلے میں اکثر گھر سے باہر رہتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اسے قریباً 36 گھنٹے قبائلیوں نے اپنے قبضے میں رکھا تھا اور اس کے باوجود کسی کو پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔

میں نے کہا۔ ''کیا اس ٹال کے علاوہ بھی ملک بخت کا کوئی ٹھکانہ ہے؟''

''ہاں!'' کملا نے اپنے ریشمی بالوں کو انگلیوں سے سنوار کر بڑے اطمینان سے کہا۔

''امرتسر جالندھر روڈ پر دسویں میل کے قریب ایک ٹرک اڈہ ہے۔ یہ اڈہ حاجی بابا کے نام سے

مشہور ہے۔ میں حاجی بابا سے مل چکی ہوں۔ اس کے پاس اکثر پٹھان ڈرائیور آ کر ٹھہرتے ہیں۔ امرتسر آنے کے بعد ملک بخت اور سعد خاں بھی پہلے حاجی بابا کے پاس ہی ٹھہرے تھے۔ میرا من گواہی دے رہا ہے کہ وہ اب اس کے پاس چلے گئے ہیں۔"

کملا سنہا کی اطلاع سو فیصد درست تھی۔ میں نے اپنے دو ہوشیار مخبروں کے ذریعے پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ حاجی بابا کے ڈیرے پر آج دوپہر چند مہمان آئے ہیں اور ان خاص مہمانوں کو ٹھہرانے کے لیے حاجی بابا نے اسپیشل طور پر دو کمرے خالی کرائے ہیں۔

اسی رات قریباً آٹھ بجے میں حاجی بابا کے ڈیرے پر جا پہنچا۔ میں سفید کپڑوں میں تھا اور بالکل خالی ہاتھ تھا۔ حاجی بابا کے ملازم نے پہلے تو مجھے اندر ہی نہیں جانے دیا۔ جب میں نے بطور انسپکٹر تعارف کرایا تو وہ نرم پڑ گیا۔ اس دوران اتفاقاً سعد خاں بھی باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنی چادر کے نیچے سے پستول نکالنے لگا ہے۔ میں نے اس کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں بالکل خالی ہاتھ آیا ہوں سعد خان اور بالکل اکیلا ہوں۔ تمہیں کسی طرح پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

سعد خاں کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر بھاری لہجے میں بولا۔ "وہ لڑکی تو چلا گیا۔ اب کیا چاہتا ہے تم؟"

میں نے کہا۔ "میرا اس لڑکی سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ میں اسے لایا تھا، نہ لے کر گیا ہوں۔ میں تو صرف ملک بخت سے ملنا چاہتا ہوں۔ بس ایک بار ملک سے بات ہو جائے۔ پھر میری راہ الگ تمہاری الگ۔"

وہ کچھ دیر گہری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ کبھی لگتا تھا کہ ایک دم مجھ پر جھپٹ پڑے گا، کبھی پُرسکون نظر آنے لگتا تھا۔ آخر اس نے ایک گہری سانس لی اور حتمی فیصلے پر پہنچ گیا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" اس نے کہا اور واپس مڑ گیا۔

میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ ایک نیم تاریک برآمدے سے گزر کر ہم ایک کشادہ کمرے میں پہنچے۔ یہاں دو تین پٹھان بیٹھے تھے۔ ان میں وہ سرخ جرسی والا بھی تھا جس کے بارے میں کملا نے بتایا تھا کہ وہ ملک بخت ہے۔ ملک بخت کے ہاتھ میں موٹے دانوں کی ایک چھوٹی سی تسبیح تھی۔ اور وہ عادتاً اسے پھیرتا چلا جا رہا تھا۔ بہت غلط استعمال تھا یہ تسبیح کا۔ میں نے اگلے دن پون گھنٹے میں دیکھا کہ ملک بخت کسی سے جھگڑا کرتا تھا یا گالی بھی دیتا تھا تو تسبیح اس کے ہاتھوں میں مسلسل گردش کرتی رہتی تھی۔

سعد خاں اور ملک بخت نے کچھ دیر آپس میں پشتو "ماری"۔ پھر ملک بخت نے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں بولو۔ کیا بات کرنا چاہتا ہے تم؟"

میں نے کہا۔ "ملک بخت! میرا خیال ہے، تھوڑا بہت تو تمہیں سعد خاں نے بتا ہی دیا ہوگا...... میں تم سے گل حسن اور اس کی بیوی ثمر کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن ام ان کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ ام اکبر کے قاتل کا نام بھی تمہاری زبان سے سننا نہیں چاہتا۔ تم شہری لوگ ہو، تمہیں کچھ معلوم نہیں، قبیلے کے رسم و رواج کیا ہوتے ہیں اور جرگے کے فیصلوں کی کیا عزت ہوتی ہے۔ ام نے گل حسن کا جان لینا ہے اور خدا کی قسم لینا ہے۔ چاہے اس کے لیے ام کو اپنا ایک سو جانیں بھی قربان کرنا پڑے۔ اگر تم اپنی مرضی سے یہاں آیا ہے تو یہ تمہارا بیوقوفی ہے اور اگر تم کو گل حسن نے بھیجا ہے تو وہ اپنے حق میں بہت برا کر رہا ہے۔ ام نے اس کو اس لیے مہلت نہیں دیا تھا کہ وہ پولیس والوں کو سفیر بنا بنا کر امارے پاس بھیجے۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں کون کہتا ہے کہ مجھے گل حسن نے بھیجا ہے۔ میں پولیس انسپکٹر ہوں اور اپنے علاقے میں ہونے والا ہر غیر قانونی کام روکنا میرا فرض ہے۔"

وہ بولا۔ "یہاں کوئی غیر قانونی کام نہیں ہو رہا۔ جس جرم کو خود مجرم قبول کر رہا ہے اور خود کو سزا کا حقدار سمجھ رہا ہے اس جرم کی سزا کو تم کیوں غیر قانونی کام سمجھ رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "اس لیے کہ یہ آزاد علاقہ نہیں اور یہاں مجرم کو صرف عدالت سزا دے سکتی ہے۔"

کافی دیر ہم دونوں میں بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ ایک دو بار تلخی تک بھی نوبت آئی۔ ملک بخت گل حسن کے بارے میں کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں زیادہ سے زیادہ اسے پھانسی ہی چڑھا سکتا ہوں سو چڑھا دوں لیکن اس سے گل حسن کی جان نہیں بچے گی۔ وہ بولا۔ "دیکھو انسپکٹر! تم چل کر امارے پاس آیا ہے۔ تم اس وقت امارے مہمان کی طرح ہے۔ اس لیے ام تم سے کسی طرح کا دشمنی نہیں کر سکتا۔ ورنہ کوئی اس طرح امارے سامنے اس قاتل کا حمایت کرتا تو زندہ واپس نہ جاتا۔ امارا صبر اب ختم ہوتا جا رہا ہے اس لیے بہتر ہے کہ تم یہاں سے چلا جائے۔"

صبر میرا بھی ختم ہوتا جا رہا تھا، لہٰذا میں نے بہتر سمجھا کہ یہاں سے اٹھ ہی جاؤں۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے بخت خاں! اب تم سے جب ملاقات ہوگی، کسی اور ڈھنگ سے ہوگی۔"

میں ٹرک اڈے سے باہر نکلا تو دس بج چکے تھے۔ ہر طرف یخ بستہ تاریکی کا راج تھا۔
اڈے کے سامنے سے گزرنے والی سڑک بھی سنسان نظر آرہی تھی۔ ایکا ایکی میرے دل میں ایک اندیشہ سا جاگ اٹھا۔ بعض قبائلی بڑے کٹر مزاج ہوتے ہیں۔ جانی دشمن بھی گھر میں آجائے تو اس کو مہمان سمجھتے ہیں لیکن جونہی "مہمان" گھر سے نکلا ٹھائیں سے گولی داغ دی۔ میں بھی ٹرک اڈے سے نکل آیا تھا۔ کیا خبر کسی قبائلی کا دماغ الٹ جاتا۔ کوئی سواری بھی نہیں تھی میرے پاس۔ بڑی سڑک تک پیدل ہی جانا تھا۔ دفعتاً ایک چھوٹی سی کار لہراتی ہوئی آئی اور عین میرے سامنے آن رکی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ اس میں کملا سنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ بڑی ادا سے مسکرا کر بولی۔ "مجھے پتہ تھا، آپ کو میری ضرورت پڑے گی۔ کہیے غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں۔"

میں دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ "بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن اس وقت تن تنہا تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اب کی بار ملک بخت وغیرہ نے تمہیں پکڑ لیا تو کوئی "رعایت" نہیں کریں گے۔"

وہ بولی۔ "اس سنسان راستے پر وہ آپ کے پیچھے پڑ جاتے تو رعایت انہوں نے آپ سے بھی نہیں کرنی تھی۔" اس کے ساتھ ہی اس نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔
شہر کی حدود میں داخل ہونے کے بعد میں نے ایک جگہ کملا کو گاڑی روکنے کا کہا۔
"کیوں خیریت ہے؟" وہ مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ہر وقت ایک تجسس سا کروٹیں لیتا رہتا تھا۔
میں نے کہا۔ "خیریت نہیں ہے۔" وہ سرتاپا سوال بن گئی۔ میں نے اسے بتایا۔ "ملک بخت بہت ڈھیٹ آدمی قسم کا آدمی ہے۔ وہ گل حسن کو کسی طرح کی رعایت دینے کو تیار نہیں۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ جو رعایت اس نے دے رکھی تھی وہ واپس لے لے گا۔"
"کیا مطلب؟" کملا نے پوچھا۔
"گل حسن نے ملک بخت سے چند ہفتوں کی مہلت مانگ رکھی ہے۔ غالباً وہ چاہتا ہے کہ خود کو ملک کے حوالے کرنے سے پہلے اپنی بیوی کا کوئی انتظام کر جائے وہ اسے بے سہارا چھوڑنا نہیں چاہتا۔"
میں نے اصلی بات کملا کو نہیں بتائی اور نہ ہی میں بتا سکتا تھا۔ درحقیقت گل حسن نے اپنے قاتلوں سے جو مہلت مانگی تھی وہ اپنے "نام ونشان" کے لیے تھی۔ اس کی آرزو تھی کہ خود کو اپنے دشمنوں کے حوالے کرنے سے پہلے اسے یہ اطمینان ہو کہ اس کی بیوی کے بطن میں

اس کی نشانی موجود ہے۔
کملا بولی۔ "آپ کا مطلب ہے کہ ملک بخت وغیرہ اب اپنی دی ہوئی مہلت کا خیال نہیں کریں گے۔"
"ہاں۔ ملک بخت کی باتوں سے تو میں نے یہی اندازہ لگایا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ گل حسن نے شرائط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پولیس سے رابطہ کیا ہے اور اسی رابطے کے نتیجے میں میں اس کے پیچھے لگا ہوں۔"
کملا کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوبی رہی پھر بولی۔ "آپ کی باتوں سے تو یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ گل حسن کی زندگی کو فوری خطرہ لاحق ہے۔"
"ہاں۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "میرے خیال میں اب اسے اور اس کی بیوی کو فوری طور پر "چڑے والا چوک" سے کہیں اور لے جانا ہوگا۔"
"مثلاً کس جگہ؟"
"کہیں بھی۔ جہاں ملک بخت اور اس کے ہرکارے ان تک نہ پہنچ سکیں۔"
ہم نے جہاں گاڑی روک رکھی تھی وہ جگہ چڑے والا چوک سے زیادہ دور نہیں تھی۔ بمشکل دس منٹ کا راستہ تھا۔ میں نے کہا۔ "کملا، اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں یہاں سے سیدھا گل حسن کے گھر جانا چاہوں گا۔"
اس نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا اور ادا سے بولی۔ "اسے اپنی ہی گاڑی سمجھیے اور مجھے اپنا ڈرائیور سمجھ لیجیے۔ جس طرف کا حکم دیں میں اس طرف روانہ ہو جاتی ہوں۔"
پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے گیئر لگایا اور گاڑی "چڑے والا چوک" کی جانب موڑ دی۔ کملا کے بارے میں مجھے اب تک جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کے مطابق وہ ایک امیر کبیر برہمن فیملی کا فرد تھی۔ رپورٹنگ وہ صرف شوقیہ کرتی تھی۔ اس کے والد ولایت میں بزنس کرتے تھے اور کملا کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔
نہ جانے کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اگر ہم نے جلدی نہ کی تو آج رات گل حسن اور اس کی بیوی کے ساتھ کوئی حادثہ ہو جائے گا۔ میں نے تصور میں ان کی جوان لاشیں دیکھیں۔ خون میں نہائی ہوئی اور خاک میں لتھڑی ہوئی۔ ایک بار پھر وہی سوال میرے کانوں میں گونجنے لگا جو کچھ عرصہ پہلے گل حسن کی بیوی ثمر نے گورداسپور کے تھانے میں مجھ سے کیا تھا۔ "کیا میرے خاوند کو کوئی نہیں بچا سکتا۔ کیا اس بھرے پُرے شہر میں کوئی ایسا نہیں...... کوئی ایسا نہیں جو قاتلوں کا ہاتھ روک سکے؟"

قریباً دس منٹ بعد ہماری گاڑی گل حسن کے گھر کے سامنے رک رہی تھی۔ میں نے دو سادہ پوش گھر کی نگرانی پر لگا رکھے تھے۔ ان میں ایک بلال شاہ بھی تھا۔ جونہی میں کملا کی سرخ گاڑی سے نکلا بلال شاہ ایک کریانہ فروش کی دکان سے اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''گل حسن گھر میں ہے؟''

بلال شاہ نے اپنا گھڑے جیسا سر انکار میں ہلایا۔ ''نہیں خان صاحب! وہ تو گھر والی کے ساتھ سیر سپاٹے کو نکلا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے فلم وغیرہ دیکھنے گئے ہیں۔ میں نے کانسٹیبل طفیل کو ان کے پیچھے بھیج دیا تھا خود یہاں پہرہ دے رہا ہوں۔''

میں نے گھڑی دیکھی ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر وہ فلم دیکھنے بھی گئے ہیں تو اب واپس آنے والے ہوں گے۔

بلال شاہ نے کہا۔ ''کیا بات ہے جی۔ کوئی خطرے والا معاملہ ہے؟''

میں نے کہا۔ ''اگر خطرے والا معاملہ ہے تو تم کیا کرو گے؟''

وہ بولا۔ ''جو آپ حکم دیں گے جی۔ ویسے بھی آج تو میں زندگی سے اکتایا ہوا ہوں۔ دانت میں اتنا سخت درد ہو رہا ہے کہ جی چاہتا ہے خودکشی کر لوں۔ اگر یہ زندگی آپ کے کام آ گئی تو اس سے اچھی اور کون سی بات ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اتنی آسانی سے مرنے والے نہیں ہو تم۔ باقی دانت کے درد کے اور بھی بہت سے علاج ہیں جن سے ایک یہ ہے کہ درد کی دوا کھاؤ۔''

وہ بولا۔ ''دوا کھانے ہی سے تو درد ہوا ہے۔ پہلے بھوک نہیں لگتی تھی۔ بھوک کھولنے لیے گل قند کھائی تو ہیضہ ہو گیا۔ ہیضہ روکنے کے لیے انگریزی دوائی کھائی تو گردے میں درد ہونے لگا۔ محلے کے حکیم صاحب نے کہا کہ دبل کر (دبا کر) لسی پیو۔ لسی کا تو آپ کو پتہ ہی ہے کہ میں پہلے ہی دبل کر پیتا ہوں۔ بس ذرا زیادہ ہی پی لی۔ موسم بھی ٹھنڈا ہے۔ یہ دانت کا درد شروع ہو گیا۔ اب تو پتہ نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے دواؤں کو بھی۔ ایک بیماری ٹھیک ہوتی ہے دوسری شروع ہو جاتی ہیں۔ اب میری گھر والی ہی کو دیکھیں اسے پرسوں صبح گوڈے میں ٹیس اٹھی اتنی شدید ٹیس تھی کہ غسل خانے ہی میں گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ اب ذرا تصور کریں غسل خانے کو اندر سے کنڈی لگی ہوئی ہے۔ وہ باہر نہیں آ سکتی میں اندر نہیں جا سکتا......''

بلال شاہ ایک بار بولنا شروع ہوا تو بس بولتا چلا گیا۔ ہم نے تین چار منٹ اس کا واویلا سنا۔ پھر اچانک اسے خاموش ہونا پڑا۔ ایک رکشہ گلی میں داخل ہوا اور ہم سے تھوڑے

فاصلے پر رک گیا۔ اس میں گل حسن سوار تھا۔ ساتھ اس کی بیوی تھی وہ سرتاپا چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ جونہی وہ دونوں رکشے سے اُترے میں ان کے پاس پہنچا۔ گل حسن کو ایک طرف لے جا کر میں نے کہا۔ ''تم دونوں کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا اسی وقت۔ گھر میں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔ سامان وغیرہ بعد میں بھی پہنچ سکتا ہے۔ اس وقت تمہارا یہاں سے نکلنا ضروری ہے۔''

اس نادر شاہی حکم نے گل حسن کو پریشان کر دیا۔ بہرحال وہ یہ بات بھی سمجھتا تھا کہ میں اس کا خیر خواہ ہوں اور اس کے بھلے کی بات ہی کروں گا۔ وہ بیوی کو لے کر میرے ساتھ چل دیا اور وہ جس طرح رکشے سے اُترے تھے، اسی طرح میرے ساتھ کملا کی سرخ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں ثمر اور گل حسن کے ساتھ پچھلی نشست پر تھا۔ کملا کے ساتھ اگلی نشست خالی تھی۔ اس پر بلال شاہ بیٹھ گیا۔ میرے اشارے پر کملا نے گاڑی کو یوں ٹرن دیا اور ہم لونگاں والی کھوئی کی طرف مڑ گئے۔

شہر کے گنجان آباد حصے سے نکل کر ہم کھلی سڑک پر آ گئے اور اس کے ساتھ ہی کملا نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ امرتسر کی ایک نواحی بستی میں بلال شاہ نے ایک چھوٹا سا مکان خرید رکھا تھا۔ دراصل اس نے کسی شخص سے کچھ رقم لینی تھی۔ اس رقم کے بدلے یہ بے ڈھنگا سا مکان اس کے پلے پڑ گیا تھا۔ بلال شاہ نے اسے کئی مرتبہ بیچنے کی کوشش کی تھی لیکن ہمیشہ منہ کی کھائی تھی۔ اس وقت یہ بے کار سا مکان ہمارے بہت کام آ سکتا تھا۔ گل حسن اور ثمر کو سر چھپانے کی جگہ مل سکتی تھی اور اگر وہ احتیاط برتتے تو دیر تک قبائلی قاتلوں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔

جس وقت ہم جالندھر روڈ پر پہنچے رات کے بارہ بج چکے تھے۔ گرد و نواح میں ہُو کا عالم طاری تھا۔ یخ بستہ تاریکی نے ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص کی جان بچانے کے لیے مجھے اس طرح کی کارروائی کرنا پڑ رہی تھی۔ ورنہ جس طرح کے حالات تھے، ہماری بجائے ملک بخت وغیرہ کو چھپنے کی ضرورت تھی۔ وہ ایک شخص کو قتل کرنا چاہتے تھے اور اپنے ارادے کا کھلم کھلا اظہار بھی کر رہے تھے۔ دراصل یہاں مسئلہ قبائلی رسم و رواج کا آ گیا تھا اور کسی وقت تو محسوس ہوتا تھا کہ پولیس بھی ان رسم و رواج کے سامنے بے بس ثابت ہو گی۔

اس وقت ہم جالندھر روڈ کے آٹھویں یا نویں میل کے پاس تھے جب اچانک مجھے محسوس ہوا کہ ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔ تیز روشنیوں والی ایک جیپ یا ویگن نما گاڑی مسلسل

ہمارے پیچھے آ رہی تھی اس گاڑی کا ہمارا درمیانی فاصلہ بھی آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔ پھر دھماکوں سے اوپر تلے دو گولیاں چلیں۔ یہ خودکار رائفل کے فائر تھے۔ ایک دم میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ اب شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ نہ صرف ہمارا تعاقب کیا جا رہا تھا بلکہ یقینی بات تھی کہ تعاقب کرنے والے کرم ایجنسی کے خطرناک قبائلی ہیں۔ وہ کیسے اور کہاں سے ہمارے پیچھے لگے یہ ایک مشکل سوال تھا۔ بہر حال اس وقت سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ان مسلح افراد سے کیسے بچا جائے۔۔۔۔۔ اب تو یہ کھلی جنگ تھی اور اس جنگ میں جو چیز داؤ پر لگی ہوئی تھی وہ گل حسن کی زندگی تھی۔ بالکل فلمی سچویشن بن گئی تھی لیکن کبھی کبھی فلمی مناظر حقیقی زندگی میں بھی سامنے آ جاتے ہیں۔ دونوں گاڑیاں قریباً پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگ رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کملا ایک نہایت مشاق ڈرائیور ہے۔ جس سڑک پر ہم جا رہے تھے وہ اتنی کشادہ نہیں تھی۔ گاہے گاہے خطرناک موڑ بھی آ رہے تھے۔ کملا ان موڑوں سے رفتار کم کیے بغیر گزر رہی تھی۔ یقیناً گل حسن اور ثمر اس شہری لڑکی کی چابکدستی پر حیران ہوں گے۔ ایک بار موٹر کار کے پہیے چرچرائے تو ثمر کے ہونٹوں سے ہلکی سے چیخ نکل گئی۔ میں نے کملا سے کہا کہ وہ ذرا سنبھل کر چلے۔ ہماری گاڑی ہلکی پھلکی تھی اور اس میں وزن زیادہ تھا۔ اتنی تیز رفتاری خطرناک ہو سکتی تھی۔

دو تین منٹ صورت حال جوں کی توں رہی اور دونوں گاڑیاں ایک ہی رفتار سے آگے پیچھے بھاگتی رہیں لیکن جونہی ہم شہری حدود سے نکل کر نسبتاً سنسان علاقے میں داخل ہوئے۔ عقبی گاڑی ایک بار پھر نزدیک آ گئی۔ یہ ایک لوڈر گاڑی تھی۔ اگلا حصہ بند تھا جبکہ پچھلی باڈی چھت کے بغیر تھی۔ اس حصے میں کئی افراد سوار تھے۔ ایک موڑ پر مجھے ان کے ہاتھوں میں لہراتی ہوئی بندوقیں صاف دکھائی دیں۔ دونوں گاڑیوں کا درمیانی فاصلہ پچاس ساٹھ گز رہ گیا تو ایک بار پھر ہم پر تین چار فائر کیے گئے۔ ان میں سے ایک گولی ''ٹن'' کی گونجدار آواز سے گاڑی کی باڈی میں لگی۔ اب جواب دینا ضروری تھا۔ میں نے ریوالور کھڑکی سے نکالا۔ عقبی گاڑی اب اور نزدیک آ گئی تھی۔ میں نے اوپر تلے چار فائر کیے۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا ان میں سے ایک فائر گاڑی کی ونڈ اسکرین میں لگا تھا اور اس نے ملک بخت کو معمولی زخمی بھی کیا تھا۔

میری فائرنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ عقبی گاڑی ایک بار پھر فاصلے پر چلی گئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا ہم امرتسر سے قریباً دس میل باہر آ چکے تھے۔ قریبی تھانہ یہاں سے تین میل کے فاصلے پر تھا اور یہ تھانہ تھا بھی لب سڑک۔ ہم وہاں تک پہنچ جاتے تو ان مشتعل قبائلیوں سے

گل حسن اور ثمر کی زندگی بچائی جا سکتی تھی۔۔۔۔۔ ڈرائیونگ میں کملا کی مہارت واقعی قابلِ داد تھی۔ وہ ''مردانہ وار'' ڈرائیونگ کر رہی تھی اور اس صورتِ حال سے قطعی خوفزدہ نظر نہیں آتی تھی۔ جب وہ تیزی سے گاڑی موڑتی تو اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا بلال شاہ عجیب انداز سے ایک طرف جھک جاتا۔ جیسے اپنے بھاری بھرکم جسم کے زور سے گاڑی کو الٹنے سے بچا رہا ہو۔ گل حسن اور ثمر گم صم تھے۔ وہ جانتے تھے کہ پیچھے آنے والوں کا اصلی شکار وہی دونوں ہیں۔ اگر اس کار کے باقی سوار بچ بھی گئے تو وہ مشکل سے بچیں گے۔ تھوڑا آگے بڑی نہر کا پل تھا۔ اس پل کے بیچوں بیچ کملا نے گاڑی ایک گڑھے سے اتنی ہوشیاری کے ساتھ بچائی کہ ہم حیران رہ گئے۔ بلال شاہ کو دانت کا درد یقیناً بھول چکا تھا اور عین ممکن تھا۔ وہ سوچ رہا ہو کہ اس نے خواہ مخواہ خودکشی والی بات منہ سے نکالی۔ اس سفر کے دوران کسی بھی وقت اس کی یہ خواہش پوری ہو سکتی تھی۔

دفعتاً مجھے عقب میں ایک دھماکہ سنائی دیا۔ اس وقت ہم پل سے نیچے اُتر چکے تھے اور عقب میں آنے والی گاڑی پل پر تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے نہر کے پانی میں ایک چمک سی نظر آئی۔۔۔۔۔ اور پھر ایک دم یہ چمک بھی غائب ہو گئی۔ اچانک میرے جسم کا ہر رونگٹا کھڑا ہو گیا۔

''کیا ہوا؟'' کملا کی چونکی ہوئی سی آواز آئی۔

''گاڑی روکو۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

اب گل حسن بھی گردن گھما کر عقب میں دیکھ رہا تھا۔ عقبی گاڑی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

کملا نے رفتار کم کر کے بریک لگائے اور گاڑی لہراتی ہوئی سڑک کے کنارے رک گئی۔

''کیا ہوا؟'' کملا نے پھر پوچھا۔

''گاڑی گر گئی ہے۔'' میں نے مختصر جواب دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ گل حسن اور بلال شاہ بھی تیزی سے باہر نکلے۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا میں چند لمحے اپنی جگہ کھڑا سوچتا رہا پھر بھاگتا ہوا نہر کی طرف گیا۔ گل حسن اور بلال شاہ بھی میرے پیچھے آئے۔ پل ذرا بلندی پر تھا اور وہاں سے ڈھلوان سڑک نیچے اُترتی تھی۔ ہم سڑک کی بجائے کچے راستے پر بھاگتے ہوئے نہر کے کنارے پہنچے۔ بلندی کی طرف دیکھا تو تاروں کی روشنی میں ایک عجیب منظر نظر آیا۔ پل کا حفاظتی جنگلہ ٹوٹ چکا تھا اور نہر کے عین وسط میں عجیب سی ہلچل نظر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ لوگ پانی میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اب شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ ہمارے پیچھے آنے والی گاڑی تیز رفتاری کے سبب ''لنک نہر'' میں گر چکی تھی۔ جیسا

کہ بعد میں پتہ چلا گاڑی کے الٹنے اور گرنے کا سبب وہی گڑھا بنا تھا جس سے چند سیکنڈ پہلے کملا نے بڑی ہوشیاری سے گاڑی بچائی تھی۔ یہ بڑی سنگین صورتِ حال تھی۔ رات کے اس پہر سڑک سنسان تھی۔ اردگرد کے کھیت بھی یخ بستہ تاریکی میں لپٹے ہوئے تھے اور قبائلیوں کی گاڑی نہر میں ڈوب چکی تھی۔ جیسا کہ بعض لوگ جانتے ہوں گے یہ نہر کافی چوڑے پاٹ کی ہے۔ کنارے ڈھلوان ہیں اور اس کی گہرائی بارہ تیرہ فٹ سے کم نہیں۔

ہم نے غور کیا تو پتہ چلا کہ کچھ افراد ہاتھ پاؤں مارتے کنارے کی طرف آ رہے ہیں۔ میں نے گل حسن سے کہا کہ وہ گاڑی میں واپس چلا جائے اور کملا سے کہے کہ وہ گاڑی لے کر نکل جائے۔ پھر میرے ذہن میں آیا اور میں نے بلال شاہ کو بھی واپس بھیج دیا۔ میں نے اسے کہا۔ ”گاڑی لے کر تھانے میں چلے جاؤ۔ ایس ایچ او کا نام کمل سنگھ ہے۔ اسے بتاؤ کہ نہر میں گاڑی گر گئی ہے، وہ فوراً کچھ بندے لے کر پہنچے۔“

بلال شاہ نے اپنا منکا سا سر ہلایا اور توند مٹکاتا ہوا گل حسن کے پیچھے لپک گیا۔ چند سیکنڈ بعد نہر میں گرنے والے افراد میں سے پہلا شخص کنارے پر چڑھ آیا۔ میں اسے پہچان گیا وہ سعد خاں کا وہی ساتھی تھا جس نے ٹال پر ہونے والے جھگڑے میں مجھ پر دو فٹ لمبا چھرا نکالا تھا۔ اس کی پیشانی خون سے تر تھی اور ایک بازو کی حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ٹوٹ چکا ہے۔ کنارے پر پہنچ کر اس نے نگاہ اپنے عقب میں ڈالی پھر بے حد ہانپی ہوئی آواز میں بولا ”خدا کا واسطہ کچھ کرو ملک بخت اور سعد خاں نہر میں ڈوب گیا ہے......وہ......وہ گاڑی کے اگلے حصے میں بیٹھا تھا ابھی تک باہر نہیں نکل سکا۔“

ملک بخت اور سعد خاں قبائلی قاتل تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ انسان بھی تھے اور انسان کی زندگی بچانا دوسرے انسان کا اولین فرض ہوتا ہے۔ مجھے ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہیں سوچنا پڑا کہ مجھے نہر میں چھلانگ لگانی چاہیے یا نہیں۔ مجھے چھلانگ لگانا تھی۔ سو میں نے لگا دی لیکن اس سے پہلے میں اپنا ریوالور قریبی جھاڑیوں میں پھینکنا نہیں بھولا۔

پانی سرد اور بہاؤ تیز تھا۔ میرے قریب سے چند قبائلی الٹے سیدھے پاؤں چلاتے گزرے۔ وہ بس اتنا ہی تیرنا جانتے تھے کہ اپنی جان بچا سکتے تھے۔ اور جان بچانے کے لیے وہ کنارے تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پہاڑوں میں رہنے والے لوگوں کا واسطہ ایسے دریا نما پانیوں سے کہاں پڑتا ہے۔ وہاں چھوٹے موٹے ندی نالے ہوتے ہیں جن میں تیرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ یہ چوڑے پاٹ کی رواں دواں نہر تھی اور اس میں تیرتے ہوئے کوہستانیوں کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا تھا۔

میں نہر کے وسط میں پہنچا تو ایک مقام پر پانی میں ہلچل محسوس ہوئی۔ یہ جگہ پُل کے درمیانی ستونوں کے بالکل قریب تھی۔ میں نے غوطہ لگایا اور سرد پانی میں اُترتا چلا گیا۔ چند لمحے بعد میرے ہاتھوں نے جس شے کو چھوا وہ کسی گاڑی کا سائلنسر تھا۔ میں نے دیوانوں کی طرح ہاتھ چلائے اور مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لوڈر اس طرح تہہ میں بیٹھا ہے کہ چھت نیچے اور پہیے آسمان کی طرف ہیں۔ میں نے تھوڑی سی کوشش اور کی اور ایک دروازے کے ہینڈل تک پہنچ گیا۔ دروازے کے اندر سے دھم دھم کی آواز آ رہی تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ لوڈر کے ڈرائیونگ کیبن میں جو کوئی بھی ہے زندہ ہے اور باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسی دوران میرا سانس ٹوٹنے لگا۔ میں ہاتھ پاؤں مار کر پانی کی سطح پر آیا۔ چند گہرے سانس لیے۔ حواس بحال کیے اور ایک بار پھر تہہ میں اُتر گیا۔ گاڑی پانی میں ڈوبے اب دو منٹ سے زائد ہو چکے تھے۔ اگر ایک دو منٹ کے اندر ڈوبنے والوں کو باہر نہ نکالا جاتا تو پھر ان کا بچنا محال تھا۔

دوسرے غوطے میں سیدھا دروازے کے ہینڈل تک پہنچا۔ حادثے کے سبب دروازہ پھنس چکا تھا اور اس کا کھلنا محال تھا۔ دھم دھم کی مدھم آواز اب اور مدھم ہو چکی تھی۔ میں تیر کر دوسرے دروازے کی طرف گیا۔ اس دروازے کا ہینڈل ڈھونڈنے میں دس پندرہ سیکنڈ مزید لگ گئے لیکن جونہی ہینڈل میرے ہاتھ میں آیا میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ میرا سانس اب ٹوٹنے والا تھا لیکن سانس لینے کے لیے میں دوبارہ پانی کے اوپر آتا تو لوڈر کے اندر پھنسے ہوئے افراد کا کام تمام ہو جاتا۔ میں نے رہی سہی ہمت جمع کی اور دروازے کے خلا میں دائیں بائیں ہاتھ گھمایا۔ ایک کپڑا میرے ہاتھ میں آیا۔ یہ کسی کے کوٹ کا کالر تھا۔ میں نے یہ کالر پکڑا اور کوٹ والے کو کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ میرے پھیپھڑے پھٹنے والے تھے اور کوٹ والا ابھی تک گاڑی کے کسی حصے سے الجھا ہوا تھا۔ میں نے بمشکل اسے چھڑایا اور پانی کی سطح پر لے آیا۔ کنارے سے شوروغل کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرے ہاتھ پاؤں شل ہو رہے تھے۔ چند سیکنڈ تیرنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ میں پل کے ستون سے چمٹ گیا۔ میرا ایک ہاتھ ستون کے ایک شکستہ خلا میں تھا اور دوسرے ہاتھ سے میں نے کوٹ والے کا سر پانی سے باہر نکال رکھا تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ وہ شخص بے ہوش ہے یا مر چکا ہے۔ میں نے تاروں کی مدھم روشنی میں غور سے اس کا چہرہ دیکھا، وہ ملک بخت تھا۔

نہر کے حادثے میں کوئی شخص ہلاک نہیں ہوا اور یہ ایک معجزہ ہی تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ لوڈر آگے سے بند تھا۔ سعد خاں اور ملک بخت اسی حصے میں پھنس گئے تھے۔ ملک

بخت کے سر میں شدید چوٹ آئی تھی اور وہ گرتے ساتھ ہی بے ہوش ہو گیا تھا، ہاں سعد خاں ہوش میں رہا تھا اور پانی میں ڈوبنے کے بعد بھی دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ دروازہ کھول کر میں نے ملک بخت کو باہر نکال لیا تھا۔ ملک بخت کے نکلنے کے بعد سعد خاں کے لیے نکلنا بھی ممکن ہو گیا تھا۔ اور وہ کھلے ہوئے دروازے میں سے ہو کر سطح آب پر آ گیا تھا۔ چونکہ اس وقت تک بلال شاہ پولیس لے کر نہیں پہنچا تھا لہٰذا تمام قبائلی کنارے پر جمع ہو کر شور و غل کرنے لگے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنے ڈوبنے والے سردار کی مدد کیسے کریں۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ یہ نہیں دیکھ سکے تھے کہ میں ملک بخت کو باہر نکال لایا ہوں اور اب پُل کے نیچے ستون کا سہارا لے کر سانسیں درست کر رہا ہوں۔ اسی دوران بلال شاہ پولیس کی گاڑی لے کر پہنچ گیا۔ دراصل یہ گشتی پولیس کے اہلکار تھے جو بلال کو راستے میں مل گئے تھے۔ ان اہلکاروں نے غلطی یہ کی کہ سائرن بجاتے ہوئے آئے۔ سائرن کی آواز سن کر سعد خاں اور اس کے ساتھی تتر بتر ہو گئے۔ حادثے کا شکار ہونے والوں میں سے صرف ملک بخت میرے پاس رہا جو بے ہوش تھا۔

اب ملک بخت ہسپتال میں تھا۔ اس کے سر پر دو درجن ٹانکے لگے تھے۔ اس کے کندھے پر میری چلائی ہوئی گولی کا معمولی زخم بھی تھا۔ ہسپتال آنے کے بعد سے وہ مسلسل خاموش تھا۔ صرف نہایت ضروری بات کرتا تھا، نہ کسی سوال کا جواب دیتا تھا نہ خود کوئی سوال پوچھتا تھا۔ ویسے بھی اسے اردو بہت تھوڑی آتی تھی۔ پولیس مقابلہ، قتل اور ناجائز اسلحہ سمیت اس پر کئی کیس بن سکتے تھے لیکن میں جانتا تھا، ان کیسوں کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ فائدہ تو تب تھا جب ہم یہ کیس کر کے گل حسن کی جان بچا سکتے۔ ملک بخت پھانسی بھی لگ جاتا تو دو درجن اور قبائلی آزاد علاقے سے گل حسن کی جان لینے پہنچ جاتے۔

ہسپتال میں ملک بخت کا علاج ہو رہا تھا۔ میں قریباً روز ہی اس کو دیکھنے جاتا تھا۔ اس کی نگرانی کے لیے دو ہیڈ کانسٹیبل ہر وقت اس کے بستر کے پاس موجود رہتے تھے۔ یہ چوتھے پانچویں دن کی بات ہے میں ملک بخت کو دیکھنے ہسپتال گیا تو وہاں عجیب طرح کی افراتفری نظر آئی۔ چند افراد ہسپتال کے گیٹ پر جمع تھے۔ چار پانچ افراد شعبہ حادثات کے سامنے کھڑے تھے اور ان کے چہروں پر بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ایک سینئر ڈاکٹر مجھے پہچانتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکا۔ کہنے لگا۔ ''انسپکٹر صاحب! بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تین چار پٹھان آئے تھے۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں۔ انہوں نے آپ کے ایک کانسٹیبل کو زخمی کر دیا ہے اور دوسرے سے رائفل چھین لی ہے۔ مریض کو بھی وہ اپنے

ساتھ لے گئے ہیں۔''

مریض سے ڈاکٹر کی مراد یقیناً ملک بخت تھا۔ میں ایمرجنسی وارڈ کی طرف بڑھا۔ وہاں ہیڈ کانسٹیبل موہن سنگھ کی مرہم پٹی ہو رہی تھی۔ اس کی کنپٹی اور سر پر زخم آئے تھے۔ اس نے ہانپتے ہوئے لہجے میں مجھے بتایا کہ حملہ آور کانسٹیبل رزاق کو یرغمال کے طور پر اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ میں موقعہ واردات پر پہنچا تو وہاں بھی ابتری کے آثار نظر آئے۔ ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ میز الٹی ہوئی تھی اور فرش پر زخمی کانسٹیبل کے خون کے نشانات تھے۔ ایسے ہی سرخ نشانات بستر کی چادر پر تھے۔ موقع پر موجود عملے نے بتایا کہ حملہ آور شکل و صورت سے ہی خطرناک نظر آتے تھے۔ انہوں نے دھمکی دی کہ جس کسی نے ہوشیاری دکھائی اسے گولیوں سے اُڑا دیں گے۔ پھر انہوں نے ایک کانسٹیبل سے رائفل چھین لی۔ دوسرے نے مزاحمت کی تو اس کو رائفلوں کو بٹ مار کر شدید زخمی کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے مریض کو ساتھ لیا اور باہر کھڑی سیاہ جیپ میں سوار ہو گئے۔ عینی شاہدوں نے بتایا کہ جیپ پر نمبر پلیٹ نہیں تھی۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کیا جائے کہ وہ ہیڈ کانسٹیبل واپس آ گیا جسے حملہ آور اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس کے چہرے پر بھی چوٹوں کے نشان تھے۔ تاہم اس کی رائفل واپس کر دی گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ حملہ آوروں کی قیادت سعد خاں خود کر رہا تھا۔ وہ لوگ اسے یرغمال بنا کر ساتھ لے گئے تھے لیکن اگلے چوک میں انہوں نے اسے جیپ سے اتار دیا۔ اس نے اپنی رائفل مانگی تو وہ بھی خالی کر کے نیچے پھینک دی گئی۔

اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ قبائلیوں کے سلسلے میں مَیں نے بہت تحمل سے کام لیا تھا۔ کئی موقعوں پر انہیں رعائتیں دی تھیں اور کوشش کی تھی کہ کس طرح ان کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہو جائے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ گل حسن کے سسر ابراہیم خاں کو ملک بخت وغیرہ نے قتل کرایا ہے میں نے اس امید پر ملک بخت کو گرفتار نہیں کیا تھا کہ شاید وہ گل حسن کے بارے میں نرم رویہ اختیار کر لے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ کچھ اور نہیں تو یہ لوگ اس بات کا ہی خیال کرتے کہ چند روز پہلے میں نے کس طرح اپنی جان خطرے میں ڈال کر ان کی جانیں بچانے کی کوشش کی تھی۔ زندگی اور موت تو یقیناً اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس نے کسی کو موت کے منہ سے نکالنا ہو تو اس کے اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے مگر اس رات سعد خاں اور ملک بخت جس بری طرح گاڑی میں پھنس گئے تھے اپنی کوشش سے باہر نکل آنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا...... سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اب ان قبائلیوں کو مزید ڈھیل دینا مناسب نہیں۔

گل حسن اور ثمر کو میں نے امرتسر کی نواحی بستی میں واقع بلال شاہ کے مکان میں پہنچا دیا تھا۔ وقتی طور پر تو وہ محفوظ تھے لیکن کتنی دیر تک محفوظ رہیں گے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے قبائلی خاصی بڑی تعداد میں موجود تھے اور پورے شہر میں پھیلے ہوئے تھے۔ رات کو ہیڈ کوارٹر میں ایس پی مدن لال کے ساتھ ہماری میٹنگ ہوئی۔ طویل صلاح مشورے کے بعد طے پایا کہ قبائلیوں کے خلاف بھرپور کارروائی کی جائے۔ جہاں جہاں ان کا سراغ ملے چھاپہ مارا جائے مزاحمت پر بے دریغ گولی چلائی جائے اور گرفتار کر کے ان پر سخت کیس بنائے جائیں۔ ایس پی کا خیال تھا کہ یہ کارروائی آج رات ہی شروع کر دی جائے۔ اس نے کارروائی کے لیے مجھے دو قریبی تھانوں کی فورس بھی مہیا کر دی اور دیگر ضروری ہدایات بھی دے دیں لیکن نہ جانے کیا بات تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے تھوڑا انتظار اور کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کوئی انہونی ہو جائے۔ اگر ان لوگوں میں تھوڑی بہت انسانیت تھی تو وہ اپنا رویہ تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ سکتے تھے...... اور انہیں سوچنا چاہیے تھا۔

جیسا کہ میں کئی بار کہہ چکا ہوں بعض اوقات انسان کی ناکامی اور کامیابی میں بہت معمولی سا فرق ہوتا ہے۔ جہاں برداشت جواب دینے والی ہوتی ہے وہاں انتظار ختم ہو جاتا ہے، جس جگہ مایوسی انتہا کو پہنچ جاتی ہے وہیں سے امید کی کرن پھوٹ نکلتی ہے۔ اس رات میں اپنے دفتر میں موجود تھا اور سخت تذبذب کے عالم میں بیٹھا تھا۔ کم و بیش پانچ گاڑیاں اور پچاس جوان تھانے میں موجود تھے۔ قبائلیوں کے خلاف کارروائی کی پوری تیاری ہو چکی تھی۔ مخبروں نے جو رپورٹیں دی تھیں ان کے مطابق شہر میں کم از کم چار جگہوں پر کامیاب چھاپے مارے جا سکتے تھے۔ اس وقت رات کے ساڑھے نو بجے تھے جب میرے سنتری نے بتایا کہ ایک کمبل پوش شخص مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ سنتری نے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنے حلیے اور بول چال سے پٹھان نظر آتا ہے۔

''پٹھان'' کے ذکر پر میں چونکا اور میں نے سنتری سے کہا کہ وہ ملاقاتی کو فوراً اندر لائے۔ چند لمحے بعد دروازے کے پردے میں حرکت پیدا ہوئی اور ایک لحیم شحیم پٹھان اندر آ گیا۔ اس نے منہ سر کمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔ میں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ سعد خاں تھا۔ اس کے کمبل میں رائفل چھپی ہوئی تھی لیکن میں بھی ریوالور سے مسلح تھا اور مجھے یقین تھا کہ اگر سعد خاں کسی بری نیت سے آیا ہے تو اس کی رائفل سیدھی ہونے سے بہت پہلے میرا ریوالور اس کی پیشانی سے جا لگے گا۔

''کیسے آئے ہو سعد خاں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مجھے ملک بخت نے تمہاری طرف بھیجا ہے۔''

''کیوں اب کیا کسر رہ گئی ہے۔'' میں نے پوچھا۔

وہ میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''تم نے ایک بار کہا تھا کہ تم گل حسن کی جان بچانا چاہتے ہو...... ام اس بارے میں بات کرنے کے لیے آیا ہے۔''

میں نے ٹوپی اتار کر میز پر رکھی اور سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''یہاں امارا بات چیت کوئی سنے گا تو نہیں؟''

میں نے کہا۔ ''بے فکر ہو کر کہو۔ یہ جگہ ہر طرح کی گفتگو کے لیے مناسب ہے۔''

اس نے نسوار کی چٹکی ہونٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''ملک بخت...... اکبر کا سگا چچا ہے اور تم جانتا ہی ہے کہ اکبر خاں کو گل حسن نے قتل کیا تھا۔ جرگے کا فیصلہ ہے کہ اکبر خاں کے بدلے گل حسن کو قتل کیا جائے۔ ام لوگ جرگے کا فیصلہ منوانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ پولیس تو رہا ایک طرف فرنگی فوج بھی دیکھ چکا ہے کہ ام قدم اٹھا کر پیچھے نہیں ہٹاتا...... لیکن تم چند روز پہلے جس طرح امارا مدد کیا ہے وہ امارے دماغ میں ہے۔ ام چاہتا ہے کہ گل حسن کے بارے میں تم سے بات کرے......''

میں نے سنتری کو بلا کر سعد خاں کے لیے چائے منگوائی اور اس سے کہا کہ وہ جاتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کر جائے۔

سعد خاں بولا۔ ''صرف ایک صورت ہے جس میں گل حسن کا جان بخشی ہو سکتا ہے...... اور یہ بھی ملک بخت بہت رعایت کر رہا ہے ورنہ اس سے پہلے وہ اور مقتول اکبر کا دوسرے رشتے دار ایسی بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں تھا...... اور وہ بات یہ ہے کہ امارے قبیلوں میں سورہ نامی ایک رسم ہوتا ہے۔ اس رسم کے مطابق اگر قاتل کا خاندان اپنی کسی لڑکی کا رشتہ مقتول کے خاندان کو دے دے تو ان میں صلح ہو جاتا ہے...... گل حسن کے خاندان میں ایک شاہینہ نام کی لڑکی ہے۔ وہ رشتے میں گل حسن کا تایا زاد بہن ہے۔ اگر اس لڑکی کا رشتہ مقتول کے چھوٹے بھائی سے ہو جائے تو یہ جھگڑا ختم ہو سکتا ہے......''

مجھے معلوم تھا کہ قبائلیوں میں اس طرح بھی جھگڑوں کا فیصلہ ہوتا ہے۔ تاہم سعد خاں کی بات سنتے ہی یہ چیز میری سمجھ میں آ گئی کہ وہ گل حسن کی جان چھوڑنے کے لیے جو شرائط بیان کر رہا ہے وہ اتنی آسان نہیں ہوگی۔ ضرور کوئی ایسی بات ہوگی جس کے سبب شاہینہ نامی اس لڑکی کا رشتہ مقتول کے بھائی کا ملنا ناممکن ہوگا۔

میں نے کہا۔ ''یہ لڑکی کسی کی منگیتر یا بیاہتا تو نہیں؟'' سعد خاں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

میں نے کہا۔ ''کوئی اور دعویدار ہے اس لڑکی کا؟''

وہ بولا۔ ''نہیں۔ ایسا بھی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر گل حسن کوشش کرے تو اس لڑکی کا رشتہ مقتول کے بھائی سے ہو سکتا ہے لیکن ام جانتا ہے، وہ کوشش نہیں کرے گا۔ حالانکہ یہ شادی بالکل جوڑ کا شادی ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ دلہا کے ساتھ ساتھ دلہن بھی اس شادی پر راضی ہو۔''

سعد خاں مجھ سے پہیلیاں بوجھوا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''اگر یہ جوڑ کی شادی ہے اور اس میں کسی کی عزت بے عزتی کا مسئلہ بھی نہیں تو پھر گل حسن یا اس کا کوئی عزیز رشتہ کروانے کی کوشش کیوں نہیں کرے گا؟''

سعد خاں نے کہا۔ ''وہاں سدہ کے قریب چانڈی نامی گاؤں میں ایک اللہ لوک پیر پالے ہے۔ اردگرد کے علاقہ میں اس کو بہت مانا جاتا ہے۔ ہندو اور سکھ تک اس کی پوجا کرتا ہے۔ شاہینہ اسی پیر پالے کا خادمہ ہے۔ وہ پیر پالے کے حجرے میں رہتا ہے اور بہت ضرورت کے وقت باہر نکلتا ہے۔ اب وہ ساری زندگی پیر پالے کی خانقاہ پر گزارے گا۔ یہی وہاں کا دستور ہے۔ جو ایک بار پیر پالے کا خدمت گار بن جاتا ہے ساری عمر وہیں پر رہتا ہے۔ اگر وہ مرتا ہے تو اس کا قبر بھی خانقاہ کے قبرستان میں بنتا ہے۔''

شمالی علاقوں میں آج بھی پیر پرستی زور و شور سے ہوتی ہے۔ ان دنوں یہ رواج آج سے بھی بڑھ کر تھا۔ ہر گاؤں ہر بستی میں ایک آدھ پیر یا خانقاہ موجود ہوتی تھی۔ بعض شیطان صفت لوگ عوام الناس کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر بڑے بڑے عجیب کام کر جاتے تھے۔ یہ پیر پالے بھی کوئی اسی فطرت کا بندہ لگتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی جوان جہان شخص ہے جس نے پیری فقیری کی آڑ میں عیاشی کا سامان پیدا کیا ہوا ہے۔

میں نے سعد خاں سے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ سچا پیر ہے یا جھوٹا؟''

وہ بولا۔ ''سچے جھوٹے کا ام کو پتہ نہیں لیکن اس کی بددعا میں بہت زیادہ اثر ہے۔ وہ جس پر غصہ کرتا ہے اس کا خانہ خراب ہو جاتا ہے۔ ام نے لوگوں کو کوڑھے ہو کر مرتے اور کوڑی کوڑی کا محتاج ہوتے دیکھا ہے۔''

''تو اسی لیے تم یہ سمجھتے ہو کہ گل حسن خون بہا میں اس لڑکی کا رشتہ مقتول کے خاندان میں نہیں دے سکتا۔''

''ام نے کب کہا ہے کہ وہ رشتہ نہیں دے سکتا۔ وہ کوشش کرے تو ایسا کر سکتا ہے لیکن وہ

ایسا کرے گا نہیں۔''

سعد خاں کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ اپنی طرف سے گل حسن کو ایک سخت آزمائش میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ لڑکی کے رشتے کی شرط اس لیے رکھ رہے تھے کہ ان کے نزدیک یہ ایک نہایت سخت شرط تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر شاہینہ کو پیر پالے سے آزاد کرا کے اس کی شادی کی گئی تو اس کا سارا ''وبال'' شادی کرانے والے پر پڑے گا۔ اب وہ اس بات کا فیصلہ گل حسن پر چھوڑ رہے تھے کہ وہ یہ وبال خود پر لینے کے لیے تیار ہے یا نہیں۔ میں نے سعد خاں سے پوچھا۔ ''مقتول کے بھائی کا کیا نام ہے؟''

وہ بولا۔ ''اس کا نام شاہین خان ہے۔ وہ امارے ساتھ ہی یہاں آیا ہوا ہے شاید تم نے اسے دیکھا بھی ہو۔ اور ام تم کو ایک بات اور بتاتا ہے۔ یہ شاہین خان اور شاہینہ ایک دوجے کو تھوڑا بہت پسند بھی کرتا ہے اور پسند نہ بھی کرتا ہو تو ایک دوجے سے جان پہچان ضرور ہے ان کا۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اگر اس لڑکی کا رشتہ ملک بخت کے خاندان میں ہو جائے تو یہ دشمنی ختم ہو جائے گی۔''

وہ سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''اس بات کا ضمانت امارا زبان ہے اور یہ ایک بنگش کا زبان ہے۔ اس زبان کے ساتھ ملک بخت کا زبان شامل ہے اور ان سب کا زبان بھی جن پر اکبر خاں کے خون کا بدلہ لینا فرض ہے۔''

کچھ دیر میرے اور سعد خاں کے درمیان بات چیت ہوتی رہی پھر سعد خاں واپس چلا گیا۔ وقتِ رخصت میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اس سلسلے میں گل حسن سے بات کرتا ہوں اور کل شام تک اسے بتا دوں گا کہ گل حسن کیا کہتا ہے۔

اس رات پولیس کارروائی ملتوی کر دی گئی اور اگلے روز صبح سویرے میں نے امرتسر کی نواحی بستی میں جا کر گل حسن اور ثمر سے ملاقات کی۔ میں نے جب گل حسن کو بتایا کہ سعد خاں نے کیا کہا ہے تو اس کی آنکھوں میں غصے کے آثار نظر آئے۔ کہنے لگا۔ ''نواز صاحب! آپ کو نہیں معلوم وہ کیا چاہ رہا ہے...... ام پیر پالے جیسی بزرگ ہستی کا نافرمانی کرے گا تو اپنے ہاتھوں سے اپنی قبریں کھودے گا۔ ام تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اس لڑکی کو پیر پالے کی خدمت سے ہٹا کر اس کے ہاتھ پیلے کر دے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ پیر پالے آخر ہے کون؟''

وہ بولا۔ ''پیر پالے کی خانقاہ دور و نزدیک مشہور ہے۔ کچھ بوڑھے لوگوں کا کہنا ہے کہ

پیر پالے کا عمر ایک سو دس سال سے بھی زیادہ ہے۔ وہ چمڑے کا لباس پہنتا ہے اور جو لباس ایک بار پہنتا ہے وہ دس سال تک اتارتا نہیں ہے۔ اس کی دعا اور بد دعا میں اتنا اثر ہے کہ جو بیمار مُردے کا ماقف ہے وہ زندہ ہو جاتا ہے اور جو زندہ ہے وہ ایک پل میں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے...... اس کے بعد گل حسن نے مجھے اوپر تلے پیر پالے کے کئی حیرت ناک قصے سنا ڈالے۔ اس نے بتایا کہ پیر پالے بے حد ضعیف شخص ہے۔ کمر دہری ہو چکی ہے۔ کسی کے سہارے کے بغیر اٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ اس کی خدمت گاری کو لوگ اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھتے ہیں لیکن وہ ہر کسی کو اپنی خدمت کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ اپنا خدمت گار خود چنتا ہے۔ اور جو ایک بار اس کا خدمت گار بن جائے تو وہ ہمیشہ کے لیے اس کا خدمت گار بن جاتا ہے اور ہر طرح کی دنیا داری سے منہ موڑ لیتا ہے۔ پیر پالے کے خدمت گار کو بہت عزت دی جاتی ہے اور اس کے خاندان کو بھی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

پھر گل حسن نے بتایا کہ کس طرح چند برس پہلے پیر پالے کے ایک خدمت گار نوجوان نے اپنی بھاوج کے اکسانے پر خدمت گاری چھوڑ دی تھی اور بھاوج کی چھوٹی بہن سے شادی کر لی تھی اور کس طرح اس کی بھاوج لاعلاج خارش کا شکار ہو کر تڑپ تڑپ کر مری تھی۔

میں نے گل حسن سے کافی دیر اس بارے میں گفتگو کی۔ اس کی باتوں سے میں نے جو نتیجہ نکالا وہ یہ تھا کہ اگر پیر پالے کی رکاوٹ نہ ہو تو گل حسن اپنے تایا کو با آسانی اس بات پر راضی کر سکتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ مقتول خاندان میں کر دے لیکن پیر پالے کی رکاوٹ کوئی معمولی رکاوٹ نہیں تھی۔ گل حسن یا اس کے خاندان میں سے کوئی چاہتا بھی تو اس رکاوٹ کو پار کرنے کا تصور نہیں کر سکتا...... گل حسن سے ملاقات کے بعد میں جس طرح رازداری سے آیا تھا اسی طرح رازداری سے امرتسر واپس چلا گیا (رازداری سے آنے جانے کی وجہ "یہ خطرہ" تھا کہ کہیں کوئی قبائلی یا قبائلیوں کا مددگار میرے ذریعے گل حسن کی اس نئی پناہ گاہ تک پہنچنے کی کوشش نہ کرے۔ میری یہ احتیاط بڑی سود مند ثابت ہوئی۔ کیونکہ بعد ازاں پتہ چلا تھا کہ قبائلیوں نے ایک بندہ مستقل طور پر میرے پیچھے لگا رکھا ہے) گل حسن کے پاس سے واپس امرتسر آتے ہوئے میں نے راستے میں ہی فیصلہ کر لیا کہ میں کرم ایجنسی جاؤں گا اور "سدہ" کے اس پیر کو دیکھوں گا کہ وہ کیا شے ہے اور کیا کرامات ہے اس کے پاس کہ اس کی دعا اور بد دعا میں اتنا اثر سمجھا جاتا ہے۔

☆======☆======☆

شام کے سات بجے تھے جب میں اور بلال شاہ ۳۶ گھنٹے کے طویل سفر کے بعد امرتسر سے سدہ پہنچے۔ اس وقت سدہ آزاد ایجنسی کا ایک مختصر سا قصبہ نما شہر تھا۔ بڑا بازار بس ایک ہی تھا۔ چند بستروں کا ایک ہسپتال حال ہی میں یہاں بنا تھا۔ آزاد ایجنسی کے دوسرے علاقوں کی طرح یہاں بھی پولیس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ پولیس کا کام خصادار فورس کرتی تھی۔ اس فورس میں فوج کی طرح نائیک، جمعدار اور حوالدار وغیرہ کے عہدے ہوتے ہیں۔ تھانے کی جگہ "پکٹ" ہوتی ہے۔ مجھے جس پکٹ میں جانا تھا اس کا انچارج نائب صوبیدار ترا خان تھا۔ ترا خان کو میں اپنی آمد کی اطلاع پہلے ہی دے چکا تھا اور یہ بھی بتا چکا تھا کہ کس غرض سے یہاں آ رہا ہوں۔ ایک اغوا کیس کے سلسلے میں ترا خان پہلے بھی میری مدد کر چکا تھا۔

ترا خان نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ میزبانوں نے بتایا کہ پارہ چنار سے آگے افغانی پہاڑوں پر برف پڑی ہے اور یہ یخ بستہ ہوا انہی پہاڑوں کو چھو کر آ رہی ہے۔ ترا خان نے پٹھانوں کی روایات کے مطابق ہماری خاطر مدارت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ رات نو دس بجے جب ہم قہوے کی پیالیاں لے کر آتش دان کے ارد گرد بیٹھے تو ترا خاں نے ہمیں پیر پالے کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ اس نے کہا کہ پیر پالے کی دعا سے زیادہ اس کی بد دعا مشہور ہے اور لوگ اس سے جتنی عقیدت رکھتے ہیں اتنا ہی خوف بھی کھاتے ہیں۔ میرے ایک سوال کے جواب میں ترا خاں نے کہا۔ "خو اس کی خانقاہ میں نوجوان خادمائیں اور عورتیں وغیرہ تو ہوتا ہے لیکن کبھی کسی نے اس کے بارے میں کوئی شکایت نہیں کیا۔ ویسے بھی وہ اتنا بوڑھا ہے کہ اس کے بارے میں کوئی ایسا ویسا بات سوچا نہیں جا سکتا۔"

میں نے نائب صوبیدار ترا خاں سے پوچھا۔ "خان! تمہارا اپنا کیا خیال ہے۔ پیر پالے واقعی نیک آدمی ہے؟"

وہ بولا۔ "برادر! ام یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ ام اس سے صرف دو یا تین بار ملا ہے۔ ویسے ایک بات ام تم سے کہے گا۔ اگر تم پیر پالے کے خلاف کوئی ایکشن لینا چاہتا ہے تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ یہاں کا لوگ یہ برداشت نہیں کرے گا اور خواہ مخواہ کا فساد کھڑا ہو جائے گا۔ پیر پالے اچھا ہے یا برا لیکن اس کے ہاتھ میں شفا ضرور ہے۔ پچھلے آٹھ دس برس میں سینکڑوں ہزاروں مریض اس کے ہاتھ سے صحت یاب ہو چکا ہے۔"

میں نے ترا خاں کو یقین دلایا کہ ہم اپنے مہربان میزبانوں کے لیے کسی طرح کی کوئی

مصیبت کھڑی نہیں کریں گے۔

اگلے روز علی الصبح ہم تراخاں کے ساتھ اس کی جیپ میں پیر پالے کی خانقاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ شہر سے خانقاہ کا فاصلہ قریباً دس میل تھا۔ یہ سارا راستہ ناہموار اور سنسان تھا۔ کہیں کہیں پتھروں اور گارے سے بنے ٹیڑھے میڑھے مکان نظر آجاتے تھے۔ نہ کہیں کوئی کھیتی نہ باغ۔ اس سارے علاقے پر غربت ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ آخر ہم ایک سیاہی مائل ٹیلے کے دامن میں پہنچے۔ یہاں قدیم طرز کی ایک خانقاہ تھی۔ چھوٹے چھوٹے گنبدوں اور محرابوں والی یہ خانقاہ قریباً دو کنال جگہ پر پھیلی تھی۔ خانقاہ کے سامنے ایک وسیع احاطہ تھا اور احاطے کی پتھریلی چار دیواری اور خانقاہ کے گنبدوں پر رنگ برنگے بے شمار جھنڈے لگے تھے۔

احاطے کے سامنے ایک بڑا دروازہ تھا۔ جس سے لوگ آجا رہے تھے۔ ہمیں اپنی جیپ خانقاہ سے قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر چھوڑنا پڑی۔ باقی کا راستہ ہم نے پاپیادہ طے کیا۔ جلد ہی ہمیں پیر پالے کا ''دیدار نصیب'' ہو گیا۔ خانقاہ کے ایک برآمدے میں مجمع لگا تھا اور ایک عجیب الخلقت انسان اس مجمعے کے بیچوں بیچ بیٹھا تھا۔ اس کے سر اور چہرے کے بال جٹاؤں کی صورت لٹک رہے تھے۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا اور اس کی عمر واقعی سو سال کے لگ بھگ نظر آتی تھی، یہی پیر پالے تھا۔ وہ بہت دھیمی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک جواں سال شخص اس کے منہ سے کان لگائے بیٹھا تھا، جو کچھ پیر پالے کہتا تھا وہ جواں سال شخص اونچی آواز میں دہرا دیتا تھا۔ حاضرین یہ ''فرمودات'' بڑی توجہ اور عقیدت سے سن رہے تھے۔ کیونکہ یہ سب کچھ گاڑھی پشتو میں تھا اس لیے میرے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

میں اور بلال شاہ نائب صوبیدار کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتے پیر پالے کی پچھلی جانب جا بیٹھے۔ یہاں بھی عقیدت مند موجود تھے۔ پیر پالے سے ہمارا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اب ہم زیادہ اچھے طریقے سے اس کا حلیہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ چمڑے کے ایک بوسیدہ اور غلیظ لباس میں تھا۔ اس لباس میں کئی جگہ چمڑے ہی کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں اس کی کمزور جان اتنا بھاری بھرکم لباس کیسے اٹھا لیتی تھی۔ پیر پالے کے جسم پر میل کی تہیں تھیں اور جسم سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے لیکن اس کے پیروکاروں کے لیے شاید یہ بو عطر کی طرح تھی۔ وہ اس سے نزدیک تر ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ دس پندرہ منٹ تک پیر پالے کی تقریر جاری رہی۔ پھر پیر پالے احاطے کے وسط میں ایک اونچے پتھر پر جا بیٹھا۔ اسے دو نوجوان سہارا دے کر وہاں تک لے گئے تھے۔ ان نوجوانوں نے گیروا لباس پہن رکھے تھے۔ اسی رنگ

کے لباس والے دو تین اور نوجوان بھی مجھے نظر آئے۔ پیر پالے پتھر پر بیٹھ گیا تو وہ جواں سال شخص بھی اس کے پاس جا بیٹھا جو اس سے پہلے مترجم کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ یہ شخص سرخ و سپید رنگت کا مالک تھا اور شکل و صورت سے کچھ پڑھا لکھا بھی نظر آتا تھا۔ اس شخص کے پاس لکڑی کا ایک چوکور ڈبہ تھا۔ اس نے ڈبے کا ڈھکن اٹھایا تو اس میں مٹی کے کئی لوٹے نظر آئے۔ ان سب لوٹوں پر سبز رنگ کیا گیا تھا۔

بہت سے عقیدت مندوں نے ایک قطار بنالی اور باری باری پیر پالے کے پاس پہنچنے لگے۔ وہ سب اپنی جسمانی اور روحانی بیماریوں کے علاج کے لیے پیر پالے کے پاس پہنچ رہے تھے۔ بڑی عاجزی سے سر جھکا کر وہ پیر پالے سے اپنا اپنا مسئلہ بیان کرتے۔ پیر پالے سر جھکائے خاموشی سے سنتا رہا...... ہاں سرخ و سپید رنگ والا جواں سال شخص کبھی کبھی کوئی سوال بھی پوچھ لیتا۔ پھر وہ سبز لوٹوں میں سے کسی ایک لوٹے میں ہاتھ ڈالتا اور ایک پڑیا نکال کر پیر پالے کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ پیر پالے یہ پڑیا ضرورت مند کو دے دیتا۔ ضرورت مند بڑی عقیدت سے جھک کر کئی بار سلام کرتا اور الٹے پاؤں چلتا ہوا پتھر سے نیچے آجاتا۔ پتھریلی سیڑھیوں کے پاس ہی ایک گھڑا رکھا تھا وہ حسب توفیق اس گھڑے میں نذرانہ ڈالتا اور باہر نکل جاتا۔

یہ کارروائی قریباً ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی۔ پھر ایکا ایکی سرخ رنگ والا شخص اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ علاج معالجے کا وقت ختم ہو گیا۔ جو مرد و زن رہ گئے تھے وہ مایوسی سے منہ لٹکا کر رہ گئے۔ گیروا لباس والے نوجوانوں نے حسب سابق پیر پالے کو بازوؤں سے تھام کر سہارا دیا اور بہ آہستگی چلاتے ہوئے اس حجرے میں لے گئے جہاں کسی بھی مرد کا داخلہ ممنوع تھا۔ خدمت گار نوجوان بھی حجرے کے دروازے پر جا کر ٹھہر گئے۔ اندر سے دو پردہ نشین عورتوں کے ہیولے برآمد ہوئے اور یہ ہیولے پیر پالے کو حجرے میں لے گئے۔

دفعتاً کسی نے زور سے میری کمر پر چٹکی کاٹی۔ میں نے گھوم کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ یہ ایک چادر پوش پہاڑن تھی۔ طویل و عریض سیاہ چادر نے آنکھوں کے سوا اس کے قریباً سارے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ چٹکی کاٹنے کے بعد وہ اپنی جگہ رکی نہیں بلکہ نپے تلے قدموں سے چلتی ایک ستون کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا، وہ بالکل لاتعلق کھڑی تھی۔ ایک پردہ پوش عورت سے ایسی حرکت کی توقع مجھے ہرگز نہیں تھی۔ مجھے شبہ ہونے لگا کہ شاید یہ عجیب و غریب حرکت کسی اور نے کی ہے...... لیکن چند لمحے بعد

جب اس عورت کی نگاہیں مجھ سے ملیں اور اس نے ''پٹاخ'' سے مجھے آنکھ ماری تو سارا شک و شبہ ختم ہو گیا۔ عورت کی یہ دوسری حرکت اتفاقاً بلال شاہ نے بھی دیکھ لی تھی۔ وہ حیران لہجے میں بولا۔ ''خان صاحب! یہ کیا چکر ہے۔ کوئی پرانی واقف کار لگتی ہے آپ کی۔''

بلال شاہ کی سنی اَن سنی کرتے ہوئے میں عورت کی طرف گیا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی رہی۔ قریب جا کر میں نے غور سے اس کی آنکھوں کو دیکھا تو یہ منظر کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ اس سے پہلے کہ میں کسی نتیجے پر پہنچتا۔ عورت نے چادر اپنے چہرے سے کھسکا دی۔ ''لگتا ہے میرے اور آپ کے ستارے بار بار ٹکرا رہے ہیں۔'' وہ کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔

میں حیران رہ گیا۔ میرے سامنے کملا سنہا کھڑی تھی۔ یہ دوسری تیسری بار تھی کہ وہ اس طرح اچانک میرے سامنے آ گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''تم یہاں کیسے؟''

وہ بولی۔ ''جیسے آپ...... آپ چالان مکمل کرنے کے لیے تفتیش کرتے ہیں، میں اسٹوری مکمل کرنے کے لیے کرتی ہوں۔ ویسے بھی...... آپ کا ساتھ کچھ اچھا سا لگنے لگا ہے۔ پتہ نہیں کیا بات ہے کہ......''

وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی، لیکن جہاں اس کی زبان خاموش ہوئی وہیں سے اس کی خوبصورت آنکھوں نے بولنا شروع کر دیا اور یہ وہی بات تھی، جس کو سمجھنے کی کوشش میں ہزاروں سال سے مرد کا بیڑا غرق ہو رہا ہے۔ اس خوبرو برہمن زادی کی نیت میں مجھے شروع سے کچھ گڑبڑ نظر آ رہی تھی۔ اب یہ ''گڑبڑ'' کچھ اور واضح ہو کر سامنے آ گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''میرے خیال میں تمہاری میری اتنی بے تکلفی نہیں ہوئی کہ تم مجھے یوں چٹکیاں کاٹتی پھرو۔''

وہ بولی۔ ''میں نے چٹکی بے تکلفی جتانے کے لیے نہیں کاٹی۔ میرے پاس آپ کے لیے ایک بے حد اہم اطلاع ہے۔''

''کیسی اطلاع؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''میں نے ایک کھوج لگایا ہے۔ آپ نے وہ پڑیاں دیکھی ہیں جو پیر پالے اپنے مریضوں کو دے رہا تھا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ ''میرا خیال ہے، میں جان گئی ہوں کہ وہ پڑیاں کس چیز سے بنتی ہیں اور کون بناتا ہے انہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کب سے ہو یہاں؟''

وہ بولی۔ ''پچھلے پانچ روز سے جان ہتھیلی پر لیے پھر رہی ہوں...... اور پتہ ہے کس کی خاطر؟ اچھا پھر کبھی بتاؤں گی۔'' وہ ایک دم بات بدل کر بولی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ایک چنچل سی سرخی نظر آ رہی تھی۔

''خیر...... اب کیا چاہتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ اپنے ساتھیوں سے کہیں کہ وہ واپس چلے جائیں۔ میں اور آپ یہیں رہیں گے۔ شام سے ایک گھنٹہ پہلے یہ خانقاہ بالکل خالی کر دی جاتی ہے۔ خانقاہ کے خاص خادموں کے سوا کوئی یہاں نہیں رک سکتا لیکن ہم دونوں رک جائیں گے۔ کیسے رکیں گے؟ یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی اور وہ چیز بھی دکھاؤں گی جو یہاں کے سادہ لوح لوگوں کی نگاہ سے اب تک اوجھل ہے۔''

میں نے تیزی سے سوچا اور فیصلہ کیا کہ مجھے کملا کی بات مان لینی چاہیے۔ میں نارمل قدموں سے چلتا واپس بلال شاہ اور نائب صوبیدار کے پاس پہنچا۔ وہ برآمدے میں دوسرے عقیدت مندوں کے درمیان کھڑے تھے اور چائے کی سبیل سے چائے ملنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ واپس چلے جائیں میں آج رات یا کل صبح خود ہی آ جاؤں گا۔ کملا کے بارے میں مَیں نے ان کو بتا دیا کہ وہ ایک مشہور ہندی اخبار کی رپورٹر ہے اور اسی سلسلے میں یہاں گھوم رہی ہے، جس سلسلے میں ہم آئے ہیں۔

بلال شاہ مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگا۔ ''خان صاحب! پچھلے کچھ دن سے مجھے بہت بری بری ''خوابیں'' آ رہی ہیں۔ آپ ذرا احتیاط سے کام لیں۔ کچھ لوگ واقعی کالی زبان والے ہوتے ہیں۔ جو بددعا دیں تو فوراً لگ جاتی ہے۔ میرا مطلب ہے یہ پیر پالے......''

''کچھ نہیں کر سکتا، یہ پیر پالے۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''اور جہاں تک برے برے خوابوں کا تعلق ہے تم رات کو کھانا کھاتے ہی سو نہ جایا کرو۔ جتنا کھانا تم کھاتے ہو تمہیں چاہیے کہ کھانے کے بعد کم از کم امرتسر سے جالندھر تک دوڑ لگاؤ۔''

وہ بولا۔ ''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں خان صاحب! مجھے تو لگتا ہے کہ پیر پالے کی بددعا سے پہلے ہی برے وقت کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ یہ جو خوبصورت بلا آپ کے ارد گرد گھوم رہی ہے کہیں کوئی نقصان ہی نہ کر جائے آپ کا۔''

میں نے کہا۔ ''بلال شاہ، اس میں تمہارا قصور نہیں، تمہاری فطرت ہی ایسی ہے۔ جہاں کوئی عورت میرے ارد گرد دیکھتے ہو تمہارے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگتا ہے، میرے خیال میں یہ کوئی نفسیاتی بیماری ہے۔ مجھے واپس جا کر تمہیں کسی ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔''

اس شام تو میں اور کملا اپنے پروگرام پر عمل نہ کر سکے، کیونکہ شام سے دو ڈھائی گھنٹے پہلے ہی اچانک گیروا لباس والے خادموں نے خانقاہ لوگوں سے خالی کروالی۔ غالباً وہ فرش اور دیواریں وغیرہ دھونا چاہتے تھے لیکن اگلے روز ہمیں موقع مل گیا۔ ہم ساڑھے چار پانچ بجے

تک خانقاہ میں زائرین کے درمیان گھومتے پھرتے رہے۔ پھر کملا نے مجھے اشارہ کیا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا اندرونی برآمدوں میں آ گیا۔ یہاں بڑے بڑے طاقدانوں میں چربی کے چراغ جل رہے تھے اور چربی کی بو در و دیوار میں رچی بسی تھی۔ منقش لکڑی کا ایک قدیم زینہ برآمدے سے کسی بالکونی یا گنبد میں جاتا تھا۔ اس زینے کے نیچے ایک تاریک سا خلا بن گیا تھا۔ اس خلا کے پاس پہنچ کر کملا کچھ دیر نارمل انداز میں کھڑی رہی۔ میں نے دیکھا سیاہ چادر کے اندر سے اس کی حسین و جمیل آنکھیں کسی وحشت زدہ ہرنی کی آنکھیں لگتی تھیں۔ وہ بڑے تیزی سے قرب و جوار کا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر ایک دم اس نے میرا بازو تھاما اور مجھے لے کر زینوں کے تاریک خلا میں گھس گئی۔ یہ بڑی مختصر سی جگہ تھی۔ بمشکل دو مربع فٹ رہی ہو گی۔ ہم ایک دوسرے سے چپکے کھڑے تھے۔ کملا کے گداز نشیب و فراز میرے جسم سے پیوست تھے۔ بلال شاہ مجھے اس حالت میں دیکھتا تو جھگڑالو سوکن کی طرح مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتا۔

ہم چار پانچ منٹ خاموشی سے اپنی جگہ کھڑے رہے۔ خانقاہ کے کمروں اور برآمدوں میں لوگوں کے چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے کملا کے کان میں سرگوشی کی۔ ''اور کتنی دیر یہاں رکنا ہوگا؟''

''کیوں کیا بات ہے؟'' اس نے عجیب لہجے میں پوچھا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ اتنی خوبصورت تنہائی میں کھڑے ہو اور پھر بھی پریشان ہو۔ تم انسان ہو کہ مٹی کے مادھو ہو۔

''پھر بھی کچھ پتہ تو چلے۔'' میں نے کہا۔

''بس آدھ پون گھنٹہ۔'' اس نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی جھیل جیسی گہری آنکھوں پر سایہ کرنے والی پلکیں دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں۔ بظاہر وہ کوشش کر رہی تھی کہ مجھ سے دور ہٹ کر کھڑی ہو لیکن یہ ''کوشش'' صرف مجھے دکھانے کے لیے تھی۔ ورنہ میری طرح وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ ایسی مختصر جگہ میں ہم اسی طرح کھڑے ہو سکتے ہیں۔ وہ ایک دفعہ پہلے بھی مجھ سے اسی طرح لپٹی تھی لیکن اس واقعے اور آج کے واقعے میں بہت فرق تھا۔ اس وقت اسے کوڑا بردار قبائلی پیٹ رہا اور وہ خوف سے لرز رہی تھی لیکن آج اس کے جسم میں ایک خاموش طوفان سا کروٹیں لے رہا تھا۔

دھیرے دھیرے خانقاہ کی چہل پہل کم ہو رہی تھی۔ آخر آدھ پون گھنٹے میں وہاں قریباً خاموشی چھا گئی۔ اب صرف اکا دکا خادمین کی مدھم آوازیں ابھر رہی تھیں۔ کملا نے دس پندرہ منٹ مزید انتظار کیا پھر مجھے لے کر وہ زینوں کے نیچے سے نکلی۔ ایک ستون کی اوٹ

میں رک کر کچھ دیر برآمدے کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر میرے ہمراہ تیزی سے ایک آہنی دروازے میں داخل ہو گئی۔ سفید رنگ کے اس دروازے پر سارا دن ایک لٹھ بردار خادم کھڑا رہا تھا لیکن اب یہ انتظام نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم آگے پیچھے چلتے ایک راہداری میں داخل ہوئے اور پھر چند زمین دوز زینوں تک پہنچ گئے۔ میرے لباس میں سرکاری ریوالور موجود تھا اور میں اسے کسی بھی وقت ہاتھ میں کر سکتا تھا۔ وہ کل آٹھ زینے تھے۔ زینوں کے آخر میں ایک اور دروازہ نظر آیا۔ دروازے کو کنڈی لگائی گئی تھی لیکن کنڈی میں تالا نہیں تھا۔ کملا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے محتاط رہنے کا اشارہ دیا اور پھر بڑی چابکدستی سے آواز پیدا کیے بغیر کنڈی کھول دی۔ ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ کملا نے دروازہ پھر بند کر دیا۔

''آپ کی دائیں جانب طاق میں ماچس اور چراغ ہے۔'' کملا کی سرگوشی ابھری۔ میں نے اندھیرے میں ٹٹول کر چراغ روشن کیا۔ تہہ خانے میں مدھم روشنی پھیل گئی ایک جانب دیوار گیر الماری نظر آ رہی تھی۔ اس الماری میں بہت سی انگریزی دوائیں ڈبوں اور بوتلوں میں بند رکھی تھیں۔ بالکل کسی ڈسپنسری کا منظر نظر آ رہا تھا۔ ایک جانب گولیاں وغیرہ پیسنے کے لیے دو بڑے بڑے ہاون دستے رکھے تھے۔ ان ہاون دستوں کے پاس ہی سفید کاغذ کی پڑیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ کملا نے ایک پڑیا اٹھا کر مجھے دکھائی۔ اس پر پشتو میں کچھ لکھا تھا۔ وہ سرگوشی میں بولی ''اس لفظ کا مطلب ہے شفا کی مٹی...... ان سب پڑیوں پر یہی لفظ لکھا ہے لیکن ان کے اندر ''شفاء کی مٹی'' کی بجائے انگریزی دوائیں ہیں۔ سب میں گولیاں پیس کر بھری ہوئی ہیں۔ کسی میں اسپرین ہے، کسی میں کونین، کسی میں پنسلین اور اینٹی بائیوٹک۔ وہ سرخ و سپید رنگ والا شخص جو خود کو مسلمان ظاہر کرتا ہے، حقیقت میں ہندو ہے۔ جگدیش کمار نام ہے اس کا۔ میں نے اس کمرے میں اس کی ساری باتیں سنی ہیں۔ میرے خیال میں وہ کسی ڈاکٹر کا کمپاؤنڈر رہا ہے۔ خانقاہ میں آنے والے ہر مریض کے لیے ''شفاء کی مٹی'' کا انتخاب وہی کرتا ہے لیکن پڑیا وہ اپنے ہاتھ سے نہیں دیتا بلکہ پیر پالے کو تھما دیتا ہے......''

دفعتاً میں چونک گیا۔ کہیں بالکل پاس سے مجھے باریک مدھم سی آواز آئی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا یہ آواز ایک روشن دان سے پھوٹی تھی۔ یہ روشن دان فرش سے قریباً پندرہ فٹ کی بلندی پر تھا اور اسے لکڑی کے تختے جوڑ کر بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ دواؤں والی الماری پر چڑھ کر اس روشن دان تک پہنچا جا سکتا ہے۔ مگر مسئلہ لکڑی کے تختوں کو اکھاڑنے کا تھا۔ یہ تختے کافی مضبوطی سے جڑے نظر آتے تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا یہ روشن دان پیر پالے کے حجرے میں کھلتا تھا اور اسی لیے اسے تختے لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ روشن دان تک پہنچنے کی کوشش کی جائے یا نہیں کہ اچانک سامنے والی دیوار پر ایک سایہ لرزا۔ میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ میری یہ عجلت کام آ گئی ورنہ لوہے کی میخوں والی ایک نہایت وزنی لاٹھی کملا کا سر لہولہان کر دیتی۔ میں نے یہ وار لاٹھی کے درمیان سے اپنے ہاتھ پر روکا اور پھر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ٹانگ کی بھرپور ضرب حملہ آور کی چھاتی پر ماری۔ وہ پشت کے بل دواؤں والی الماری سے ٹکرایا۔ کئی شیشیاں لڑھک کر فرش پر گریں اور چکنا چور ہو گئیں۔ کملا کے ہونٹوں سے دبی دبی چیخ نکلی اور وہ ایک کونے میں سمٹ گئی۔ اس سے پہلے کہ حملہ آور سنبھل کر دوسرا وار کرتا اور مجھے دفاع پر مجبور ہونا پڑتا۔ میں نے جوابی حملہ کیا اور لپک کر اس کی گردن اپنے بائیں بازو میں جکڑ لی۔ اس کے ساتھ ہی میں گھوم کر اس کی پشت پر آیا اور میرا 38 بور ریوالور اس کی کنپٹی سے جا لگا۔

"خبردار!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

جونہی حملہ آور ذرا ڈھیلا پڑا کملا نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے لاٹھی چھین لی۔ ہم تھوڑی دیر اپنی اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ مجھے خطرہ تھا کہ بوتلیں ٹوٹنے کی آواز سن کر کوئی اس طرف متوجہ ہو جائے گا لیکن حیران کن طور پر ایسا نہیں ہوا۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ کوئی اس طرف نہیں آئے گا تو میں نے گیروا لباس والے ہٹے کٹے خادم کی گردن میں ریوالور کی نال گھسیڑی اور اسے حکم دیا کہ وہ اپنے پیرو مرشد کا دیدار کرائے۔

چند ہی لمحے بعد ہم پیر پالے کے "حجرہ شریف" کے سامنے کھڑے تھے۔ دروازے کے سامنے پہنچ کر خادم اڑیل ٹٹو کی طرح رک گیا۔ "نہیں ام...... آگے نہیں جائے گا۔" وہ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔

"تیرا تو باپ بھی جائے گا۔" میں نے اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔

"دیکھو...... تم...... تم جو کوئی بھی ہے پیر پالے کا بددعا نہ لو۔ تمہارا زندگی برباد ہو جائے گا۔ اس چار دیواری سے اپنے قدموں سے چل کر باہر نہیں جائے گا تم۔"

میں نے اس کی کھوپڑی پر ریوالور کا دستہ جمایا۔ "ایسی تیسی تیرے پیر پالے کی۔ چل دروازہ کھول ورنہ بھیجہ نکال کر ہاتھ پر رکھ دوں گا۔"

خادم لرزتا کانپتا آگے بڑھا۔ اس نے بند دروازے پر دستک دی۔ کملا نے اس سے پشتو میں کچھ کہا۔ غالباً یہ کہا تھا کہ وہ پشتو جانتی ہے اس لیے وہ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرے۔ ذرا دیر بعد اندر سے ایک نسوانی آواز ابھری۔ جواب میں خادم نے کچھ کہا۔ اندر سے کنڈی گرا کر دروازہ کھول دیا گیا۔ ایک پٹھان دوشیزہ نے سر نکال کر باہر دیکھا۔

میں نے خادم کو زور سے دھکا دیا اور دروازہ کھولتا ہوا پیر پالے کے حجرے میں گھس گیا۔ دروازہ کھولنے والی لڑکی چیخی اور اس کے ساتھ ہی اندر سے دو اور نسوانی چیخیں ابھریں۔ میں نے دیکھا نحیف و نزار پیر پالے ایک دوشیزہ کی گود میں سر رکھے نیم دراز تھا۔ دوسری دوشیزہ غالباً اس کے پاؤں دبا رہی تھی۔ اب ان دونوں کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ کملا نے پھرتی کے ساتھ حجرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ یہ ایک مضبوط دروازہ تھا اور اس میں اندر کی طرف لوہے کا بولٹ لگا ہوا تھا۔ باہر سے زبردستی دروازہ کھولنے کی کوشش کی جاتی تو یہ کام آسان نہیں تھا۔ اس ٹھٹھری ہوئی تاریک شب میں اس ویران خانقاہ کے حجرے میں ایک پیر نما بدبودار بوڑھا اپنی تین خادماؤں، ایک خادم اور دو "مہمانوں" کے ساتھ بند ہو چکا تھا۔

یہ ایک وسیع حجرہ تھا اور اس کے اندر بھی دو کمرے موجود تھے۔ میں نے ڈری سہمی ہوئی خادماؤں کو فوراً ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اب بڑے حجرے میں پیر پالے اور ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ حجرے کے طاقوں میں خوشبودار چراغ جل رہے تھے۔ دیواریں اور چھت منقش لکڑی کی تھی۔ فرش پر نمدے بچھے تھے۔ اور حجرے کے بیچوں بیچ ایک گڑھے میں کوئلے دہک رہے تھے۔ پیر پالے اپنی گھنی سفید بھنوؤں کے پیچھے سے یک ٹک ہمیں دیکھ رہا تھا۔ ضعیف لوگوں کی طرح اس کا سر مسلسل ہلتا چلا جا رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" وہ بہت مدھم آواز میں بولا۔ مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ وہ پشتو آمیز لہجے میں اردو بول سکتا ہے۔

میں نے کہا۔ "ہم تمہاری بددعا لینے آئے ہیں۔ سنا ہے کہ تم بندے کو کھڑے کھڑے راکھ کر دیتے ہو۔"

"کیا بک بک کرتے ہو۔" وہ پوپلے منہ میں زبان گھما کر بولا۔ اس کی آواز بمشکل سنی جا سکتی تھی۔

میں نے جیب سے شفا کی مٹی والی پڑیا نکالی اور اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا ہے؟"

پیر پالے کا ہلتا ہوا سر کچھ اور زور سے ہلنے لگا...... اس کے بعد پیر پالے اور ہم دونوں کے درمیان قریباً ڈیڑھ گھنٹہ مسلسل بات چیت ہوئی۔ اس بات چیت کی تفصیل بیان کرنے لگا تو آپ کو کئی صفحات پڑھنے پڑیں گے۔ مختصراً یہ کہ میں نے پیر پالے پر پورا دباؤ ڈالا اور اس سے اس بات کا اعتراف کرا لیا کہ ان پڑیوں میں شفا کی مٹی نہیں بلکہ انگریزی دوائیں

پیس کر ڈالی گئی ہیں (مریضوں کو چکر دینے کے لیے ان پڑیوں میں تھوڑی بہت چکنی مٹی بھی ڈال دی جاتی تھی) پیر پالے نے کہا کہ اس نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا اگر پہنچایا ہوگا تو فائدہ ہی پہنچایا ہوگا۔ اس کا کہنا تھا کہ علاقے کے سادہ لوح لوگ انگریزی علاج کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اس لیے اس نے اپنے مریضوں کو یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ وہ ان کو انگریزی دوائیں دے رہا ہے۔

ظاہر ہے اس کی یہ دلیل قطعی ناقابلِ قبول تھی۔ اس نے اپنی پیری فقیری چمکانے کے لیے ایک مدت سے یہ پڑیوں والا ڈھونگ رچایا ہوا تھا اور عین ممکن تھا کہ اس کی "خاکِ شفا" سے کئی لوگ خاک میں بھی مل چکے ہوں۔ پیر پالے اس بات کی وضاحت بھی نہ کر سکا کہ وہ نوجوان لڑکیوں کو اپنے حجرے میں کیوں رکھتا ہے اور جو خدمت یہ لڑکیاں انجام دیتی ہیں وہ مرد کیوں انجام نہیں دے سکتے؟ اس کا کہنا تھا کہ یہ لڑکیاں اپنی مرضی اور خوشی سے یہاں رہ رہی ہیں اور وہ انہیں اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھتا ہے لیکن جب میں نے ان لڑکیوں سے بات کی تو ایک لڑکی نے ایک ایسی بات بھی بتائی جس سے پیر پالے کا کہا غلط ثابت ہو گیا۔ کوئی باپ اپنی بیٹی سے مرد اور عورت کے تعلقات کے بارے میں کھل کر بات نہیں کرتا لیکن پیر پالے ایسا کرتا تھا بلکہ وہ اس گفتگو میں اس حد تک آگے نکل جاتا تھا کہ کوئی شریف آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ لڑکیوں سے کہتا تھا کہ اس طرح کھل کر باتیں کرنے سے انسان کی روح میں دو کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ ایک کھڑکی میں سے اچھی سوچیں تازہ ہوا کے ساتھ اندر آتی ہیں اور دوسری کھڑکی میں سے بری سوچیں باہر نکل جاتی ہیں۔ یہ "دو کھڑکیاں" کھولنے کے لیے یہ جنونی بوڑھا لڑکیوں سے گھنٹوں مرد اور عورت کے نازک تعلقات پر باتیں کرتا تھا۔ وہ لڑکیوں سے شرمناک سوال پوچھتا تھا اور ان سے کہتا تھا کہ وہ بھی اس سے سوال کریں۔ وہ عورتوں اور مردوں کی خاص بیماریوں کے بارے میں بھی نوجوان لڑکیوں سے بلا روک ٹوک گفتگو کرتا تھا۔ تاہم تینوں لڑکیوں نے یہ دعویٰ کیا کہ پیر پالے یا اس کے کسی خادم نے کبھی ان کے ساتھ کوئی نازیبا حرکت نہیں کی۔

ان تین لڑکیوں میں شاہینہ بھی شامل تھی۔ اس نے اپنے باپ کا نام صمد خاں بتایا اور اقرار کیا کہ وہ گل حسن کی تایازاد بہن ہے۔ میں نے تینوں لڑکیوں سے علیحدہ علیحدہ بھی بات کی۔ شاہینہ چاہتی تھی کہ وہ اس ماحول سے نکل جائے لیکن والدین کی بے عزتی اور عزیز و اقارب کے طعنوں کا خوف اتنا زیادہ تھا کہ وہ ایسا سوچتے ہوئے ڈرتی تھی۔ پھر پیر پالے کی بددعا کا ڈر بھی اس کے ذہن پر مسلط تھا۔ دوسری لڑکی کا نام یاسمین تھا۔ اس کی اپنی

کوئی رائے نہیں تھی۔ اگر کوئی اچھا سبب لگ جاتا اور وہ یہاں سے نکل سکتی تو یہ بھی اسے قبول تھا دوسری صورت میں وہ باقی ماندہ زندگی اس چار دیواری میں بھی گزار سکتی تھی۔ تیسری لڑکی اپنی مرضی سے یہاں رہ رہی تھی اور یہیں رہنا چاہتی تھی۔ ان تین لڑکیوں کے علاوہ کچھ بڑی اور درمیانی عمر کی عورتیں اس خانقاہ میں موجود تھیں۔

رات قریباً نو بجے حجرے کے بلند و بالا دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے شاہینہ سے کہا کہ وہ دروازہ کھولے۔ دروازے کی دوسری جانب وہی سرخ و سپید شخص تھا جس کا نام کملا نے جگدیش کمار بتایا تھا اور جو پیر پالے کے لیے انگریزی دواؤں کی پڑیاں وغیرہ بناتا تھا۔ جگدیش اکیلا تھا۔ میں نے اسے بھی کالر سے پکڑ کر حجرے کے اندر کھینچ لیا۔ اب اس خانقاہ کے دو اہم ترین کردار پیر پالے اور جگدیش میرے ریوالور کے نشانے پر تھے۔

اس رات پیر پالے اور میرے درمیان طویل مذاکرات ہوئے۔ پہلے پہلے تو پیر پالے اور اس کے دستِ راست جگدیش نے بڑا غیض و غضب دکھایا اور مجھے اس دلیرانہ گستاخی پر انتہائی سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں لیکن جب میں نے بھی تیور دکھائے اور انہیں بتایا کہ خصادار فورس میرے ساتھ آئی ہے اور ہم ان پر بڑا پکا ہاتھ ڈالنے والے ہیں تو جگدیش کمار جو زیادہ جوش دکھا رہا تھا قدرے نرم پڑ گیا۔ اس موقع پر میں جگدیش کمار کو ایک طرف اکیلے لے گیا۔ میں نے اسے صاف لفظوں میں کہا۔ "دیکھو، تمہاری اصلیت کھل چکی ہے۔ اتنے جوتے پڑیں گے کہ سر پر ایک بال نہیں رہے گا اور یہ ضدی بڈھا بھی بری طرح ذلیل و خوار ہو گا۔ اس صورتِ حال سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔"

"کیا؟" جگدیش کمار کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

میں نے کہا۔ "جو عورتیں اس خانقاہ سے جانا چاہتی ہیں انہیں پیر پالے اپنی رضامندی سے چھوڑ دے اور آئندہ کے لیے یہ عہد کرے کہ کسی نئی عورت یا لڑکی کو خانقاہ میں نہیں لایا جائے گا۔ میرے خیال میں جو عورتیں اس خانقاہ میں موجود ہیں وہ اس کی خدمت گاری کے لیے کافی ہیں اور اب اس کی زندگی بھی کتنی باقی رہ گئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ چھ سات سال اور نکال لے گا۔"

جگدیش نے کہا۔ "پیر صاحب اپنے معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔ باقی آپ کے کہنے پر میں کوشش کرتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "کوشش کر کے تم مجھ پر کوئی احسان نہیں کرو گے۔ اپنا روزگار اور پیر پالے کی عزت بچاؤ گے۔"

جگدیش اقرار میں سر ہلاتا ہوا پیر پالے کی طرف چلا گیا۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ پیر پالے پر گہرا اثر رکھتا ہے اور اگر کوئی پیر پالے کو اس سمجھوتے پر آمادہ کر سکتا ہے تو وہی ہے۔ جگدیش اور پیر پالے میں ایک گھنٹہ گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے جگدیش کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان کے پاس حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں کسی سمجھوتے پر پہنچ جائیں ورنہ اس کے بعد خانقاہ پر باقاعدہ چھاپہ پڑے گا اور سب کو دھر لیا جائے گا۔

میں نے جو حکمتِ عملی اختیاری تھی وہ کامیاب رہی اور بالآخر پیر پالے کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر شاہینہ اور یاسمین کو چھوڑنے پر راضی ہو گیا۔ تاہم باقی عورتوں کے بارے میں اس نے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ وہ سب کی سب عمر رسیدہ ہیں اور اپنی خوشی سے یہاں رہ رہی ہیں۔

بہر طور میں جو کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ کر چکا تھا۔ میں نے پیر پالے سے کہا کہ وہ کل ان دونوں لڑکیوں کو "خدمت" سے آزاد کرنے کا اعلان کرے اور یہ اعلان اس طرح ہو کہ کسی کو اس بارے میں کسی طرح کا شبہ نہ رہے۔

پیر پالے نے مجھے خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "ویسے تم جو کر رہے ہو اچھا نہیں کر رہے ہو۔" اس کے لہجے میں کمزوری کے ساتھ ساتھ نمایاں بے بسی بھی تھی۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ "میری طرف سے تمہیں آزادی ہے پیر پالے۔ تم جس طرح کی بددعا چاہو، مجھے دے سکتے ہو۔ میری نیت صاف اور دل مطمئن ہے اور میرا ایمان ہے کہ مارنے والے سے بچانے والا بہت طاقتور ہے۔"

دو روز بعد پیر پالے نے دونوں لڑکیاں اپنی "دلی رضا مندی" کے ساتھ اپنی خدمت سے آزاد کر دیں اور ان کے والدین سے کہا کہ اگر وہ چاہتے ہیں تو ان لڑکیوں کی شادیاں اپنی خواہش کے مطابق کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں کے سامنے ہم نے پیر پالے کو اس "نیکی" پر مجبور کیا تھا وہ پیر پالے کے خاص آدمی تھے۔ انہوں نے کسی کو نہیں بتایا کہ پیر پالے کے اس اعلان کے پیچھے کیا راز ہے۔ عام عقیدت مندوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ پیر صاحب کو کوئی بشارت وغیرہ ہوئی ہے۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے خادماؤں کو آزاد کر دیا ہے۔

اپنے کامیاب مشن کے بعد میں اور بلال شاہ کرم ایجنسی سے واپس گورداسپور آ گئے۔ کملا دو روز پہلے ہی آ چکی تھی امرتسر پہنچ کر میں نے سب سے پہلے گل حسن اور ثمر سے ملاقات کی اور ان دونوں کو یہ خوشخبری سنائی۔ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا

بھی ہو سکتا ہے اور وہ لڑکی جو پیر پالے کی خدمت میں جا چکی تھی اس کی رضا مندی اور آشیر باد سے آزاد ہو سکتی ہے...... جیسا کہ میں نے بتایا ہے، ہر وقت اَن دیکھی موت کا خوف سہہ سہہ کر ثمر بیمار رہنے لگی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اچانک اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ ایسے میں گل حسن اس کے ہاتھ پاؤں کی مالش کرتا گلوکوز وغیرہ پلاتا تو اس کی طبیعت بحال ہوتی۔ اس وقت بھی وہ زرد پھول کی طرح نظر آ رہی تھی۔ میری "خوشخبری" سن کر اس زرد پھول کی پتیوں میں ہلکا ہلکا گلابی رنگ شامل ہونے لگا۔ وہ لیٹی ہوئی تھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور کالے گھونگھٹ کی اوٹ سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کی سہمی ہوئی آنکھوں سے آج امید کی کرنیں پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ثمر بی بی! آج سے کچھ عرصہ پہلے تم نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا، یہ پوچھا تھا کہ کیا کسی طرح میرے خاوند کی زندگی نہیں بچ سکتی؟ آج میں اس سوال کا جواب لے کر آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ نے چاہا تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے اور اکبر خاں کے خاندان سے تم لوگوں کا خونی جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔"

میری بات سن کر ثمر کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چمکنے لگے۔ مسرت کے یہ آنسو میرے لیے بڑے سے بڑے ایوارڈ اور اعزاز سے بڑھ کر تھے۔

اُسی روز میں نے سعد خاں اور ملک بخت سے ملاقات کی اور انہیں بتایا کہ گل حسن نے ان کی شرط قبول کر لی ہے۔ شاہینہ نامی لڑکی کو پیر پالے کی "خدمت" سے آزاد کرا لیا گیا ہے اور اس کا رشتہ شاہین خان سے کر دیا جائے گا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر یہ سارے معاملات طے ہو گئے۔ لڑکی کے والدین کو بھی اس رشتے پر رضا مند کر لیا گیا۔ (لڑکی اور لڑکے یعنی شاہینہ اور شاہین خاں میں پہلے سے بھی معمولی جان پہچان موجود تھی)

ان تمام معاملات سے فارغ ہونے میں مجھے قریباً تین ہفتے لگ گئے۔ قبائلی قاتلوں سے گل حسن کی جان چھوٹ گئی تو مجھے یوں لگا کہ میری اپنی جان بھی کسی بڑی مصیبت سے چھوٹ گئی ہے۔ میں کئی روز بعد تھانے پہنچا اور اپنے دفتر میں بیٹھا تو اچانک کملا سنہا کا خیال آ گیا۔ کرم ایجنسی سے آنے کے بعد اس سے ایک بار بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اس بات پر حیرانی ہوئی کیونکہ وہ یوں نچلی بیٹھنے والی نہیں تھی۔ میں نے بلال شاہ کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ رپورٹر کملا سنہا تو یہاں نہیں آئی تھی۔ بلال شاہ نے کہا۔ "نہیں میری موجودگی میں تو نہیں آئی۔"

سات آٹھ روز بعد اپنے سنتری خدا بخش کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ جن دنوں میں دوبارہ کرم ایجنسی گیا ہوا تھا کملا تین چار دفعہ میرا پوچھنے آئی تھی۔ اس کا والد اسے اپنے ساتھ ولایت لے کر جا رہا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ جانے سے پہلے وہ ایک بار مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ آخری بار جب وہ میرا پتہ کرنے آئی تو بلال شاہ نے اسے بتایا کہ انسپکٹر صاحب کی شادی خانہ آبادی ہو رہی ہے اور وہ اس سلسلے میں ایک ماہ کی چھٹی لے کر گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ سنتری نے کہا، شاہ صاحب نے مجھ سے بھی جھوٹ بلوایا اور مجھے بھی میم صاحبہ کے سامنے یہی بات کرنا پڑی۔ میم صاحبہ کچھ دیر گم صم بیٹھی رہیں پھر اٹھ کر چلی گئیں۔ اس کے بعد وہ دوبارہ نہیں آئیں۔''

مجھے بلال شاہ پر غصہ تو آیا کہ اس نے میرے بارے میں جھوٹ بولا تھا لیکن ہر برائی میں قدرت نے اچھائی بھی چھپا رکھی ہوتی ہے۔ میں سوچنے لگا کہ بلال شاہ ایسا نہ کرتا تو معلوم نہیں اس اوٹ پٹانگ لڑکی کی حماقتیں کہاں تک پہنچتیں اور اس سے جان چھڑانے کے لیے مجھے کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑتے۔

☆======☆======☆

ظالم شوہر

کسی نے سچ کہا ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے اور وہ دین دھرم، ذات پات کو نہیں دیکھتی، یہ شیشے کی طرح نازک ہوتی ہے لیکن اس سے ٹکرا کر پتھر بھی ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ وادیٔ کشمیر میں کھیلے جانے والے عشق و محبت کے ڈرامے کی سنسنی خیز داستان!

یہ لدھیانہ کے ایک نواحی قصبے کا واقعہ ہے۔ کچھ محلے داروں نے مجھ سے شکایت کی کہ دربار سنگھ نے گھر میں ایک نوجوان لڑکی رکھی ہوئی ہے اور اس پر بڑا ظلم کرتا ہے۔ میں اس تھانے میں نیا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ شکایت کرنے والوں کا اصل مقصد کیا ہے۔ ہوسکتا تھا وہ دربار سنگھ سے کوئی دشمنی لینا چاہتے ہوں۔ بہرحال اس معاملے کو دیکھنا ضروری تھا۔ میں نے ان لوگوں کو واپس بھیج دیا اور اپنے ساتھی بلال شاہ سے کہا کہ وہ دربار نامی اس شخص کے بارے میں ٹوہ لگائے۔

بلال شاہ نے اگلے روز شام کو مجھے اپنی رپورٹ دی۔ اس نے بتایا کہ دربار سنگھ کے گھر میں واقعی ایک لڑکی ہے۔ پڑوسیوں کا کہنا ہے کہ وہ اسے بیاہ کر لایا ہے۔ لڑکی خود بھی اقرار کرتی ہے کہ وہ اس کا شوہر ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ وہ اسے مارتا پیٹتا ہے اور کام بھی بہت لیتا ہے۔ دربار سنگھ ایک کھاتا پیتا زمیندار تھا۔ گاؤں کا اصل چوہدری اپنے دو بھائیوں سمیت چند ماہ پہلے قتل ہوگیا تھا۔ اس کا خانہ خراب ہونے کے بعد ایک طرح سے اب دربار ہی چوہدری تھا۔ وہ ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے تھانے میں پہنچتے ہی میرا استقبال کیا تھا اور گھی کے کنستر، مرغیوں کے ٹوکرے، چاول کی بوریاں اور کئی مہینے کا راشن زبردستی میرے گھر میں ڈھیر کر گئے تھے...... بعدازاں رشوت کا یہ سارا سامان میں نے ایک ایک شخص کے گھر واپس پہنچایا تھا اور انہیں کہا تھا کہ فی الحال مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ میری اس حرکت سے قصبے والوں نے صرف اتنا نتیجہ نکالا تھا کہ میں بڑا آکڑ خان تھانیدار ہوں اور میری رشوت کا ریٹ بہت زیادہ ہوگا۔

خیر بلال شاہ کی زبانی لڑکی کے بارے میں سن کر میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ دربار سنگھ سے ملا جائے۔ اگلے روز میں نے اسے تھانے بلا بھیجا۔ وہ سر کے بل بھاگا ہوا آیا۔

بڑی خوشامد سے ملا۔ اپنے باغ سے قلمی آموں کی دو پیٹیاں بھی وہ ساتھ ہی لے آیا تھا۔ میں نے ایک ڈیڑھ گھنٹہ اس سے گفتگو کی اور اس کے بارے کوئی اندازہ قائم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ دربار سنگھ عرف دربارا ایک لمبا تڑنگا سکھ تھا۔ عمر قریباً پینتیس سال تھی۔ چہرے سے سخت گیر اور غصیلا نظر آتا تھا۔ وہ کل چار بھائی تھے۔ سب سے چھوٹا بھائی شہر میں سرکاری ملازم تھا۔ باقی دو بھائی دربارے کے ساتھ رہتے تھے اور زمینداری میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ سب بھائی شادی شدہ تھے لیکن دربارے کی بیوی کوئی آٹھ سال پہلے فوت ہوچکی تھی۔ میں نے دربارے سے اس لڑکی کے بارے کرید لگانے کی کوشش کی جسے اب اس کی بیوی کہا جاتا تھا۔ دربارے نے بتایا کہ اس کا نام نرملا ہے۔ وہ تراگ بل کشمیر کی رہنے والی ہے اور مذہب کی سکھ ہے۔ دربارے نے بتایا کہ وہ غریب خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ لوگ ایک وقت کی روٹی کے محتاج تھے۔ کچھ عرصہ پہلے دربارا کام کے سلسلے میں تراگ بل گیا تو اس لڑکی کو بیاہ لایا۔

کہنے کو تو دربارے نے اپنی چرب زبانی سے مجھے مطمئن کردیا لیکن دل سے شک پوری طرح دور نہیں ہوا۔ دربارے کے جانے کے بعد میں نے اس کی گفتگو پر جتنا غور کیا۔ میرا شک اتنا ہی پھلتا پھولتا گیا۔ اس لڑکی کے سلسلے میں ضرور دال میں کچھ کالا تھا۔ اگر ایسا نہیں تھا تو دربارے کو کیا ضرورت تھی اپنی بیوی کے بارے میں اتنی تفصیل سے بتانے کی۔ وہ بس اتنا کہہ سکتا تھا کہ وہ لڑکی میری دوسری بیوی ہے۔ وہ تو اس کی پوری ہسٹری شیٹ کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ لڑکی کے ذکر پر صاف طور پر گھبرایا ہوا بھی تھا۔

دربارا اور اس قصبے کے دوسرے لوگ ابھی میرے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں نے ان کی اس بے خبری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور وقتی طور پر ایک روایتی تھانیدار بن گیا۔ میں نے چند روز قصبے میں خوب دعوتیں اڑائیں۔ گانے بجانے کی دو محفلوں میں بھی شرکت کی اور چند ایک نذرانے بھی قبول کرلئے..... حیلے بہانے سے میں نے دربار سنگھ کو بھی میزبانی کا شرف بخشنا شروع کردیا۔ اپنی اس کامیابی پر وہ پھولا نہیں سماتا تھا۔ اس کے گھر میں آمدورفت شروع کرکے میں نے پورے قصبے کے سامنے اس کا سر فخر سے بلند کردیا تھا۔ اب وہ ہر کسی پر میری یاری کا رعب گانٹھ سکتا تھا۔ ہر قصبے کا پٹواری اور نائب تحصیلدار بھی ان محفلوں میں شریک ہوتا تھا۔ وہ سارے مجھے اپنے رنگ میں رنگ کر بڑے خوش ہورہے تھے۔ دربارے کی حویلی میں آنے جانے سے جہاں مجھے قصبے کے کئی خفیہ رازوں کا پتہ چلا وہاں اس لڑکی سے بھی ملاقات ہوئی جسے دربارے کی بیوی کہا جاتا تھا۔ اگر کسی وقت میں اور دربارا

اکیلے بیٹھے ہوتے تو دربارا اسے بلا جھجک اندر بلا لیتا۔ کبھی وہ شربت کے گلاس لے کر، کبھی پکوڑوں کی تھال لے کر اور کبھی حقے کو تازہ کر کے اندر آتی رہتی تھی۔ وہ بڑی مسکین لڑکی تھی۔ جسم دبلا پتلا اور جاذب نظر، چہرہ معصوم، آنکھیں بڑی بڑی اور خوفزدہ، چال میں عجیب طرح کی تیزی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی اس کے پیچھے پیچھے ڈنڈا لئے پھر رہا ہو کہ اگر وہ تیز نہ چلی تو اس کا سر پھاڑ دے گا۔ اس کی عمر بمشکل بیس سال رہی ہوگی۔ رنگ بالکل سفید تھا۔ وہ بہت کم بولتی تھی۔ آٹھ دس دنوں میں میں نے اس کے منہ سے صرف تین لفظ سنے تھے۔ ''اچھا..... ہاں...... ناہیں۔'' دربارے نے بتایا کہ یہ پنجابی یا اردو نہیں بول سکتی، کوشش کر رہا ہوں آہستہ آہستہ سیکھ جائے گی۔ لڑکی حاملہ تھی اور اسے مشین کی طرح کام کاج کرتے دیکھ کر افسوس ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے جھاڑیں بھی مسلسل پڑتی رہتی تھیں۔ کبھی اس کی ساس کی آواز آتی۔

''حرامزادی چنڈال! کہاں مرگئی ہے۔ دودھ کو ڈھک کر رکھ۔ تیرا باپو ابھی میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔ منہ ڈال گیا تو روتی رہے گی بیٹھ کر۔''

کبھی اس کی دیورانی چیخ کر کہتی۔ ''خصم کھانی، جلدی پاؤں نہیں اٹھتا تجھ سے۔ جا دیکھ کون آیا ہے دروازے پر۔''

کبھی اس کے دیوروں کی گالی گلوچ سنائی دینے لگتی۔ گھر کے ماحول سے اندازہ ہوتا تھا کہ صرف دربارا ہی نہیں گھر کے سارے لوگ اسے مارنا پیٹنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ایک دن میں گھر میں داخل ہوا تو ایسی آوازیں آئیں جن سے پتہ چلا کہ کوئی دیور صاحب نرملا کو پیٹ رہے ہیں اور دیورانی چھڑانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کچھ دیر بعد جب ہنگامہ ختم ہوا تو دربارا مسکراتا ہوا اندر آگیا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی بیوی کو مارا پیٹا جا رہا تھا۔ میں بھی جان بوجھ کر ایسی باتوں پر کان نہیں دھرتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی میں بڑی للچائی ہوئی نظروں سے نرملا کی طرف دیکھتا اور جب وہ چلی جاتی تو دربارے سے اس کے متعلق الٹے سیدھے سوال کرنے لگتا۔ وہ خبیث بھی میری باتوں کا بالکل برا نہیں مناتا تھا۔ یہ محسوس کر کے کہ میں نرملا میں دلچسپی لیتا ہوں اس کی آنکھوں میں بڑی شیطانی سی چمک لہرانے لگتی۔ دربار سنگھ کے رویے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ نرملا کو بیوی سے زیادہ کھیل تماشہ سمجھتا ہے۔ اسے یہ بھی احساس نہیں کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ شاید وہ اس بچے کو اپنا بچہ ہی نہیں سمجھتا تھا۔

ایک روز دربار سنگھ نے محفل میں وہسکی کی بوتل کھول کر میرے علاوہ نائب تحصیلدار اور پٹواری کی بھی خاطر تواضع کی۔ پینے پلانے کا شغل شروع ہوا۔ میں پہلے ہی سر درد کا بہانہ

کر کے جان چھڑا چکا تھا۔ پیتے پیتے تینوں سکھ مدہوش ہوگئے۔ دربار سنگھ واہی تباہی بکنے لگا۔ ہاتھ لہرا لہرا کر وہ سمجھانے لگا کہ اپنی عورتوں کو کس طرح قابو میں رکھنا چاہئے۔ سمجھانے کے ساتھ ساتھ وہ عورتوں اور رن مرید مردوں کو فحش گالیاں بھی دے رہا تھا۔ یہ گالیاں بڑی عجیب وغریب تھیں۔ بہت پیچ دار اور تہہ در تہہ۔ شیطان بھی سن لے تو اس کے کان سرخ ہو جائیں۔ یوں لگتا تھا ہم دربار سنگھ کے گھر میں نہیں کسی جوئے خانے میں بیٹھے ہیں۔ کچھ دیر بعد اپنی مردانگی اور اپنے ٹھیکے کا عملی ثبوت دینے کے لئے دربارے نے اپنی بیوی کو للکارا۔

''نرملا۔ او نرملا حرامزادی، ادھر آ۔''

اگلے ہی لمحے وہ تیز تیز چلتی آگئی۔ دربار سنگھ نے ہاتھ لہرا کر کہا۔ ''چل یہ برتن اٹھا لے سارے۔'' اس بیچاری نے جلدی جلدی برتن سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیئے۔ وہ جھول کر بولا۔ ''یہ تھانیدار صاحب ہیں، تھکے ہوئے آئے ہیں۔ چل پاؤں دبا ان کے۔'' میں نے جلدی سے پاؤں سمیٹ لئے۔ ''نہیں دربارے میں ٹھیک ہوں۔'' دربارے نے اصرار کیا کہ میں پاؤں ضرور دبواؤں۔ کہنے لگا۔ ''اس کے ہاتھ میں بڑی کرامت ہے۔ آدمی کشمیری سیب کی طرح تر و تازہ ہو جاتا ہے۔'' میں نے انکار کیا تو اس نے اسے نائب تحصیلدار اور پٹواری کے پاؤں دبانے پر لگا دیا۔ وہ جھجکتی ہوئی بیٹھ گئی اور انگلیوں کی پوروں سے ان کی ٹانگیں دبانے لگی۔ وہ چیخ کر بولا۔

''صحیح طرح دبا کتیا۔ جان نہیں ہاتھوں میں۔ دیہاڑی میں آٹھ آٹھ روٹیاں پھاڑ جاتی ہے۔''

تحصیلدار اور پٹواری مخمور قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک عورت کی یہ تذلیل مجھ سے اور برداشت نہیں ہوئی۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا بھائیو! میں چلتا ہوں۔''

مجھے اٹھتے دیکھ کر تحصیلدار اور پٹواری کا مزہ بھی کرکرا ہو گیا۔ انہوں نے بھی جانے کے لئے پر تولے۔ وہ لہراتے ہوئے اٹھے اور ڈگمگاتے ہوئے میرے ساتھ چل دیئے۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے دیکھا دربارا نشے میں چور اپنی بیوی کو قریباً گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اگر یہی میاں بیوی کا رشتہ تھا تو پھر اس رشتے سے جتنی بھی نفرت کی جاتی کم تھی۔

☆======☆======☆

تین چار روز بعد کی بات ہے میں گھوڑے پر سوار ایک ساتھ والے گاؤں سے آ رہا تھا۔ قصبے کے چھوٹے کنوئیں کے پاس سے گزرا تو ایک منظر دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ دربار سنگھ اپنے لمبے

کیس کھولے ایک لنگوٹ پہنے کنویں کے اولو میں نہا رہا تھا۔ نہانے کے لئے وہ ایک بالٹی استعمال کر رہا تھا۔ بالٹی بھر بھر کر اپنے بالوں بھرے جسم پر ڈالتا تھا اور سر کو زور زور سے دائیں بائیں حرکت دیتا تھا۔ لگتا تھا انسان نہیں کوئی بلا نہا رہی ہے۔ کنواں چلانے کے لئے اس نے نرملا کو لگا رکھا تھا۔ بیل کی جگہ وہ کومل سی لڑکی زور لگا رہی تھی۔ اس کی حالت پر ترس کھا کر دو تین بچے بھی اس کی مدد کر رہے تھے۔ میں دربارے کی بے حسی اور بے غیرتی پر خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ وہ ایک جیتی جاگتی عورت سے جانوروں کا سلوک کر رہا تھا۔ مجھے نرملا پر بھی طیش آیا۔ اس میں ذرہ بھر دم خم نہیں تھا بالکل موم کی ناک تھی۔ جدھر سسرال والے موڑتے تھے مڑ جاتی تھی۔ یوں ڈری ہوئی رہتی تھی جیسے کوئی بہت بڑی مجرم ہو۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ظلم کرنے کے علاوہ ظلم سہنا بھی جرم ہے۔ ظلم سہنے والا اپنی بزدلی سے ظالم کو اور شیر کرتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر دربارا اس سے کہے کہ وہ کنویں میں چھلانگ لگا دے تو وہ صرف ایک بار ڈری ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھے گی اور پھر دھڑام سے چھلانگ لگا دے گی۔ دربارے کے ظلم اور نرملا کی بزدلی پر افسوس کرتا ہوا میں نظر چرا کر آگے نکل گیا۔ دربارے نے دور ہی سے مجھے دیکھ کر ست سری اکال اور واہگرو جی کے نعرے لگائے۔ میں نے بھی ہاتھ لہرا کر جواب دے دیا۔

غالباً یہ دوسرے روز کا واقعہ ہے۔ عصر کے وقت بلال شاہ مسجد میں نیند پوری کرنے کے بعد تھانے آیا تو اس نے ایک اہم خبر سنائی۔ اس نے بتایا کہ آج صبح دربار سنگھ کی بیوی کو لدھیانے لے جایا گیا ہے اس کی حالت بہت خراب تھی۔ پتہ نہیں بچتی بھی ہے یا نہیں۔ میں نے پوچھا کیا ہوا۔ کہنے لگا۔ ''پتہ نہیں جی کوئی عورتوں والی بیماری ہے۔'' میرے کان کھڑے ہوگئے۔ وہ امید سے تھی۔ اسے ہسپتال لے جانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ایک دو گھنٹے میں میرا خدشہ درست نکلا۔ دربار سنگھ کے ایک بھائی سے پتہ چلا کہ نرملا کا بچہ گر گیا ہے۔ آج صبح چھت سے اُترتے ہوئے وہ سیڑھیوں سے پھسل گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ لدھیانہ کے سرکاری ہسپتال میں ہے اور ابھی تک اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں۔

تین چار روز میں اس لڑکی کی طرف سے فکر مند رہا۔ میں نے اپنے ایک واقف کار کے ذریعے ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ کو سفارش بھی کروائی کہ وہ مریضہ کا دھیان رکھیں اور اس کے علاج پر توجہ دیں۔ دس پندرہ روز ہسپتال میں گزارنے کے بعد نرملا دوبارہ دربارے کے گھر آ گئی اور ایک بار پھر خدمت گاری کے فرائض انجام دینے لگی۔ اس کے واپس آنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ سیڑھیوں وغیرہ سے پھسلی نہیں تھی۔ اسے ساس نے مارا تھا۔ خود کو بچانے کے

لئے اس بیچاری نے ساس کو پرے ہٹایا۔ وہ بھاری بھر کم عورت دھکا لگنے سے خود ہی گر گئی۔ اس نے چیخ چیخ کر طوفان کھڑا کر دیا کہ بہو نے اس پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ دربارے کو پتہ چلا تو اس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے بیوی کو مارنا شروع کر دیا۔ اس کی ایک زوردار لات نرملا کے پیٹ پر پڑی اور اس کی حالت غیر ہوگئی۔

نرملا کے ہسپتال سے واپس آنے کے بعد ایک دن میں نے اسے غور سے دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ کافی خوبصورت اور سمارٹ ہے۔ اگر یہی عورت کسی کھاتے پیتے گھرانے میں ہوتی تو بیگم صاحبہ، مہارانی یا راج کماری کہلاتی۔ اُلو کے پٹھے دربارے نے اس پھول کو کچل مسل کر رکھ دیا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ دربارا اس لڑکی کے بارے میں کچھ بتائے کہ اسے کہاں سے اور کیسے لایا ہے۔ اس کے لواحقین اس سے ملنے آتے ہیں یا نہیں اور اگر نہیں آتے تو کیوں؟ کیا یہ بھی اپنے پچھلوں سے ملنا چاہتی ہے؟ میرے ان تمام سوالوں کے جواب دربارے نے نہیں دیئے اور اگر دیئے بھی تو اس طرح گول مول کر کے کہ بات واضح ہونے کی بجائے اور الجھ گئی۔ ایک روز مجھے دربارے پر بڑا غصہ آیا۔ جی چاہا کہ اسے پکڑ کر تھانے لے جاؤں اور چھترول کر کے سارا کچھ بکوا لوں۔ مگر یہ کام بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ دربارے کا سب سے چھوٹا بھائی جسے سارے بھائیوں نے مل کر پڑھایا لکھایا تھا۔ غریبوں کی بدقسمتی سے کسی محکمے میں جائنٹ سیکرٹری وغیرہ لگ گیا تھا۔ اب اس بھائی کا دربارے وغیرہ کو بڑا مان تھا۔ ان کا خیال تھا کہ بھائی کی نوکری کے ساتھ ہی انہیں بدمعاشی کا سرٹیفکیٹ مل گیا ہے۔ میرے پاؤں ابھی اس تھانے میں پکے نہیں ہوئے تھے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ فی الحال پیار محبت سے ہی کام لینا چاہئے اور ایسا موقع تلاش کرنا چاہئے جب نرملا کے بارے میں زیادہ باتیں معلوم ہوسکیں۔

وہ برسات کی ایک شام کا واقعہ ہے۔ موسم بڑا سہانا ہو رہا تھا۔ بارش ابھی ابھی ختم ہوئی تھی اور ہر چیز نہا دھو کر نکھر گئی تھی۔ میں دربارے کے گھر پہنچا تو وہ بوتل کھولے دھت بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر باغ باغ ہوگیا۔

بولا۔ ''آؤ...... آؤ بادشاہو۔ مجھ میں ایک بڑی کمزوری ہے جب نشہ کر لوں تو تاش کھیلے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شراب پی کر دو بازیاں نہ لگاؤں تو ایسے لگتا ہے سہاگ رات سو کر گزار رہا ہوں۔ اب تم آ گئے ہو تو ٹھیک ہے خوب بازی جمے گی۔''

وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور الماری سے تاش کی دو ڈبیاں لے آیا۔ پتے بانٹ کر کھیلنا شروع کر دیا۔ اس کا کھیل دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی آؤٹ ہوگیا ہے۔ جب اس نے

دوسری سر کھیلتے ہوئے تیسری دفعہ نہلے کی جگہ چھکا پھینکا تو میں نے پتے اس کے منہ پر مار دیئے۔ وہ کھسیانا ہو کر ہنسنے لگا۔ بولا۔

''واقعی یار...... میں تو کچھ زیادہ ہی چڑھا گیا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں چار گھنٹے پہلے ہی تمہارے بارہ بج گئے ہیں۔''

وہ ترنگ میں آیا اور میرے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ ''یار تھانیدار! تُو بڑا بیبا آدمی ہے۔ مجھے اپنا سجن سمجھتا ہے۔ میں بھی تجھے جان جگر سمجھتا ہوں۔ ویسے ایک بات بتا وہ کتے کی بچی تجھے کیسی لگتی ہے؟''

''کون؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

وہ ایک آنکھ میچ کر بولا۔ ''اوئے یہی نرملا۔''

میرے دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔ مگر فوراً ہی میں نے خود کو سنبھال لیا اور چہرے پر لوفر پن پیدا کر کے بولا۔ ''وہ تیرا مال ہے بھئی۔ ہم کون ہوتے ہیں یہ سوچنے والے۔''

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''دیکھ خواہ مخواہ ایسی بات نہ کر۔ تُو تھانیدار ہو گا تو اپنے گھر ہو گا۔ میں جھانپڑ مار دوں گا تیرے منہ پر۔ تُو کوئی وکھرا ہے مجھ سے...... بول...... بول کیسی لگتی ہے تجھے؟''

میں نے کہا۔ ''بس ٹھیک ہی ہے دربارے۔''

وہ کھی کھی کر کے شیطانی ہنسی ہنسنے لگا۔ مجھے پہلے دن ہی سے یقین تھا کہ اس نے کبھی نرملا کو اپنی بیوی نہیں سمجھا۔ وہ تو اسے صرف عیاشی کے لئے لایا تھا۔ وہ ایک صاف پانی کی چھوٹی سی ندی تھی۔ جو نہ جانے کس سرزمین سے بہتی ہوئی آئی تھی اور دربارا اس کے پانی میں اپنی غلاظتیں دھو رہا تھا اور کبھی کبھی تو مجھے شک ہوتا تھا کہ اس گھر میں نرملا واقعی ایک بہتی ندی کی طرح ہے جس میں ہاتھ دھونا گھر کا ہر مرد اپنا حق سمجھتا ہے۔ میں جانتا تھا دربارے کے بھائی بھی ایک سے ایک بڑھ کر خبیث ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے اس گھر میں نرملا کے ساتھ جو کچھ بھی ہو جاتا کم تھا۔

میں نے دربارے کے انداز میں ایک آنکھ میچ کر کہا۔ ''اوئے شیطان دے پتر اس لڑکی کے ساتھ پھیرے شیرے بھی کئے ہیں کہ ویسے ہی......''

وہ بولا۔ ''اوئے نہیں باؤ یار۔ پھیرے تو پورے کئے ہیں، قانونی کام میں کوئی کمی بیشی نہیں ہونی چاہئے۔ ورنہ تیرے جیسے تھانیدار یار مار بھی بن جاتے ہیں۔''

دربارے نے زور سے قہقہہ لگایا۔ میں نے بھی قہقہے میں اس کا ساتھ دیا۔

اس واقعے کے بعد یہ بات کھل گئی کہ دربارے کے لئے نرملا صرف نام کی بیوی ہے۔ اس کی عزت بے عزتی سے اسے کوئی سروکار نہیں اور ہو سکتا ہے چند ہفتے یا چند مہینے بعد جب اس کا دل بھر جائے تو اسے کسی اور کے ہاتھ بیچ ڈالے۔ بعد ازاں وہ با آسانی کہہ سکتا تھا کہ حرامزادی گھر سے بھاگ گئی ہے۔ وہ جس خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس میں ایسی باتوں کی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ میں نے دل میں ٹھان لی کہ دربارے کی ڈھکی چھپی پیشکش سے فائدہ اٹھا کر نرملا سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ دربارے کے گھر میری آمدورفت جاری رہی۔ دربارا سمجھ گیا کہ تھانیدار نرملا کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ وہ نرملا کو میرے پاس چھوڑ کر جان بوجھ کر ادھر اُدھر کھسکنے لگا۔ ایسے موقعوں پر میں نے نرملا کو کریدنے کی کوشش کی مگر بالکل ناکامی ہوئی۔ وہ پانچ دس لفظوں سے زیادہ کچھ نہیں بولتی تھی اور جو کچھ وہ بولتی تھی وہ میرے پلے نہیں پڑتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کشمیر کے کسی شمالی حصے کی رہنے والی تھی اور پشتو نما بولی بولتی تھی۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ نرملا کو سمجھنے کے لئے اسے اس گھر کی چار دیواری سے باہر لے جانا ہو گا۔ ایک دن میں نے اشارے اشارے میں دربارے سے اپنی بات کہہ دی۔ اس نے میری بات ایسی پکڑی جیسے مقناطیس کو مقناطیس پکڑتا ہے۔ ان معاملوں میں وہ بڑا سیانا تھا۔ میرے کہے بغیر ہی سب کچھ سمجھ گیا۔ یہ سوچ کر کہ تھانیدار اس کے ہاتھ آ گیا ہے۔ اس کے چہرے پر لالیاں دہکنے لگیں۔ باغ باغ ہو کر بولا۔

''صاحب یار! تیرے لئے تو جند جان حاضر ہے، کہے تو کلیجہ نکال کر تیرے ہاتھ پر رکھ دوں۔ اوئے ایسی دس درجن کڑیاں تیرے اشارے پر قربان۔ کب جا رہا ہے تُو چندی گڑھ؟''

میں نے کہا۔ ''آٹھ تاریخ کو۔''

وہ بولا۔ ''تو ٹھیک ہے۔ اس کو بھی ساتھ لے جا۔ چار پانچ روز اسے خوب سیر کرانا چندی گڑھ کی۔'' اس کے ساتھ ہی وہ حسب عادت ایک آنکھ دبا کر مسکرایا۔

میں نے اوپر اوپر سے انکار کیا تو وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔ کہنے لگا۔ ''نہیں نواز خان۔ میرا دل توڑے گا تُو۔ میں اسے اپنے ہاتھ سے گولی مار دوں گا۔ تُو سمجھتا کیا ہے مجھے۔ تجھے اب اسے ساتھ لے جانا ہی ہو گا۔''

میں دربارے کی اتنی محبت کی وجہ سمجھ رہا تھا۔ آج کل وہ ایک بیوہ عورت کی زمین پر قبضہ کرنے کے چکر میں تھا۔ میرے اور پٹواری کی مدد کے بغیر اس کا یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں کے لئے وہ کلیجہ ہاتھ پر لئے پھرتا تھا۔ کچھ پس و پیش کے بعد

میں نے اس کی بات مان لی۔ وہ خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا اور نرملا کو ضروری باتیں سمجھانے کے لئے گھر چلا گیا۔

☆======☆======☆

میں سادہ لباس میں تھا۔ ایک برقعے میں سمٹی سکڑی نرملا میرے ساتھ آگرا بس سروس کی بس میں بیٹھ کر چندی گڑھ کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے اس کی حالت دیکھ دیکھ کر ترس آ رہا تھا۔ کوئی بھیڑ بکری بھی اتنی فرمانبردار کب ہوگی۔ عید قربان پر خریدا ہوا کمزور بکرا بھی نئے مالک کے ساتھ جاتے وقت سرکشی دکھاتا ہے۔ مگر وہ تو مٹی کی مورت تھی۔ جہاں بٹھا دیا بیٹھ گئی۔ جہاں کھڑا کر دیا کھڑی ہو گئی۔ حکم دیا تو بولنے لگی۔ حکم دیا تو خاموش ہو گئی۔ میں اس وقت حیران ہوا جب اس نے میرے برابر سیٹ پر بیٹھنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی۔ پہلے میں سمجھا شاید وہ شرما رہی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ میرے برابر بیٹھنا میری توہین سمجھ رہی تھی۔ مجھے ڈر لگا کہ وہ نیچے فرش پر بیٹھ جائے گی اور ساری بس میں مذاق بنے گا۔ میں نے اس کا لرزتا کانپتا ہاتھ تھام کر اسے برابر میں بٹھا لیا۔ اس نے برقعہ بھی مضحکہ خیز انداز میں لپیٹ رکھا تھا۔ نقاب دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے پھانسی پانے والے مجرم کے سر پر غلاف چڑھایا گیا ہو۔ میں نے سرگوشیوں میں اسے نقاب درست کرنے کی ہدایت کی۔

چندی گڑھ جانے کی بجائے میں راستے ہی میں رائے نگر کے بس اڈے پر اُتر گیا۔ نرملا کو لے کر میں سیدھا پولیس چوکی پہنچا۔ چوکی کا انچارج سب انسپکٹر اجیت میرا جاننے والا تھا۔ میں نے اسے پہلے ہی سب کچھ بتا دیا تھا اور وہ ایک شخص کا انتظام کر چکا تھا جو کشمیری اور پشتو کے مختلف لہجے بولتا اور سمجھتا تھا۔ میں جب نرملا کو کسی تاریک کمرے کی بجائے پولیس چوکی لے آیا تو وہ بے حد حیران نظر آنے لگی۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ کشمیری شخص کا نام نونہال سنگھ تھا۔ وہ ایک مقامی کالج میں گیٹ کیپر تھا۔ اس نے میرے سامنے بیٹھ کر نرملا سے بات چیت شروع کی۔ نرملا پہلے تو ہچکچاتی رہی۔ پھر نونہال کے پے در پے سوالوں پر اس نے منمنا منمنا کر بولنا شروع کیا۔ اس نے جو پہلی بات بتائی وہ یہ تھی کہ وہ مسلمان ہے اور اس کا نام نرملا نہیں راحت جان ہے۔ نرملا کی یہ بات سن کر مجھے بہت حیران ہونا چاہئے تھا مگر پتہ نہیں کیوں مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ شاید ذہنی طور پر میں پہلے ہی یہ سمجھ رہا تھا کہ لڑکی وہ نہیں جو اسے بتایا جا رہا ہے۔ نونہال نے جب یہ پوچھا کہ وہ کس علاقے کی رہنے والی ہے اور اس کے والدین کون ہیں تو وہ ایک بار پھر سخت خوفزدہ نظر آنے لگی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ اسے سختی سے زبان بند رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ہمارے بار بار پوچھنے

اور زور دینے پر اس نے بتایا کہ وہ گلمرگ کی رہنے والی ہے اور اس کے باپ کا نام شاکر علی ہے۔ نونہال سنگھ نے نرملا یعنی راحت جان سے قریباً ایک گھنٹہ گفتگو کی۔ اس نے کبھی روتے ہوئے اور کبھی بہت سہمی ہوئی آواز میں نونہال کے سوالوں کے جواب دیئے۔ یہ گفتگو ختم کرنے کے بعد نونہال نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک سے ظاہر تھا کہ اسے اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ مجھ سے کہنے لگا۔

''جناب تھانیدار صاحب! آپ نے کبھی ''ہاتو'' کا نام سنا ہے؟''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ''جناب! ہاتو کشمیر کے مزدور پیشہ مسلمانوں کو کہتے ہیں۔''

اب مجھے اس کی بات پوری طرح سمجھ میں آئی۔ وہ ان کشمیری باشندوں کا ذکر رہا تھا جنہیں عام زبان میں ہاتو کہتے ہیں۔ ان دنوں پنجاب کے مختلف علاقوں میں یہ لوگ کثرت سے دیکھنے میں آتے تھے۔ ان کا وطن تو کشمیر تھا مگر سردی شروع ہوتے ہی یہ لوگ محنت مزدوری کے لئے میدانی علاقوں کا رخ کرتے تھے۔ دیواریں بناتے تھے، بوجھ اٹھاتے تھے، ایندھن کی لکڑیاں پھاڑتے تھے۔ غرض ہر وہ کام کرتے تھے جس میں انہیں چند پیسے ملنے کی امید ہوتی تھی۔ ان لوگوں کی پہچان ان کی بڑی بڑی گھیر دار شلواریں تھیں۔ راہ چلتے بعض لوگ ان کا مذاق اُڑانے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ خاص طور پر ہندو سکھ انہیں بہت نیچ درجے کا انسان سمجھتے تھے۔ یہ لوگ خون پسینہ ایک کر کے اور روکھی سوکھی کھا کر چند پیسے اکٹھے کرتے تھے اور سردیاں گزرتے ہی پھر اپنے وطن کی طرف منہ کر لیتے تھے، جہاں ان کے بچے اور ان کی عورتیں مہینوں سے ان کے انتظار میں ہوتی تھیں۔

نونہال سنگھ کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میری سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''یہ لڑکی بھی ہاتو ہے جناب۔ اسے دولت سنگھ نامی کسی ڈوگرے سردار نے دربار سنگھ کے ہاتھ تیس روپے میں فروخت کیا ہے۔ ڈوگرے سردار نے اس کے بوڑھے باپ، چھوٹے بھائی اور بیمار والدہ کو بھی بہت مارا پیٹا ہے۔ پتہ نہیں وہ تینوں زندہ بھی ہیں یا نہیں۔''

میں نے نونہال سنگھ سے پوچھا۔ ''اس ظلم کی وجہ کیا بتاتی ہے؟''

نونہال نے کہا۔ ''بتاتی ہے کہ ڈوگرے سردار نے اس پر بے حیائی کا الزام لگایا ہے۔ حالانکہ قصور سردار کے بیٹے مریک کا ہے۔ وہ اسے اور اس کے والدین کو بہت تنگ کرتا تھا۔ بجائے اس کے کہ دولت سنگھ اپنے بیٹے کو سمجھاتا بجھاتا اس نے شاکر علی کے گھرانے پر قیامت توڑ دی اور راحت کو راتوں رات دربار سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔''

یہ سب کچھ میرے لئے بہت سنسنی خیز تھا۔ میں ایک کیس کے سلسلے میں دو تین دفعہ پہلے بھی کشمیر جا چکا تھا۔ غالباً انہی صفحات میں آپ اس کیس کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔ مجھے معلوم تھا ریاست کے طول و عرض میں غریب مسکین مسلمانوں پر ڈوگروں اور ٹھاکروں کے ہاتھوں کیا بیتتی ہے۔ وہ ان کے لئے کیڑوں مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ ان دنوں ایک مسلمان کی جان کی قیمت دو روپے تھی۔ قاتل حکومت کو اٹھارہ روپے جرمانہ ادا کرتا تھا جن میں سے دو روپے مرنے والے کے وارثوں کو دیئے جاتے تھے...... ان حالات میں ایک بے سہارا مسلمان لڑکی کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ لڑکی جو کچھ کہہ رہی ہے وہ بہت حد تک سچ ہے۔ نونہال سنگھ کے ذریعے میں نے لڑکی سے کئی سوالات پوچھے، اس تمام پوچھ گچھ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ دربار سنگھ کے خلاف ایک مضبوط کیس بنتا ہے اور اسے زیر دفعہ 365 حراست میں لیا جا سکتا ہے لیکن اس وقت دربار سنگھ کو حراست میں لینے کی میں نے خاص ضرورت نہیں سمجھی۔ ابھی پانچ چھ دن تک دربارے کو میری طرف سے کوئی شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس دوران میں آسانی سے اس معاملے کی تفتیش کر سکتا تھا۔ اگر پانچ چھ دن سے زیادہ ٹائم لگتا تو بھی کسی طرح دربارے کو چکر دیا جا سکتا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ یہیں سے کشمیر روانہ ہو جاؤں تاکہ لڑکی کے بیان کی چھان بین ہو سکے۔

☆======☆======☆

کشمیر فلک بوس چوٹیوں، سرسبز مرغزاروں، ٹھنڈے چشموں اور گنگناتے جھرنوں کی سرزمین میرے سامنے تھی۔ ہماری بس جو مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی بل کھاتے پہاڑی راستے پر چنگھاڑتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

ہمارے چاروں طرف چنار، دیودار اور چیڑ کے درخت تھے۔ ان درختوں کے درمیان ڈوگرے، سکھ اور مسلمان مرد و زن روزمرہ کے کاموں میں مصروف نظر آتے تھے۔ علاقے کے باقی باشندوں میں سے مسلمانوں کو پہچاننا بہت ہی آسان تھا۔ ان کے پھٹے پرانے کپڑے، مدقوق چہرے اور ڈری ڈری حرکات دور ہی سے ان کی لاچاری کا بھانڈا پھوڑ دیتی تھیں۔ ان کی حالت قابلِ رحم تھی۔ ایک جگہ میں نے مسلمان مزدوروں کی ایک طویل قطار دیکھی جو گردنوں پر نمک کے بڑے بڑے ڈھیلے اٹھائے چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ اس قطار میں ستر سال کے بوڑھے سے لے کر پانچ سال کے بچے تک شامل تھے۔ ایک ڈوگرا سپاہی ہاتھ میں کوڑا لئے بڑی شان سے ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا...... دیکھنے کو تو وہاں بہت سے مناظر دیکھے لیکن یہ منظر میری آنکھوں میں آج بھی تازہ ہے۔ ایک طویل اور جان گسل سفر

کے بعد ہم رات کوئی نو بجے گلمرگ پہنچ سکے۔ راحت جان کا گھر گلمرگ کی آبادی سے چند فرلانگ دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں تھا۔ رات کی تاریکی میں ہم پاپیادہ ہی اس گاؤں کی طرف بڑھنے لگے۔ سخت سرد ہوا لباس اور کھال میں سے گزر کر ہڈیوں کو چھو رہی تھی۔ میں سوچنے لگا سرما میں یہاں کیا حال ہوتا ہوگا۔ بستی کی گلیوں میں آوارہ کتے بھونک رہے تھے۔ راحت جان نے ایک خستہ حال گھر کے بوسیدہ دروازے پر دستک دی اور سہم کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ دروازے کی درزوں میں لالٹین کی روشنی چمکی اور کسی نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر ڈری ہوئی آنکھوں سے باہر جھانکا۔ اس نے کچھ پوچھا۔ میرے مترجم نونہال سنگھ نے آگے بڑھ کر اس سے بات کی۔ باہر جھانکنے والا شخص جو ایک ساٹھ ستر سالہ شخص تھا۔ بُری طرح گھبرا گیا۔ اس کی نگاہیں برقعے میں لپٹی ہوئی راحت جان پر لگی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ وہ ہم تینوں کو دروازے پر ہی چھوڑ کر واپس ہو جائے گا اور دروازہ اندر سے بند کر لے گا۔ مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ بوڑھے کی آنکھوں میں محبت نے جوش مارا اور اس نے لپک کر راحت جان کو گلے سے لگا لیا۔ وہ ''بابا'' کہہ کر اس سے لپٹ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ یہی راحت جان کا باپ شاکر علی ہے۔ وہ بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں راحت جان کو اندر لے گیا۔ جب راحت جان نے مڑ کر ہم دونوں کو دیکھا اور باپ سے کچھ کہا، تب اسے معلوم ہوا کہ ہم دونوں کو بھی اندر آنا ہے۔ بوڑھے نے ڈری ہوئی نظروں سے ہمارے چہروں کا جائزہ لیا جیسے اسے ڈر ہو کہ گھر میں گھستے ہی ہم انسان سے خونخوار جانور بن جائیں گے اور ہر جاندار کو چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے۔ راحت جان نے اپنے باپ کے کان میں کچھ اور کھسر پھسر کی تو وہ ہمیں اندر لانے پر رضامند ہو گیا۔ گھر کے باقی مکین بھی جاگ گئے تھے۔ ان میں لمبے چغے والی ایک بیمار سی عورت تھی۔ ایک سات آٹھ سالہ بچہ تھا۔ ایک گھونگھٹ والی عورت تھی جس کی بغل میں ریں ریں روتی ہوئی ڈیڑھ دو سالہ بچی تھی۔ خستہ حال مکان میں کچے فرش پر پھٹے پرانے لحاف بکھرے پڑے تھے۔ ایک کانگڑی میں آگ جل رہی تھی اور مٹی کا دیا تاریکی کو بھگانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وقتی طور پر تو راحت کے والدین کی نگاہوں میں اس کے لئے محبت کی چمک نظر آئی، مگر پھر اس محبت کی جگہ خوف آمیز بیگانگی نے لے لی۔ وہ ناراض لہجوں میں اس سے کھسر پھسر کرنے لگے۔ راحت جان خوف سے پیلی ہو رہی تھی۔ میں نے نونہال سے کہا کہ وہ اس بوڑھی بوڑھے کو ٹوکے، اس نے آگے بڑھ کر راحت کے والدین سے بات چیت شروع کی۔

ہم یہ جان کر حیران رہ گئے کہ شاکر علی اور اس کی بیوی اپنی بیٹی کے بیان کو جھٹلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہوں نے جو بات بتائی وہ بالکل مختلف تھی۔ انہوں نے کہا کہ کوئی چھ ماہ پہلے انہوں نے راحت جان کی شادی قصبے کے ایک نوجوان مقبول سے کر دی تھی۔ مقبول اسے لے کر یہاں سے چلا گیا تھا۔ لگتا ہے اپنے خاوند سے اس کی کچھ اَن بن ہو گئی ہے۔ مقبول کی بات پر راحت جان نے رونا شروع کر دیا تھا۔ میں نے نونہال کے ذریعے راحت سے مقبول کے بارے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس نے اب تک مقبول کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ مقبول سے اس کا جھوٹ موٹ کا نکاح ضرور پڑھایا گیا تھا مگر اس کا اصل مالک دربار سنگھ تھا اور وہ پہلے دن سے اب تک اس کے پاس رہی ہے۔

میں نے راحت سے پوچھا۔ ''جھوٹ موٹ نکاح کی بات تمہیں کس نے بتائی؟''

وہ بولی۔ ''دربار سنگھ نے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ نکاح تو لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے کیا تھا۔ اصل میں تو میں اس کی بیوی ہوں۔''

میں نے پوچھا۔ ''وہ نکاح تمہاری مرضی سے ہوا تھا؟'' راحت جان روتی ہوئی نفی میں سر ہلانے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ''کس نے زبردستی کی تھی؟''

لڑکی نے جواب دینے سے پہلے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی کڑی نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی۔ باپ بھی گم صم بیٹھا تھا۔ لڑکی سسکی لے کر چپ ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ والدین کے سامنے اس سے مزید پوچھ گچھ فضول ہے۔ میں نے بوڑھے بوڑھی کو باہر بھیج دیا اور اس سے کہا کہ وہ کھل کر سب کچھ بتائے۔ ہم یہاں ان کی مدد کے لئے آئے ہیں۔ مگر میری بات کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے جیسے اچانک ہی زبان پر تالہ لگا لیا تھا۔ ہم نے بہت کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی اس کے رویے سے ظاہر تھا کہ وہ والدین سے بہت ڈرتی ہے اور ان کی حکم عدولی کا خیال بھی نہیں کر سکتی۔

لڑکی کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے دوبارہ بوڑھے بوڑھی کا رخ کیا۔ انہیں بہت سمجھایا کہ وہ بغیر خوف کے ساری بات بتائیں۔ ہم یہاں ان کی مدد کے لئے آئے ہیں اور انہیں ہمارے ہوتے ہوئے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمام باتیں ان پر بے اثر ثابت ہوئیں۔ وہ بس خوفزدہ نظروں سے ہمیں دیکھتے رہے۔ زیادہ زور ڈالا تو راحت کی ماں پر غشی طاری ہونے لگی اور اس کا باپ رو رو کر ہاتھ جوڑنے اور فریاد کرنے لگا۔ بوڑھی عورت پہلے ہی بیمار تھی میں نے سوچا کہیں اور مصیبت کھڑی نہ ہو جائے۔ میں نے ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ یہ بات اب میں صاف طور پر سمجھ چکا تھا کہ کسی زبردست شخص کا خوف

ان کے سر پر سوار ہے اور اس خوف نے ان میں زبان کھولنے کی ہمت نہیں چھوڑی۔

وہ رات نونہال سنگھ اور میں نے راحت کے بوڑھے باپ شاکر علی کے گھر گزاری۔

صبح منہ اندھیرے ہم وہاں سے نکل آئے۔ آنے سے پہلے ہم نے راحت جان اور اس کے والدین کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ ہمارے بارے میں کسی سے ذکر نہ کریں۔ اس کے علاوہ راحت جان کی واپسی کا بھی کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہئے۔ ہم یہ باتیں نہ بھی سمجھاتے تو خطرے کی بات نہیں تھی۔ شاکر علی اپنی زبان کھول کر خود کو مصیبت میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ شاکر علی کے گھر سے نکلنے کے بعد ہم کچھ دیر گلمرگ جانے والے راستوں پر گھومتے رہے۔ دن چڑھتے ہی ہم گلمرگ پہنچ گئے۔ ہمارا رخ دولت سنگھ کی حویلی کی جانب تھا۔ یہی شخص راحت جان اور اس کے گھر والوں کی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار تھا اور اس شخص کا خوف تھا جو ان کو زبانیں بند رکھنے پر مجبور کر رہا تھا...... دولت سنگھ کی حویلی وسیع و عریض تھی۔ حویلی کے سامنے ایک وسیع میدان تھا۔ اس گراسی میدان کی تراش خراش سے اندازہ ہوتا تھا کہ درجنوں مالی یہاں کام کرتے ہوں گے۔ شاید یہاں کوئی دعوت وغیرہ ہونے والی تھی۔ میدان میں دور دور تک سرخ بنات کے شامیانے لگ رہے تھے۔ راستوں پر اینٹوں کا سرخ برادہ بچھایا جا رہا تھا اور گملے وغیرہ رکھے جا رہے تھے۔ ہم نے ایک ملازم سے دولت سنگھ کے بارے پوچھا تو وہ ہمیں سیدھا حویلی کے دالان میں لے گیا۔ یہاں میں نے دولت سنگھ کو دیکھنے کا شرف حاصل کیا۔ وہ تقریباً ساڑھے چھ فٹ قد کا کیم شحیم ڈوگرا تھا۔ اس نے نہایت قیمتی کپڑے کا ایک فراک نما چغہ پہن رکھا تھا۔ نیچے چست پائجامہ اور سلیم شاہی جوتے تھے۔ اس کے سر پر بال نہیں تھے یعنی بلال شاہ کی زبان میں ''گونی ٹنڈ'' تھی۔ اس ٹنڈ کی ایک جانب لمبی سی بودی تھی۔ جسے اس نے بل دے کر رسی کی طرح بٹ رکھا تھا اور کندھے پر رکھ چھوڑا تھا۔ اس کی کمر سے تلوار لٹک رہی تھی۔ دیکھنے میں وہ خوفناک شخص نظر آتا تھا۔ اس نے ہماری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ وہ اردو بول رہا تھا۔ میں نے اردو میں ہی اسے بتایا کہ ہم لدھیانہ سے آئے ہیں۔ ہمارا مالک جو وہاں ایک کارخانے دار ہے گلمرگ کے پُرفضا علاقے میں پراپرٹی خریدنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں سروے کر رہے ہیں۔ ہمیں کسی نے بتایا تھا کہ سردار دولت سنگھ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔

یہ جان کر کہ ہم لدھیانہ کے کسی کھاتے پیتے شخص کے کارندے ہیں۔ دولت سنگھ نہایت خوش اخلاقی سے پیش آیا۔ چائے پلائی۔ حقہ لا کر سامنے رکھا اور پیشکش کی کہ ہم اپنے کام کے

سلسلے میں جب تک یہاں ہیں ان کے مہمان خانے میں ٹھہر سکتے ہیں۔

میں نے دولت سنگھ سے پوچھا کہ یہ تیاریاں کیسی ہو رہی ہیں، کیا کوئی فنکشن وغیرہ ہے؟ اس نے کہا۔ ''یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تم دونوں پہلی دفعہ یہاں آئے ہو ورنہ تمہیں معلوم ہوتا کہ یہ فنکشن کیسا ہے۔ دراصل میں جنگی کرتبوں کا بہت شوق رکھتا ہوں۔ جولائی کی ان تاریخوں میں دور دور سے تلوار باز، نبوٹ باز اور گتکے وغیرہ کے کھلاڑی یہاں آتے ہیں اور اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آج شام سے مہمان آنا شروع ہو جائیں گے۔ تین چار دن خوب ہنگامہ رہے گا۔''

میں نے محسوس کیا کہ دولت سنگھ کچھ پریشان سا ہے، حالانکہ وہ فنکشن کی تیاری میں پوری دلچسپی لے رہا تھا اور ملازموں کو بار بار ہدایتیں بھی جاری کر رہا تھا پھر بھی کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ میرے سامنے ہی ایک شخص نے آ کر اس کے کان میں کوئی سرگوشی کی جس کے بعد وہ مزید پریشان ہو گیا اور اٹھ کر باہر چلا گیا...... پروگرام کے مطابق شام سے مہمان آنا شروع ہو گئے۔ ان میں زیادہ تر ڈوگرے سردار اور جموں اور سری نگر کے ٹھاکر وغیرہ تھے۔ ایک راجہ صاحب بھی اپنی لمبی شیورلیٹ کار میں وہاں پہنچے۔ ان کے ساتھ تین گاڑیاں تھیں۔ ان گاڑیوں میں راجہ صاحب کا ساز و سامان یعنی شکاری کتے، ملازم اور طوائفیں تھیں۔ طوائفوں کا ساز و سامان ایک علیحدہ پک اپ میں اگلے روز پہنچا۔ دوسرے دن دوپہر کو مقابلے شروع ہوئے اس وقت تک تین چار سو مہمان اور کھلاڑی پہنچ چکے تھے۔ پہلے دن ہونے والے فضول مقابلوں کے بعد میں نے اندازہ لگایا کہ یہ سب کچھ نمائشی ہے۔ تلوار باز اور گتکے باز اس طرح لڑتے تھے جیسے ڈانس کر رہے ہوں۔ اگر کوئی سخت مقابلہ ہوتا بھی تھا تو ریفری فوراً چھڑوا دیتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کھیلنے والے سب کے سب ٹھاکروں، چوہدریوں اور نوابوں کے چشم و چراغ تھے۔ وہ یہاں زخمی ہونے نہیں داد عیش دینے آئے تھے۔ یہ محفل دراصل راگ رنگ کی محفل تھی۔ جس میں شام سے رات تین بجے تک شراب، کباب اور شباب کا دور دورہ رہتا تھا۔ یہ فنکشن کے تیسرے روز کا واقعہ ہے۔ رات کا کھانا تناول فرمانے کے بعد مہمان رقص و سرور کی محفل کی طرف جا چکے تھے۔ جس شامیانے میں کھانا کھایا گیا تھا وہاں صفائی کرنے والے گراؤنڈ صاف کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا ایک درمیانے قد کا نوجوان گلے میں کپڑے کا جھولا ڈالے میزوں کے نیچے پڑا ہوا کوڑا اٹھا رہا تھا۔ چچوڑی ہوئی ہڈیاں، چاول، نانوں کے ٹکڑے، فرنی کی ٹوٹی ہوئی پلیٹیں۔ وہ سب کچھ اٹھا اٹھا کر جھولے میں ڈال رہا تھا۔ اس کی کمر سے جھاڑو بندھا ہوا

تھا۔ نوجوان کی طرف میرا دھیان جانے کی وجہ اس کا چہرہ تھا۔ اسے پہلی نظر دیکھتے ہی مجھے لگا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے اور دوسرے ہی لمحے مجھے راحت جان کا خیال آ گیا۔ نوجوان کی شکل راحت جان سے بہت زیادہ ملتی تھی۔ میرے ذہن میں شبہ جاگا کہ ہو نہ ہو یہ راحت کا بھائی ہے۔ شاکر علی کے گھر میں مَیں اس کی بہو دیکھ چکا تھا۔ مگر میرے پوچھنے کے باوجود اس نے بیٹے کے بارے کچھ نہیں بتایا تھا۔ بڑھیا نے بھی گول مول سا جواب دیا تھا اور کہا تھا کہ اس کا بیٹا ابھی پنجاب سے کام کر کے واپس نہیں آیا۔ میں نے غور سے نوجوان کو دیکھا وہ شکل وصورت سے ہرگز خاکروب نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اسے کسی سزا میں یہ ڈیوٹی سونپی گئی ہے۔ بعدازاں میرا یہ اندازہ درست نکلا۔ میں نے دل میں ٹھانی کہ اس نوجوان سے کچھ بات چیت کرنی چاہئے۔ میں نے اسے نگاہ میں رکھا۔ جونہی وہ کام سے فارغ ہوا میں نے اسے کہا کہ وہ میرے ساتھ چلے۔ اس بیچارے کو یہ پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی کہ میں اس سے کیا کام لینا چاہتا ہوں۔ پالتو جانور کی طرح سر جھکائے جھکائے وہ میرے پیچھے چلنے لگا۔ میں اسے ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آ گیا اور بستر پر لیٹنے کے بعد اس سے کہا کہ وہ میری ٹانگیں دبائے۔ وہ فرمانبرداری سے ٹانگیں دبانے لگا۔ اس کے پھٹے پرانے لباس سے بو آ رہی تھی۔ چہرہ میلا تھا اور آنکھوں میں گیڈ تھی۔ مجھے شک ہوا کہ اس نے افیم کھا رکھی ہے۔ میں اس سے ہمدردی کی باتیں کرنے لگا۔ وہ پہلے تو جھجکتا رہا پھر میری شہ پا کر بولنے لگا۔ میں نے کمرے کی الماری میں سے ولائتی شراب کی بوتل نکالی اور اپنے ہاتھ سے اوپر تلے دو تین جام اسے پلا دیئے، شراب کے نشے نے اس کی بزدلی کو وقتی طور پر کم کر دیا اور وہ سر اٹھا کر مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے اسے دو جام اور پلا دیئے۔ وہ عادی نشے باز تھا مگر شراب جیسا مہنگا نشہ اسے کم کم ہی ملا ہو گا۔ خوش ہو کر وہ میرے ہاتھ پاؤں چومنے لگا۔ پھر ایک قدم اور آگے بڑھا اور بوتل ہاتھ میں لے کر ڈائیلاگ بولنے لگا۔ پتہ نہیں کس فلم کے مکالمے تھے اس نے لہک لہک کر ایک بھونڈا سا گیت گانے کی کوشش کی مگر دو تین بار زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا تو اپنی حرکتوں سے باز آ گیا۔ لکڑی کے سٹول پر بیٹھ گیا اور بھوں بھوں کر کے رونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی سچی باتیں اس کے منہ سے نکلنے لگیں۔ کہنے لگا۔

''دیکھو صاحب بہادر! یہ کوئی...... یہ کوئی زندگی ہے۔ قصور کس کا تھا؟ قصور دولت سنگھ کے بیٹے کا تھا۔ میری بہن کے لئے دیوانہ ہو رہا تھا وہ...... دیواروں سے ٹکریں مارتا تھا اور گلیوں میں چیختا پھرتا تھا۔ آئی لو یو...... آئی لو یو...... اُلو کا پٹھا...... شہنشاہ اکبر کی اولاد ...... اور

دیکھو شہنشاہ اکبر نے کیا کیا۔ میری بہن کو دیوار میں چنوا دیا۔ انارکلی کا تو پھر بھی قصور تھا۔ میری بہن راحت جان کا کیا قصور تھا؟ صرف... صرف یہ کہ وہ ایک لڑکی تھی؟ یہ دنیا اب جینے کے قابل نہیں رہی صاحب بہادر۔ اگر تم... اگر تم دلارام کے باپ ہو تو مجھے تھوڑی سی اور پلا دو۔ میں اب بالکل مرجانا چاہتا ہوں... ''

میں نے اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھ کر اسے حوصلہ تسلی دی اور کوشش کرنے لگا کہ وہ اس بے خودی کے عالم میں مجھے زیادہ سے زیادہ باتیں بتا دے۔ میری اس کوشش کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور نوجوان کے دل میں جو کچھ تھا۔ اس نے باہر نکال دیا۔ اس کی طویل اور مضحکہ خیز باتوں سے جو کچھ معلوم ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

''دولت سنگھ کا نوجوان بیٹا مریک سنگھ جو سری نگر میں پڑھتا تھا۔ چھٹیوں میں گلمرگ آتا رہتا تھا۔ یہاں اس نے شاکر علی کی خوبرو بیٹی راحت جان کو دیکھ لیا اور ہزار جان سے اس پر فدا ہو گیا۔ وہ راحت جان کے گھر کے چکر لگانے لگا اور اس کا نام لے لے کر آہیں بھرنے لگا۔ بہت جلد یہ بات علاقے میں مشہور ہو گئی کہ مریک اور راحت جان ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور مریک اپنی محبوبہ کے لئے تعلیم، دولت، مذہب اور اپنے باپ کی گدی تک چھوڑنے کے لئے تیار ہے۔ یہ سب باتیں جب مریک کے باپو یعنی دولت سنگھ کے کانوں تک پہنچیں، وہ بہت سٹپٹایا۔ وہ تو مریک کو اپنے سے بھی بڑا سردار بنانے کے بارے میں سوچ رہا تھا اور مریک ایک غریب نیچ مسلمان لڑکی کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ اس نے پہلے تو مریک کو پیار محبت سے سمجھانے کی کوشش کی اور جب وہ نہیں مانا تو دولت سنگھ بھی سازشی ڈوگرا بن گیا۔ اس نے مریک کو بہلا پھسلا کر سری نگر بھیج دیا اور راتوں رات راحت جان کی شادی اپنی حویلی کے ایک مسلمان نوکر سے کر دی۔ اس سادہ لوح نوجوان کا نام مقبول تھا۔ اس بے چارے کو صرف قربانی کا بکرا بنایا گیا تھا اصل شادی تو دولت سنگھ کے یار دربار سنگھ کی ہوئی تھی۔ دربار سنگھ کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ان دنوں حویلی میں دولت سنگھ کا مہمان ٹھہرا ہوا تھا۔ دولت سنگھ چاہتا تھا کہ راحت جان کو کہیں دور بھیج دے۔ دربار سنگھ لدھیانے کا رہنے والا تھا لہٰذا دولت سنگھ نے ہیرے جیسی لڑکی کو دربار سنگھ جیسے جنگلی کے سپرد کر دیا۔ اس نے راتوں رات راحت جان کو لیا اور خوشی کے شادیانے بجاتا لدھیانہ پہنچ گیا۔ دولت سنگھ نے مقبول کو کچھ پیسے دے کر اس کے قصبے باندی پورہ بھیج دیا اور ہدایت کی کہ وہ کبھی گلمرگ کا رخ نہ کرے۔ زبردستی کی اس شادی کے دوران راحت جان کے ماں باپ نے احتجاج کیا تو انہیں بھی بُری طرح مارا پیٹا گیا۔ راحت جان تو اسی رات دربار سنگھ

کے ساتھ چلی گئی تھی لیکن شاکر علی اور اس کی بیوی پورے دو دن تک ایک درخت سے الٹے لٹکتے رہے اور دولت سنگھ کے ڈشکرے گاہے بگاہے ان پر بید برساتے رہے۔ میاں بیوی پر الزام لگایا گیا کہ وہ نوجوانوں سے پیسے بٹورنے کے لئے اپنی لڑکی کو برائی پر اکساتے ہیں۔ دو روز الٹا لٹکے رہنے کے بعد جب شاکر علی اور اس کی بیوی کو اتارا گیا تو وہ مرنے کے قریب تھے۔ شاکر علی کی بیوی کی ناک سے مسلسل خون جاری تھا اور شاکر علی بھی بے ہوش ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں وہ دونوں کس طرح بچ گئے تاہم شاکر علی کی بیوی اس کے بعد ایسی بستر پر گری کہ کئی مہینے گزر جانے کے باوجود اب تک بستر پر تھی۔ اب وہ خاموشی سے سب کچھ سہہ رہے تھے۔ دولت سنگھ کی حویلی سے رہائی انہیں اس ضمانت پر ملی تھی کہ وہ اب راحت جان کے بارے ایک لفظ زبان پر نہیں لائیں گے اور جو پوچھے اسے یہی بتائیں گے کہ دولت سنگھ کی طرف سے لگائے جانے والے سارے الزام درست ہیں۔ وہ اپنے پچھلے گناہوں پر بہت شرمندہ ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دولت سنگھ نے ان کی بیٹی کی شادی کر کے ان پر احسان کیا ہے...... بعد ازاں ان سے کئی سادہ کاغذوں پر انگوٹھے بھی لگوا لئے تھے۔ اب شاکر علی وہی کر رہا تھا جو اس سے کہا گیا تھا۔ وہ حکم عدولی بھی کیسے کر سکتا تھا۔ ابھی اس کے گھر میں ایک جوان بہو بھی موجود تھی۔ جو کچھ راحت جان کے ساتھ ہوا اس سے کہیں بڑھ کر اس کی بہو کے ساتھ ہو سکتا تھا...... جن دنوں یہ واقعات ہوئے مریک سری نگر میں بی ایس سی کا امتحان دے رہا تھا۔ امتحان کے بعد وہ واپس پہنچا تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ راحت جان اس کے قابل نہیں تھی۔ اس کے لالچی والدین نے اسے بکاؤ مال بنا رکھا تھا۔ علاقے سے گندگی ختم کرنے کے لئے اس کی شادی کر دی گئی ہے۔ مریک سنگھ نے سب کچھ سنا لیکن سمجھا وہی جو اس کے دل نے سمجھایا۔ عشق میں اندھا ہونے والے کی بینائی اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ مریک سنگھ بھی بہت دور تک دیکھ رہا تھا۔ اس نے مقبول کی تلاش شروع کر دی۔ مگر چھپانے والوں نے اسے اس لئے نہیں چھپایا تھا کہ مریک سنگھ اسے ڈھونڈ نکالتا۔ کئی ہفتے پاگلوں کی طرح پھرنے کے بعد مریک کو مقبول یا راحت کا سراغ نہیں ملا۔ آخر وہ نڈھال ہو کر حویلی واپس آ گیا۔ اس نے بہت سر ٹکرایا لیکن کوئی اسے نہ بتا سکا کہ راحت اسے کہاں ملے گی۔ مایوس ہو کر مریک سنگھ نے اپنی جان لینے کی کوشش کی مگر دولت سنگھ نے بڑی عیاری سے اسے سنبھال لیا۔ وہ جانتا تھا کہ مریک اپنی بڑی بہن سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور اس کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا۔ اس نے اسے شملے سے کشمیر منگوا لیا۔ وہ سائے کی طرح مریک کے ساتھ لگ گئی اور اپنی انتھک کوششوں سے اس نے مریک کو

مایوسیوں کی دلدل سے نکال کر فوری موت سے بچا لیا۔ انہی دنوں دولت سنگھ نے مریک کے لئے ایک نئی رولز رائس کار منگوائی اور اس کی تفریح طبع کے لئے کثیر سرمائے سے گرم پانی والا ایک سوئمنگ پول بنوایا۔ اس سوئمنگ پول کی رونق بڑھانے کے لئے اس نے جرمنی سے خوبصورت پیراک لڑکیاں منگوائیں جو رنگین مچھلیوں کی طرح پول کے نیلے پانیوں میں تیرتی تھیں اور مریک کا دل بہلاتی تھیں۔ غرض اس نے بے پناہ کوشش کے ساتھ مریک کا دھیان راحت کی طرف سے ہٹا دیا۔ بعدازاں اسے امتحانوں کی تیاری کے لئے سری نگر واپس بھیج دیا...... انہی دنوں راحت جان کا بھائی فردوس (جو مجھے یہ سارے حالات بتا رہا تھا) پنجاب سے واپس کشمیر پہنچا۔ ماں باپ تو چپ تھے بہرحال اسے کسی نہ کسی طرح اپنی بہن پر گزرنے والی قیامت کا پتہ چل گیا۔ اس کی غیرت نے جوش مارا اور وہ علاقے کے ایک بااثر شخص ملک نصیر کے پاس پہنچ گیا۔ ملک نصیر سیاست میں قدم رکھتا تھا اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا دم بھرتا تھا۔ فردوس کو امید تھی کہ وہ ضرور اس کی مدد کرے گا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ دولت سنگھ کے ہرکارے اس سے پہلے ہی ملک نصیر کے کان کھینچ چکے ہیں۔ ملک نصیر بے چارے میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ دولت سنگھ کے سامنے چوں بھی کر سکتا۔ علاقے کے بے شمار دوسرے مسلمانوں کی طرح ملک نصیر کا بال بال بھی ڈوگروں اور سکھوں کے قرضے میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کا سب سے بڑا قرض خواہ دولت سنگھ تھا۔ فردوس فریاد لے کر ملک نصیر کے پاس پہنچا تو ملک نے اس کو ٹھنڈا ٹھار کر دیا۔ اس نے اسے سمجھایا کہ وہ جوش کی بجائے ہوش سے کام لے۔ جو ہونا تھا ہو چکا اب لکیر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ فردوس بڑی مایوسی کے عالم میں اٹھ کر اس کے پاس سے آنے لگا تو ملک نصیر نے اسے روک لیا اور واپس بلا کر کہا۔

"فردوس، تم میرے مسلم بھائی ہو۔ میں تمہارے بھلے کی بات کر رہا ہوں۔ بہتر ہے کہ تم اس وقت حویلی جا کر دولت سنگھ سے معافی مانگ لو اور اسے یقین دلا دو کہ تم آئندہ بہن کے بارے میں کوئی بات زبان پر نہیں لاؤ گے...... ورنہ...... مجھے خطرہ ہے کہ تمہارے لئے بڑی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ جہاں تک میرا قیافہ ہے اس وقت تمہارا باپ دولت سنگھ کی حویلی میں پہنچ چکا ہوگا۔ ابھی تو اسے کچھ نہیں کہا جائے گا مگر اگلے چند گھنٹوں کی میں تمہیں ضمانت نہیں دے سکتا۔"

یہ باتیں سن کر فردوس سر پر پاؤں رکھ کر گھر بھاگا۔ وہاں اسے پتہ چلا کہ اس کا باپ سلام کرنے دولت سنگھ کی حویلی گیا ہوا ہے۔ وہ بدحواسی کے عالم میں حویلی پہنچا۔ دولت کے

کارندوں نے اسے اندر پہنچایا۔ یہاں اس نے اپنے باریش تہجد گزار والد گرامی کو اس حالت میں دیکھا کہ وہ سکڑے سمٹے جرمن پیراک لڑکیوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ لڑکیوں نے برائے نام لباس پہن رکھا تھا اور ان کے انگ انگ سے فحاشی ٹپک رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر فردوس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اتنے میں دولت سنگھ بھی وہاں پہنچ گیا اور اسے سمجھانے لگا کہ بہتری اسی میں ہے کہ وہ اپنی زبان ہمیشہ کے لئے بند رکھے۔ دوسری صورت میں اس کے اور اس کے گھر والوں کے ساتھ اتنا کچھ ہو جائے گا کہ راحت کے دکھ انہیں یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آئیں گے۔ اپنے والد کی لاچاری اور بے بسی دیکھ کر اور ان سے ہونے والے سلوک کا خیال کر کے فردوس سرتاپا لرز گیا۔ اس نے اسی وقت اپنی گردن دولت سنگھ کے آگے ڈال دی۔ سادے کاغذ پر انگوٹھا لگا دیا اور ہاتھ جوڑ کر اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگ لی۔ دولت سنگھ نے اس کی بزدلی پر خوب قہقہے لگائے اور کہا کہ تجھ جیسے بزدل مُسلے سے ٹکرانے میں کوئی مزہ نہیں۔ کچھ دیر تو اکڑ دکھائی ہوتی۔ تھوڑا بہت تماشا ہم بھی دیکھ لیتے...... بعدازاں سزا کے طور پر اس نے فردوس کو حکم دیا کہ وہ دو ماہ تک حویلی میں جھاڑو دے گا اور کوڑا کرکٹ اٹھائے گا۔

فردوس علی کی روئیداد نے مجھے لرزا کر رکھ دیا یہ کوئی اکیلے فردوس علی کی کہانی نہیں تھی۔ کشمیر کے ہزاروں پسے ہوئے مظلوموں کا دردناک ماجرا تھا۔ ہر روز اَن گنت دولت سنگھ راحت جان جیسی اَن گنت دوشیزاؤں کو ہوس کے بستر پر روندتے تھے اور شاکر علی جیسے خمیدہ کمر بوڑھے کونے کھدروں میں منہ دے دے کر روتے تھے۔ اس جنت نشان سرزمین کے باسیوں کی قسمت پر جتنا بھی ماتم کیا جاتا کم تھا...... فردوس علی کی باتوں سے مجھے ایک اور امر کا پتہ بھی چلا اور وہ یہ کہ دولت سنگھ کا بیٹا اپنے کالج کے ہاسٹل میں موجود نہیں۔ اسے کئی روز سے ڈھونڈا جا رہا ہے مگر کچھ پتہ نہیں چلا...... اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ فنکشن کے رنگا رنگ ہنگاموں میں بھی دولت سنگھ اس قدر اداس اور پریشان کیوں ہے۔ یقیناً وجہ بیٹے کی گمشدگی ہی تھی۔ جوان بیٹا بتائے بغیر اپنے ٹھکانے سے غائب تھا۔ باپ کا دل خون نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ میرے پوچھنے پر فردوس نے بتایا کہ دولت سنگھ نے مریک کو ڈھونڈنے کے لئے دور دور آدمی دوڑائے ہوئے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ وہ ناراض ہو کر کلکتے یا ڈھاکے کی طرف چلا گیا ہے۔

اس تمام گفتگو کے دوران رات کے دو بج گئے۔ فردوس کا نشہ بھی اب ہرن ہو رہا تھا۔ جوں جوں نشہ اُتر رہا تھا اس کی بزدلی واپس آ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ تھر تھر کانپنے لگا اور بار

بار بلا وجہ مجھ سے معافیاں مانگنے لگا۔ اسے ڈر تھا کہ میں یہ سب کچھ جا کر دولت سنگھ کو بتا دوں گا اور وہ اسے اور اس کے گھر والوں کو کولہو میں پیلوا دے گا۔ میں بھی جان بوجھ کر اس سے معافیاں منگواتا رہا اور اس کی ذلالت کا تماشہ دیکھتا رہا۔ وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں تھی کہ میں اسے شراب سے نفرت دلانا چاہتا تھا۔ نشے میں اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا اور اب خوف سے نڈھال ہو رہا تھا میں نے نشے کے خلاف ایک چھوٹا سا لیکچر دینے کے بعد اس سے وعدہ لیا کہ وہ ہر طرح کا نشہ چھوڑ دے گا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے خود بھی خدا سے معافی مانگی اور اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ آئندہ کسی مجرم سے کچھ اگلوانے کے لئے نشے کا سہارا نہیں لوں گا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں بعد کی تمام سروس میں ریٹائر ہونے تک اپنے وعدے پر ثابت قدم رہا۔

☆======☆======☆

رات کو نو بجے تھے۔ سرخ بنات کا وسیع و عریض شامیانہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ بمبئی کی تیز طرار رقاصہ گھنگھرو باندھے سٹیج پر ناچ رہی تھی۔ سینکڑوں مخمور آنکھیں اس کے جسم سے چپکی ہوئی تھیں۔ ناگاہ ایک طرف سے شور بلند ہوا۔ میں نے دیکھا مہمانوں میں سے چند اوباش نوجوان ایک لڑکی کو گھیرے ہوئے تھے اور چٹکیاں بجا بجا کر اسے ناچنے کا کہہ رہے تھے۔ وہ بے چاری خوف سے زرد ہو رہی تھی اور زمین پر گڑتی جا رہی تھی۔ ناچنا گانا اس کا پیشہ نہیں تھا۔ وہ تو عام خدمت گار ملازمہ تھی اور کوئی اتنی خوبصورت بھی نہیں تھی۔ مگر نشے میں مرد کی آنکھ کو عام عورت بھی قلوپطرہ نظر آتی ہے۔ لہٰذا اس ''قلوپطرہ'' کی شامت آئی ہوئی تھی۔ وہ جب رقص پر آمادہ نہیں ہوئی تو مدہوش ٹھاکر فحش حرکات پر اُتر آئے۔ معلوم نہیں وہ لڑکی ہندو تھی، سکھ تھی یا مسلمان زیادہ امکان یہی تھا کہ مسلمان تھی کیونکہ بے چارگی اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ ٹھاکروں کی بے شرمی حد سے بڑھی تو مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ کئی دنوں سے جو لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا اچانک پھوٹ پڑا۔ چند لمحوں کے لئے مجھے بالکل یاد نہ رہا کہ میں ایک خاص مقصد کے لئے آیا ہوں اور میرا یوں آپے سے باہر ہونا ٹھیک نہیں۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہنگامے والی جگہ پر پہنچ گیا۔ ایک لمبا تڑنگا کلین شیو نوجوان سب سے آگے تھا۔ اس کی خرمستی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کل اس نے گتکے بازی میں بیک وقت تین آدمیوں سے مقابلہ کر کے انہیں ہرایا تھا اور راجہ ہری سنگھ ایوارڈ حاصل کیا تھا۔ اسے مخاطب کرنے سے پہلے ہی میں سمجھ گیا کہ اس سے میری لڑائی ہو کر رہے گی۔

میں نے اسے لڑکی کے کپڑے پھاڑنے سے منع کیا تو وہ ہنسنے لگا۔ شاید وہ میری بات کو مذاق سمجھ رہا تھا۔ جب میں نے اسے دوسری بار سختی سے منع کیا تو اس نے مجھے انگریزی میں گالی دی اور لڑکی سے میرا رشتہ جوڑ دیا۔ میں نے زبردستی لڑکی کو اس کے چنگل سے نکالنا چاہا تو

وہ بھوکے کتے کی طرح مجھ پر پل پڑا۔ اس کے دو مکے میں نے عین ٹھوڑی کے نیچے کھائے۔ تیسرا مکہ روک کر میں نے ٹانگ گھمائی جو اس کے پیٹ میں پڑی اور وہ کئی کرسیوں پر سے لڑھکتا ہوا فرش پر جا گرا۔ رقص کا ہنگامہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ اب سب لوگ اٹھ اٹھ کر لڑائی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس نوجوان کا نام انیل تھا اور وہ واقعی لڑائی بھڑائی میں ماہر تھا۔ کسی منچلے نے اس کے ہاتھ میں گتکے کی دو چھوٹی لاٹھیاں تھما دیں۔ وہ دونوں لاٹھیوں کو یکساں مہارت سے استعمال کرنے لگا۔ میرے کندھوں اور سر پر یکے بعد دیگرے کئی چوٹیں آئیں۔ چند لمحوں کے لئے تو مجھے محسوس ہوا جیسے مدِ مقابل کے ہاتھ میں دو نہیں دس بارہ لاٹھیاں ہیں اور ابھی میں لہولہان ہو کر گر جاؤں گا۔ تاہم پھر میں نے سنبھالا لیا اور موقع دیکھ کر گتکے کی دونوں لاٹھیاں ایک ہی بار دبوچ لیں۔ جس وقت مدِ مقابل لاٹھیاں چھڑانے کا سوچ رہا تھا میری بھرپور ٹھوکر اس کے سینے پر پڑی اور وہ ڈکراتا ہوا ایک بلال شاہ کے سائز کی موٹی میم پر گرا۔ میں موقع دیئے بغیر اس پر جھپٹا اور ٹھوکروں اور مکوں پر رکھ لیا۔ سکھوں، ٹھاکروں اور ڈوگرا حکمرانوں کے خلاف جتنا غم و غصہ میرے دل میں تھا سارا انیل ٹھاکر پر نکل گیا۔ اگر سردار دولت سنگھ خود بیچ میں پڑ کر یہ لڑائی چھڑا نہ دیتا تو ایک مُسلے کے ہاتھوں گتکا چیمپئن ٹھاکر کی وہ درگت بنتی کہ ساری عمر کوئی شکل نہ پہچان سکتا۔ سب لوگ دم بخود میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے خیال میں مَیں نے ایک جن پر قابو پایا تھا۔ اس لڑائی میں ایک نقصان میرا بھی ہوا اور وہ یہ کہ میری وہ شرٹ بُری طرح پھٹ گئی جس کی اندرونی جیب میں مَیں نے اپنے ذاتی کاغذات رکھے ہوئے تھے کہ شاید کسی وقت کام آ جائیں۔ ان میں میرا شناختی کارڈ بھی تھا یہ کاغذات میزوں کے نیچے گر گئے جہاں سے ایک گجراتی عورت نے انہیں اٹھا لیا اور سردار دولت سنگھ کے ہاتھ میں دے دیئے۔ دولت سنگھ کے علاوہ کچھ دوسرے مہمانوں نے بھی یہ کاغذات دیکھ لئے۔ جب مجھے پتہ چلا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ دولت سنگھ مجھے خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ کیوں خواہ مخواہ دماغ کو گرمی چڑھا بیٹھا۔ دولت سنگھ نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص سے گردن کا پسینہ پونچھا اور اسے گولا کر کے فرش پر پھینک دیا۔ پینٹ اور بنیان میں میں دولت سنگھ کے پیچھے پیچھے چلتا ڈرائنگ روم میں پہنچا۔

دولت سنگھ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تو خیر سے تھانیدار ہو تم؟“

”بالکل ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کس چکر میں پہنچے ہو؟“

”بڑا لمبا چکر ہے۔“

”دیکھو انسپکٹر پیارے، زندگی بہت تھوڑی ہے لمبے چکروں میں نہیں پڑا کرتے۔ اگر تمہیں کسی نے راحت جان کی کھوج میں لگایا ہے تو اسے اب بھول جاؤ۔ وہ اپنے گھر میں اپنے پتی کے ساتھ ہنسی خوشی رہ رہی ہے۔“

”کون راحت جان؟“

”بھولے نہ بنو انسپکٹر جان۔ دولت سنگھ کی چھٹی حس نے آج تک جھوٹ نہیں بولا۔ تم صرف راحت جان کے چکر میں یہاں پہنچے ہو۔ شاید اس حرامی ملک نصیر کی کھوپڑی میں کیڑے نے حرکت کی ہے۔“

میں نے اطمینان سے کہا۔ ”میں کسی ملک نصیر کو نہیں جانتا اور نہ ہی میں یہاں راحت جان کے لئے آیا ہوں۔“

”تو پھر کس لئے آئے ہو؟“

”تمہاری چھٹی حس کیا فرماتی ہے بیچ اس معاملے کے؟“

”زبان کو لگام دے کتے۔ یہاں سے تیری لاش بھی نہیں نکل سکے گی...... میں پوچھتا ہوں کس لئے آیا ہے تُو یہاں؟“

میں نے ڈوگرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور پوری نفرت کے ساتھ مسکرانے کے بعد اطمینان سے کہا۔ ”میں تیرے بیٹے کے لئے یہاں آیا ہوں۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ وہ بیس سال کا ہو چکا ہے اور بیس سال کا مرد بالغ ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے شادی کر سکتا ہے اور گھر بسا سکتا ہے۔ نہ تُو اسے روک سکتا ہے نہ تیرا باپ اسے روک سکتا ہے۔“

دولت سنگھ پھٹی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ شاید اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک معمولی پولیس انسپکٹر اس کی حویلی میں کھڑا ہو کر اس سے ایسے لہجے میں بات کرے گا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یوں لگا کہ وہ کسی درندے کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑے گا لیکن پھر اس نے نتھنے پھلا کر ایک گہری سانس لی۔ اپنے بالوں کی چوٹی کو جھٹکا دے کر کندھے سے ہٹایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”تم میرے بیٹے کے بارے میں سوچنے والے کون ہوتے ہو؟“

میں اسے تاؤ دلانے کے لئے پھر مسکرایا اور دھیمی آواز میں کہا۔ ”تم مجھے خدائی فوجدار

بھی کہہ سکتے ہو۔ تمہارے جیسے ٹیڑھے میڑھے بندوں کو سیدھا کرنے میں مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ مجھے کسی نے اطلاع دی تھی کہ تم نے شاکر علی کے گھرانے کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ لڑکا تمہارا دیوانہ اور سزا تم نے ایک بے گناہ لڑکی کو دی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ لڑکی اس وقت کہاں ہے؟"

میرے گستاخانہ انداز کو دیکھ دیکھ کر سردار دولت سنگھ کا پیمانہ صبر لبریز ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں اس نے خود پر کیسے قابو پا رکھا تھا۔ بولا۔ "تم نے اس لڑکی کا کیا کرنا ہے؟"

میں نے کہا۔ "وہی کرنا ہے جس کے ہونے سے تمہاری مونچھیں نیچے لٹک جائیں گی۔ جب لڑکا لڑکی راضی ہیں تو تم قاضی بن کر کیوں بیٹھے ہو۔ تمہیں وہی کرنا ہوگا جو وہ دونوں چاہیں گے۔"

دولت سنگھ نے یوں آنکھیں پھاڑیں جیسے وہ میرے بجائے کسی بھوت کو دیکھ رہا ہو۔ اس کے دماغ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں دو ٹکے کا تھانیدار سب کچھ جانتے بوجھتے اسے کیوں للکار رہا ہوں۔ یہ تو سراسر خودکشی تھی۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ حیران ہو کیونکہ اس صورت میں میری جان دولت سنگھ سے بچ سکتی تھی۔ اگر میں اس کی سمجھ میں آ جاتا تو پھر میری خیریت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ درحقیقت میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ قانونی طور پر یہاں میری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس خودمختار ریاست کے اپنے قانون اور ضابطے تھے۔ پنجاب پولیس یا پنجاب گورنمنٹ یہاں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ دولت سنگھ مجھے سرعام گولی مار کر پہاڑ سے نیچے پھینک دیتا تو کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ میری بچت اسی صورت میں تھی کہ میں دولت سنگھ کو دھوکے میں رکھوں اور وہ یہ سمجھتا رہے کہ میں یہاں اکیلا نہیں ہوں اور اگر مجھے کچھ ہو گیا تو مجھے بھیجنے والے اس کے لئے طوفان کھڑا کر دیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ میں ضرورت سے زیادہ اطمینان سکون کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

ابھی دولت سنگھ کے ساتھ میری گفتگو جاری تھی کہ اچانک باہر سے بے پناہ شور و غل سنائی دیا۔ ایسے لگا کہ حویلی کے سارے مہمان دروازے کے باہر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھلا اور تین افراد اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا پہلوان نما شخص تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس کے تیور نہایت خطرناک تھے۔ وہ میواتی زبان میں دولت سنگھ سے تیز تیز باتیں کرنے لگا۔ اس کی باتوں سے مجھے پتہ چلا کہ وہ میرے ہاتھوں پٹنے والے انیل ٹھاکر کا استاد گرامی ہے اور شاگرد کی ہار کا بدلہ لینے کے لئے مجھ سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہے۔ میں نے دیکھا بکرم نامی شخص کے بھدے

چہرے پر بے شمار زخموں کے نشان ہیں اور وہ صورت سے ہی خطرناک غنڈہ نظر آتا ہے۔

اس کے تیور دیکھ کر میں نے سوچا کہ خواہ مخواہ جھگڑے کو طول نہیں دینا چاہئے۔ میری اس شخص سے کوئی دشمنی نہیں تھی پھر میں کیوں لڑتا۔ ویسے بھی مجھے ڈنڈے سوٹے کی لڑائی کا نہ کوئی تجربہ تھا اور نہ دعویٰ۔ لڑائی میں ایک شخص کو تو ہارنا ہی ہوتا ہے اگر ہار میری ہوتی تو میری مشکلوں میں اور اضافہ ہو جاتا اور اگر کوئی ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتا تو کیا ہی کہنے تھے۔

بکرم بہت مشتعل نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ ابھی اور اسی جگہ مجھ سے بدلہ چکانا چاہتا ہے۔ ہمارے اردگرد اکٹھے ہونے والے مہمان بھی مار کٹائی دیکھنے کے آرزو مند تھے مگر سردار دولت سنگھ یہ سب کچھ نہیں چاہتا تھا۔ میں چند ہی لمحوں میں اس کے لئے معمہ بن گیا تھا اور وہ اپنے کسی آدمی کو مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت دے کر مصیبت کھڑی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بکرم کے ساتھ نہ کیا کھسر پھسر کی کہ اس کی تنی ہوئی گردن ڈھیلی پڑ گئی اور وہ مجھے خونی نظروں سے دیکھتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرے مہمانوں نے بھی دولت سنگھ کی بات سمجھ لی تھی اور وہ اب سارے واپس جا رہے تھے۔

دولت سنگھ نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور مجھے سامنے صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ اس کا لہجہ اب کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ کہنے لگا۔

"انسپکٹر نواز خان! میرے گھر میں کھڑے ہو کر تم نے مجھے دھمکی دی ہے۔ ایسی انہونی یہاں کبھی نہیں ہوئی نہ ہوگی۔ اگر اس وقت تم میرے مہمان نہ ہوتے تو پتہ نہیں میں کیا کر گزرتا۔"

میں نے بدستور لاپرواہی سے کہا۔ "میں بھی تمہیں میزبان سمجھ رہا ہوں ورنہ میری طرف سے بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا۔"

بے عزتی برداشت کرنے کی کوشش میں ڈوگرے سردار کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے خادم کو بلوا کر ٹھنڈا پانی منگوایا اور ایک سانس میں ڈیڑھ فٹ کا گلاس خالی کر گیا۔ سونے کے پیندے والا منقش حقہ اس کے سامنے رکھا جا چکا تھا۔ حقہ پیتے ہوئے اس نے کہا۔

"تو تم مانتے ہو کہ راحت جان کے چکر میں ہی یہاں پہنچے ہو؟"

"بالکل۔" میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے اور اس کی خبر دور دور تک پہنچ چکی ہے۔ یہ ایک مسلمان لڑکی کا معاملہ ہے اور الحمدللہ میں مسلمان ہوں کہیں بھی کسی مسلمان پر ظلم ہوتا ہے تو دوسرا مسلمان اسے خود پر ظلم سمجھتا ہے۔"

"بہت خوب۔" ڈوگرے نے تالی بجائی۔ "تاریخی اسلامی ناولوں کا اثر لگتا ہے تم پر۔"

پتہ نہیں کس بیوقوف نے تمہیں انسپکٹر بنا رکھا ہے۔ بہر حال...... تم کسی بڑی غلط فہمی کا شکار ہو۔ میں اس وقت جلدی میں ہوں ورنہ تمہیں پوری تفصیل سے سمجھاتا اور تم اس بات پر یقین کرتے کہ شاکر علی اور اس کی بیٹی کے معاملے سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔"

کچھ دیر ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس دوران نونہال سنگھ کو بھی ہمارے پاس پہنچا دیا گیا۔ دولت سنگھ نے ہم دونوں سے کہا۔ "اگر تم فنکشن میں شریک ہونا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ اپنے کمرے میں ٹھہرو۔ میں مہمانوں سے فارغ ہو کر تمہیں بلاتا ہوں اور سمجھاتا ہوں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔"

میں نے دل میں سوچا۔ "تم مجھے کیا سمجھاؤ گے دولت سنگھ، سمجھنے کی باری تو اب تمہاری ہے۔"

دولت سنگھ مہمانوں کی طرف چلا گیا اور میں اس کے ایک کارندے کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گیا۔ دروازہ بند کر کے میں بستر پر لیٹ گیا اور صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ میں جان گیا تھا کہ دولت سنگھ کیا چاہتا ہے وہ تھوڑا سا ٹائم چاہتا تھا کہ میری دلیری اور بے خوفی کی وجہ معلوم کر سکے۔ اسے اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ میں یہاں اکیلا نہیں آیا ہوں۔ میرے ساتھ کچھ اور بھی لوگ ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ اتنے بااثر ہوں کہ لمبی چوڑی مصیبت کھڑی ہو جائے۔ وہ ایک جہاندیدہ شخص تھا اور مجھے آڑے ہاتھوں لینے سے پہلے میرے والی وارثوں کو دیکھ لینا چاہتا تھا۔

یہ تو میں ہی جانتا تھا کہ میں یہاں لاوارث ہوں اور اگر دولت سنگھ نے مجھے اپنے شکنجے میں کسا تو کوئی چھڑانے کے لئے نہیں آئے گا۔ لہٰذا ضروری تھا کہ کسی شکنجے میں آنے سے پہلے میں یہاں سے نکل جاؤں۔ یہ سوچنے کا نہیں کچھ کرنے کا وقت تھا۔ جہاں تک میرا اندازہ تھا شاکر علی اور راحت جان وغیرہ بھی اس وقت سخت خطرے میں تھے۔ یقینی بات تھی کہ دولت سنگھ میرے اور نونہال کے بارے میں جاننے کے لئے شاکر علی سے بھی رابطہ قائم کرے گا۔ اگر اس کے کارندے شاکر علی کے گھر پہنچتے اور وہاں انہیں راحت جان کی موجودگی کا پتہ چل جاتا تو بیڑا ہی غرق ہو جانا تھا۔ میں نے نونہال سے کہا۔

"نونہال ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکلنا ہو گا ورنہ ایسے پھنسیں گے کہ تم نے سوچا بھی نہ ہو گا۔"

نونہال پہلے ہی ڈرا ہوا تھا۔ اب اور سہم گیا۔ وہ سیدھا سادا ملازم پیشہ شخص تھا۔ اسے ایسے بکھیڑوں کا تجربہ نہیں تھا۔ میں نے بہ آہستگی کمرے کا دروازہ کھولا اور ساتھ والے کمرے

میں آ گیا۔ کھڑکی میں جھانک کر دیکھا صحن میں کوئی شخص نظر نہیں آیا لیکن بیرونی دروازے پر دباؤ ڈالا تو سارے اندیشے درست نکلے۔ دروازے کو باہر سے بند کر دیا گیا یعنی دولت سنگھ کی حویلی میں اب ہماری حیثیت مہمانوں کی نہیں قیدیوں کی تھی۔

میں جلدی سے پہلے کمرے میں واپس آیا۔ اس کمرے میں قریباً دس فٹ کی بلندی پر دو روشن دان تھے۔ یہی روشن دان ہمیں یہاں سے نکلنے کا راستہ فراہم کر سکتے تھے۔ میں اور نونہال ایک جستی الماری اٹھا کر روشن دانوں کے نیچے لے آئے۔ پہلے اندر کے شیشے والا فریم اتارا۔ پھر ایک جیبی چاقو کی مدد سے باہر کی جالی کاٹی۔ اس کام میں قریباً دس منٹ لگ گئے۔ روشن دان کافی کھلا تھا اور ہم تھوڑی سی کوشش کرتے تو باہر نکل سکتے تھے۔ میں نے پہلے نونہال کو باہر نکالا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے باہر نکل کر چھت تک پہنچنے میں پانچ منٹ لگا دیئے اور اس دوران ایک بار گرتے گرتے بھی بچا۔ نونہال کے بعد میں بھی باہر نکل کر چھت پر پہنچ گیا۔ یہ ایک چھت نہیں تھی بلکہ اونچی نیچی چھتوں کا وسیع سلسلہ تھا۔ یہ ساری چھتیں دولت سنگھ کی حویلی کی تھیں۔ اب رات کے دس بجے چکے تھے۔ ہمارے سروں پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ دور نیچے وادی میں پچیس تیس میل کے فاصلے پر کسی بستی کی ٹمٹماتی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ معلوم نہیں یہ سری نگر تھا، بارہ مولا تھا یا کوئی اور شہر۔ بلند و بالا چوٹیوں کو چھو کر آنے والی ہوا چناروں کو کپکپانے پر مجبور کر رہی تھی۔ حویلی کے سامنے گراسی میدان میں شامیانوں کی قطاریں تھیں۔ ایک بڑے سرخ بناتی شامیانے سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں اور گھنگھروؤں کی چھنکار سنائی دے رہی تھی۔ غالباً بمبئی کی جس رقاصہ کے ہوشربا رقص کا سلسلہ میری اور انیل کی لڑائی سے ٹوٹا تھا وہ دوبارہ شروع ہو گئی تھی...... ہم دونوں جھک کر چلتے اور چھتیں پھلانگتے ہوئے حویلی کی عقبی جانب پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر بے پناہ اطمینان ہوا کہ حویلی کی عقبی چار دیواری چھت سے تقریباً ملی ہوئی ہے۔ درمیان میں زیادہ سے زیادہ تین فٹ کا خلا رہا ہو گا۔ ہم چھت سے اُتر کر باآسانی بیرونی دیوار پر قدم رکھ سکتے ہیں تاہم ہمیں اتنی کوشش بھی نہیں کرنی پڑی۔ ایک جگہ دیوار کے ساتھ ہمیں پیال کا ایک بہت بڑا ڈھیر نظر آیا۔ ہم نے یکے بعد دیگرے چھت سے چھلانگیں لگائیں اور پیال کے ڈھیر پر گرے۔ یعنی اب ہم حویلی سے باہر تھے۔ پیال سے اُترتے ہی ہم نے کھیتوں کا راستہ اختیار کیا اور حتی الامکان تیزی سے اس پہاڑی بستی کی طرف بڑھے جہاں ایک چھوٹے سے مکان میں سہمی ہوئی راحت جان اپنے سہمے ہوئے والدین کے ساتھ موجود تھی۔

دروازے پر دستک دی تو اندر موت جیسی خاموشی طاری تھی۔ تیسری چوتھی دستک پر زرد

روشنی خستہ دروازے کی درزوں میں کانپی اور بوڑھے شاکر علی نے پٹ کھول کر باہر جھانکا۔ ہم اسے دھکیل کر اندر پہنچے۔ اندر راحت کی بیمار ماں زور زور سے کھانس رہی تھی۔ لگتا تھا اس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا ہوا ہے۔ ہم شاکر علی کے ساتھ اندر پہنچے۔ راحت اور اس کی بھابی بیمار عورت کی چارپائی سے لگی بیٹھی تھیں سات آٹھ سالہ بچہ عورت پر جھکا ہوا "ماں ماں" پکار رہا تھا۔ آثار سے لگتا تھا کہ عورت کے سانس پورے ہو چکے ہیں اور وہ اب کچھ دم کی مہمان ہے۔ اس کے گلے میں اور بازوؤں میں بے شمار تعویذ بندھے ہوئے تھے۔ میں نے نونہال کو مترجم بنا کر شاکر علی سے پوچھا کہ وہ بیوی کو ڈاکٹر کے پاس بھی لے کر گیا ہے یا نہیں؟ شاکر علی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کہا۔

"لے کر گیا تھا جی۔ اس نے بڑی مہنگی دوائی لکھ کر دی ہے۔ میری چار دن کی مزدوری میں صرف چار خوراکیں آئی تھیں دو خوراکیں تو ویسے ہی پلا دی تھیں۔ باقی دو خوراکوں میں کل سے پانی ملا ملا کر پلا رہے ہیں۔"

اس نے مجھے دوا والی بوتل دکھائی۔ دل پر گھونسہ سا لگا۔ بوتل میں برائے نام دوا تھی باقی پانی ہی پانی تھا۔ یہ دوا نہیں فریب تھا جو یہ مفلس لوگ اپنے ساتھ ساتھ مریضہ کو بھی دے رہے تھے یہ محلول مریض کے لئے نہیں تھا صرف دل کی تسلی کے لئے تھا اور دل کو تسلیاں تشفیاں دینا یہ بے آسرا لوگ خوب جانتے تھے۔ میرے پاس پچاس ساٹھ روپے تھے۔ میں نے کچھ روپے شاکر علی کو دیئے اور اسے کہا کہ وہ کسی پڑوسی کو بھیج کر شہر سے دوا منگوا لے۔ وہ روپے پکڑ کر رونے لگا۔ پوچھنے پر بولا۔

"جناب! میں ان روپوں کو کیسے خرچ سکتا ہوں۔ نہ میرے گھر میں کچھ بیچنے کو ہے نہ پرسوں سے میں نے مزدوری کی ہے۔ سب کو پتہ چل جائے گا کہ یہ روپے میرے نہیں۔ ہم پر فوراً چوری کا الزام لگ جائے گا۔"

مجھے شاکر علی کی سادگی پر حیرت ہو رہی تھی۔ لاچاری نے جیسے اس کی سمجھ بوجھ بھی چھین لی تھی۔

میں نے اسے کہا۔ "بھلے مانس تُو یہ روپے سب کو دکھا کر تو نہیں لے جائے گا۔ جیب میں ڈال کر لے جائے گا اور دوا لے آئے گا۔ پھر کسی کو کیا معلوم کہ جو دوا تُو لے کر آیا ہے وہ کتنے روپے کی ہے۔"

وہ کہنے لگا۔ "اڑوس پڑوس والوں کو سب معلوم ہے۔"

میں نے کہا۔ "تُو کہہ سکتا ہے کہ کسی راہ چلتے نے میری مدد کی ہے۔"

بڑی مشکل سے میں نے اسے روپے رکھنے پر آمادہ کیا وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ دل کو ہر لحظ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی دولت سنگھ کا کوئی کارندہ یہاں پہنچ جائے گا۔ اگر میں نے راحت جان کو اپنے ساتھ نہ لے جانا ہوتا تو کبھی یہاں نہ آتا۔ مگر راحت جان کو لے جانا ضروری تھا ورنہ وہ دولت سنگھ کے ہتھے چڑھ کر بیچ مچ دیوار میں چنوائی جا سکتی تھی۔ راحت جان کی ماں کی حالت خراب تھی اور ایسی حالت میں راحت کو اس سے دور کرنا مناسب نہیں تھا لیکن یہ وقت کی مجبوری تھی راحت جان کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ ماں کا آخری دیدار نہ کر سکے۔ میں نے اسے ایک طرف لے جا کر سمجھایا کہ ہم دولت سنگھ کی حویلی سے بھاگ کر آئے ہیں اور دولت سنگھ کے آدمی کسی وقت بھی یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ فوراً ہمارے ساتھ نکل چلے۔ وہ پہلے تو پس و پیش سے کام لیتی رہی لیکن جب شاکر علی نے بھی اس پر دباؤ ڈالا تو وہ بیمار ماں کا ماتھا چوم کر اور اسے الوداعی نظروں سے دیکھ کر ہمارے ساتھ چل پڑی۔ گھر سے نکلتے ہوئے ہم خاص طور پر احتیاط کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ رات کافی ہو چکی تھی۔ یہ اندیشہ پھر بھی اپنی جگہ موجود تھا کہ کوئی ہمیں شاکر علی کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھ لے۔ یہ حادثہ ہو جاتا تو دولت سنگھ شاکر علی اور اس کے گھرانے کو جیتے جی مار دیتا۔

شاکر علی کے گھر سے نکل کر ہم دیواروں کے سائے سائے بستی کے چوپال کی طرف بڑھنے لگے۔ چاند اب چوٹیوں کے عقب سے نکل آیا تھا۔ اس کی روشنی میں جنت نظیر کشمیر کا یہ چھوٹا سا خطہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ چوپال کے سامنے پہنچ کر میں نے ایک چھپر کے نیچے غور سے دیکھا۔ تاریکی میں ایک خچر کی دم ہلتی نظر آ رہی تھی۔ اس وقت یہ خچر ہمارے بہت کام آ سکتا تھا۔ رستہ گیری کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ میں اندھیرے میں احتیاط سے پاؤں رکھتا ہوا گیا اور خچر کھول لایا۔ خچر کافی توانا تھا۔ اس پر دو افراد باآسانی سوار ہو سکتے تھے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ نونہال اور میں باری باری پیدل چلیں گے جب کہ راحت جان خچر پر سوار رہے گی۔ یہاں سے نکلنے کے لئے ہم سڑک کا راستہ اختیار کرنا نہیں چاہتے تھے لہٰذا کچھ آگے جا کر ہم نے پختہ راستہ چھوڑ دیا اور خچر کو اونچی نیچی گھاٹیوں میں موڑ دیا۔ نونہال کے پیچھے راحت بیٹھی ہوئی تھی اور میں جانور کو ہانکتا جا رہا تھا۔ عجیب سی سچویشن تھی۔ ابھی ہم پہاڑی بستی سے بمشکل چند فرلانگ آگے گئے ہوں گے کہ درختوں کے درمیان ایک گھڑسوار سا یہ نظر آیا۔ اس نے پکار کر پوچھا۔ "کون ہے؟" اندھیرے میں اس کی آواز دور دور تک گونج گئی۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ یہ کوئی چوکیدار یا فارسٹ گارڈ ہے۔ اس وقت ہماری مڈبھیڑ کسی سے بھی

ہونا مناسب نہیں تھا۔ میں نے خچر کو فوراً چیڑ کے گھنے درختوں کی طرف ہانک دیا۔ گرجدار آواز نے ایک بار پھر ہمیں رکنے کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک فائر کی گونج سے رات کا سناٹا لرز گیا۔ فائر ہوتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی چوکیدار یا فارسٹ گارڈ نہیں ہے ان میں سے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ یوں گولی چلاتا۔ یہ کوئی دوسری ٹائپ کا شخص تھا۔ ممکن تھا اس کے ساتھی بھی ہوں میں نے نونہال اور راحت کو خچر سے اُترنے کی ہدایت کی اور انہیں لے کر تیزی سے مکئی کے ایک اونچے کھیت کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ کھیت ڈھلوان پر تھا اور ہم وہاں پہنچ کر کچھ دیر کے لئے محفوظ ہو سکتے تھے مگر گھڑسوار ان نشیب و فراز کا ہم سے زیادہ شناسا نکلا۔ ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر وہ اچانک ہماری بائیں جانب سے نمودار ہوا اور للکار کر بولا۔ ''رک جاؤ۔''

بولنے والے کا لہجہ میواتی تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو پہچان لیا۔ یہ وہی گتکا ماسٹر بکرم تھا جس سے دو ڈھائی گھنٹے پہلے دولت سنگھ کے ''در دولت'' پر ملاقات ہوئی تھی۔ تب بکرم بڑا برہم نظر آ رہا تھا کیونکہ اس کے شاگرد کی تازہ تازہ پٹائی ہوئی تھی۔ دولت سنگھ کے منع کرنے پر بکرم میرے ساتھ الجھنے سے باز رہا لیکن اس کی خونی نظروں نے مجھے اسی وقت سمجھا دیا تھا کہ ہم دونوں کی مڈبھیڑ ضرور ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ اس مڈبھیڑ کے اتنی جلدی ہونے کی توقع نہیں تھی۔ معلوم نہیں یہ بدبخت اتنی رات گئے کہاں سے لوٹا تھا۔ اس نے ایک گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ سر پر کشمیری ٹوپی تھی جس کا چمک دار ڈوریا چاندنی میں چمک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جرمن ساختہ رائفل تھی۔ ہمیں پہچاننے کے بعد وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''اگر میں غلطی نہیں کر رہا خیر سے...... تو یہ لڑکی شاکر علی کی بیٹی ہے خیر سے......'' ''خیر سے'' اس گتکا ماسٹر کا تکیہ کلام تھا۔

میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ ہماری چوری پکڑی گئی تھی۔ بکرم بڑے پھرتیلے پن سے نیچے اُتر آیا۔ اس کی رائفل کا رخ غیر ارادی طور پر ہماری طرف ہو چکا تھا۔ میرے بالکل قریب آ کر اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی غصیلی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑیں اور کاٹ دار لہجے میں بولا۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے خیر سے۔ سردار صاحب نے تم دونوں کو کمرے میں بند کیا تھا۔ خیر سے تم یہاں پھر رہے ہو تو اس کا ایک ہی مطلب ہے...... تم بھاگ کر آئے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''اگر ہم بھاگ کر آئے ہیں تو پھر؟''

''تو واپس چلو خیر سے۔'' اس نے جواب دیا۔

باتوں کے دوران میں اس کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اچانک میری دائیں ٹانگ

نے حرکت کی اور ایک بھرپور ٹھوکر اس کی پسلیوں میں پڑی۔ وہ ڈھلوان پر کھڑا تھا۔ لڑھک کر پشت کے بل گرا۔ اس کی رائفل نے ایک دھماکے سے شعلہ اُگلا اور گولی سیدھی آسمان کی طرف پرواز کر گئی۔ ایک راؤنڈ وہ پہلے ہی فائر کر چکا تھا لہٰذا میں بے فکر ہو کر اس پر جا پڑا۔ جونہی میں اس کے اوپر آیا، اس نے بے انتہا پھرتی سے رائفل کے کسی حصے سے میرے سر پر ضرب لگائی۔ یہ ضرب اتنی شدید اور بروقت تھی کہ میری آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے چہرے پر نمی کا احساس ہوا جیسا کہ بعد میں پتہ چلا سر پر زخم آیا تھا اور خون چہرے پر پھیل رہا تھا۔ سر پر کاری ضرب لگاتے ہی اس ٹھگنے دیو نے مجھے ٹانگوں کے زور سے پیچھے اچھال دیا تھا۔ گولی چلتے ہی میرے کانوں میں راحت جان کی چیخ گونجی تھی۔ اب جو میں نے دیکھا تو وہ اور نونہال کہیں نظر نہیں آئے۔ وہ کہاں گئے؟ یہ سوال پوری شدت سے میرے ذہن میں گونجے لیکن اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی مجھے فرصت نہیں تھی۔ بکرم میرے سامنے کھڑا تھا اور اس نے خالی رائفل کسی ماہر لاٹھی باز کی طرح دونوں ہاتھوں میں تھام رکھی تھی۔ میں نے اپنا وزن دونوں پاؤں پر برابر تقسیم کیا اور اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ بکرم کا وار کہاں اور کب آئے گا۔ وہ کوئی معمولی مدمقابل نہیں تھا پوری ریاست میں اس کے مقابلے کے گتکے باز دس پندرہ ہی ہوں گے اور اس وقت وہ طیش میں بھی بہت تھا۔ یکایک مجھے اندازہ ہوا کہ سر سے بہنے والا خون میری آنکھوں میں بھر رہا ہے اور بکرم کی شبیہ میری آنکھوں میں دھندلا رہی ہے۔ میں نے الٹے ہاتھ سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور اسی وقت رائفل مجھے اپنے سر کی جانب لپکتی دکھائی دی۔ میں تیزی سے نیچے جھکا۔ رائفل کا کندا میرے بالوں کو چھوتا گزر گیا۔ اس کے بعد تو جیسے بھونچال آ گیا۔ بکرم رائفل کو گھماتا ہوا عجیب انداز سے مجھ پر تابڑ توڑ حملے کرنے لگا۔ اس کا دوسرا وار میرے کندھے پر پڑا۔ جب کہ تیسرے نے میرے بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں توڑ ڈالیں۔ چند لمحوں کے لئے تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ خوفناک گتکا ماسٹر اسی جگہ میرا خاتمہ کر دے گا۔ وہ مجھ پر حملے کرنے کے ساتھ ساتھ غلیظ گالیاں بھی بک رہا تھا۔ وار بچانے کی کوشش میں پیچھے ہٹتے ہٹتے میرا پاؤں رپٹا اور میں پشت کے بل بکرم کے گھوڑے کے پاس جا گرا۔ میرا یہ گرنا میری زندگی کی ضمانت بن گیا۔ ورنہ بکرم نے جو وار میرے سر پر کیا تھا وہ جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ میرے سر کی بجائے بندوق کا وزنی کندا گھوڑے کی کنپٹی پر پڑا اور وہ بلبلاتا ہوا نشیب میں بھاگ گیا۔ بکرم کا دھیان ایک لمحے کے لئے گھوڑے کی طرف گیا اور میں نے اس لمحے سے فائدہ اٹھا کر لیٹے لیٹے ایک نوکدار پتھر بکرم کے دے مارا۔ یہ پتھر دھپ کی آواز سے بکرم کے پیٹ میں لگا اور وہ

گراہ کر دہ ہراہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر سیدھا ہو کر بندوق اٹھاتا میں اٹھا اور جھکے جھکے ایک شدید ٹکر اس کے سینے میں ماری اور اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا دس پندرہ گز نشیب میں لڑھک گیا۔ یہ جان کر مجھے ازحد اطمینان ہوا کہ رائفل بکرم کے ہاتھ سے چھوٹ چکی ہے۔ میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کا سر تین بار پتھریلی زمین سے ٹکرایا اور جب اس نے زور مار کر اٹھنے کی کوشش کی تو ایسی ٹانگ اس کی کمر میں رسید کی کہ وہ ہوا میں تقریباً اڑتا ہوا کئی فٹ نیچے ایک جھاڑی میں جا پھنسا۔ خون بُری طرح میری آنکھوں میں بھرا ہوا تھا۔ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں ہوں اور میرا مدمقابل کہاں ہے۔ قمیص سے میں نے آنکھوں کا خون صاف کرنے کی کوشش اور بلند آواز میں نونہال کو پکارنا شروع کیا۔ جواب میں نونہال کی آواز کچھ دور چیڑ کے درختوں سے آئی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہوا درختوں کی طرف بڑھا تو سامنے ہی نونہال نظر آ گیا۔ وہ راحت کو کھینچتا ہوا میری طرف لا رہا تھا۔ میرے پاس پہنچ کر اس نے زور سے راحت کو جھنجھوڑا اور ڈانٹ کر چپ رہنے کی ہدایت کی۔ اس ہدایت کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ مسلسل بول رہی تھی اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر نونہال سے کچھ کہہ رہی تھی۔ نونہال نے جب میرے چہرے پر پھیلا ہوا خون دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ ''گولی تو نہیں لگی؟'' اس نے ہراساں ہو کر پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ گنجا ماسٹر؟'' نونہال نے پوچھا۔

''نیچے پڑا ہے جھاڑیوں میں۔''

ہم تینوں احتیاط سے پاؤں رکھتے نیچے پہنچے۔ میری توقع کے عین مطابق بکرم ایک کوہستانی جھاڑی میں الجھا ہوا بے حرکت پڑا تھا۔ وہ کافی بلندی سے گرا تھا کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ زندہ ہے یا مر گیا۔ کافی دشوار گزار جگہ تھی۔ میں آہستہ آہستہ جھاڑیوں میں راستہ بناتا بکرم تک پہنچا۔ اس کی نبض ٹٹولی اور اسے کندھے پر ڈال کر نشیب سے باہر لے آیا۔ وہ زندہ تھا۔ چاندنی میں ایک ہموار پتھر پر لٹا کر غور سے اس کے ہاتھ پاؤں دیکھے اس کے ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ سر کے پچھلے حصے میں بڑا سا گومڑ تھا۔ اس کے علاوہ پورے جسم پر خراشیں اور چوٹیں تھیں۔ بکرم ہمارے بارے میں سب کچھ جان چکا تھا۔ اس نے راحت کو پہچان لیا تھا اور اب اگر وہ یہاں رہ جاتا تو شاکر علی اور اس کے گھرانے کی خیر نہیں تھی اب ہمارے پاس ایک ہی حل تھا بکرم کو باندھ کر اپنے ساتھ ہی لے جائیں۔ نونہال نے اپنی پگڑی کھولی اور ہم نے بکرم کے ہوش میں آنے سے پہلے اس کی مشکیں اچھی طرح کس دیں۔ اس کام سے فارغ

ہو کر نونہال نے اپنا خچر اور میں نے بکرم کا گھوڑا ڈھونڈا اور دونوں کو ایک پتھر کے ساتھ باندھ دیا۔ راحت جان میری ڈانٹ کھانے کے بعد برقعے میں لپٹی لپٹائی خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے نونہال سے پوچھا کہ وہ کہاں بھاگ گئی تھی؟ نونہال نے میرے سر کے زخم پر پٹی باندھتے ہوئے بتایا کہ جب بکرم نے گولی چلائی تو وہ زور سے چیخی اور درختوں کی طرف دوڑ پڑی۔ تقریباً دو فرلانگ آگے جا کر نونہال نے اسے پکڑا اور کھینچتا گھسیٹتا ہوا واپس لایا۔ راستے میں وہ بُری طرح روتی رہی اور خود کو چھڑاتی رہی۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ ''تھانیدار صاحب کو گولی لگ گئی ہے اور وہ مر گیا ہے۔ اب سردار کے بندے مجھے بھی مار دیں گے۔''

نونہال نے میرے زخم کا خون روک کر اچھی طرح پٹی باندھ دی۔ اس دوران ماسٹر بکرم بھی ہوش میں آ گیا۔ اسی کے ہوش میں آنے کا ہمیں انتظار تھا۔ ہم نے اس کا بندھا ہوا جسم اٹھا کر گھوڑے پر لاد دیا۔ راحت جان اور نونہال حسب سابق خچر پر بیٹھ گئے۔ جب کہ میں نے بکرم کے ساتھ گھوڑے پر جگہ سنبھال لی۔ بکرم کی بندوق اور گولیوں والی بیلٹ اب میرے ہاتھ میں تھی۔ درختوں سے گھری اونچی نیچی ڈھلوانوں پر ہم نے ایک بار پھر سفر شروع کر دیا۔ بکرم مسلسل ہائے ہائے کر رہا تھا اور بعض اوقات گالیاں بھی دینے لگتا تھا۔ جب نونہال نے اسے گالیوں سے منع کیا تو اس نے نونہال کو ایک اور گالی کا تحفہ دیا اور بولا۔

''تم نے اپنی موت کو دعوت دی ہے خیر سے۔ سردار تم تینوں کی ٹانگیں چیر کر چیلوں کوؤں کے آگے پھینک دے گا۔ نہ پھینکے تو میرا نام بکرم نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''فی الحال تو تم اپنی خیر مناؤ خیر سے اور یہ چونچ بند رکھو ورنہ میں چونچ توڑ کر حلق میں گھسیڑ دوں گا۔''

اس نے ذرا اثر نہیں لیا اور زور زور سے چیخنے لگا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ قرب و جوار میں کوئی اس کی آواز سن کر مدد کو پہنچ جائے گا۔ اس کا منہ بند نہ کر کے ہم نے غلطی کی تھی۔ گھوڑا روک کر میں نے جیب سے اپنا رومال نکالا اور خون کے دھبوں والے اس رومال کو بکرم کے منہ میں گھسیڑ کر اوپر سے نونہال کی پگڑی کا ایک ٹکڑا باندھ دیا۔

☆======☆======☆

چوبیس گھنٹے کے طویل اور پُرخطر سفر کے بعد ہم پنجاب کی سرحد کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم نے گھوڑا اور خچر چھوڑ دیے۔ ایک مقامی تھانیدار نے ہماری مدد کی اور ہم اپنے قیدی سمیت بذریعہ بس پنجاب کی سرحد میں داخل ہو گئے۔ پنجاب میں پہنچتے ہی سب کچھ میری دسترس میں آ گیا۔ سب سے پہلے میں نے مقامی ہسپتال سے اپنی اور بکرم کی مرہم پٹی

کروائی۔ میری تین انگلیوں میں فریکچر ہوا تھا۔ ان میں سے دو انگلیوں کو ڈاکٹر نے پلاستر سے جکڑ دیا۔ اس کے بعد ہم بذریعہ ریل گاڑی لاہور پہنچے اور وہاں سے بس کے ذریعے لدھیانہ پہنچ گئے۔

جس وقت ہم لدھیانہ پہنچے رات کے نو بجے تھے۔ میں نے سب سے پہلے مرکزی تھانے میں ڈی ایس پی صاحب سے ملاقات کی اور انہیں الف سے یے تک ساری صورت حال بتائی اور آخر میں یہ بھی بتایا کہ میں اپنے تھانے پہنچتے ہی سب سے پہلے دربار سنگھ کو گرفتار کرنا چاہتا ہوں جو جائنٹ سیکرٹری راہوال سنگھ کا بڑا بھائی ہے اور جس نے ایک بے سہارا لڑکی کو کئی ماہ گھر میں رکھ کر عصمت دری کی ہے۔ جائنٹ سیکرٹری راہوال سنگھ کا نام سن کر ڈی ایس پی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ بہر حال وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اتنے ٹھوس ثبوتوں کی موجودگی میں دربار سنگھ عرف دربارے کو گرفتار کرنا ضروری ہے۔ انہوں نے مجھے کمرے سے باہر بھیج کر ایک دو جگہ ٹیلی فون کئے اور بعد ازاں مجھے اجازت دے دی کہ میں کل دوپہر بذریعہ وارنٹ دربار سنگھ کو گرفتار کر سکتا ہوں۔

میں نے وہ رات لدھیانے میں گزاری اور اگلے روز عدالت کے جاری کردہ وارنٹ لے کر قصبے پہنچ گیا۔ راحت جان کو میں نے لدھیانے میں ہی رہنے دیا تھا..... مجھے قصبے سے گئے ہوئے چھ دن گزر گئے تھے اور دربارا میری واپسی کے متعلق سخت پریشان تھا۔ جب اس کے کانوں میں یہ اُڑتی اُڑتی خبر پہنچی کہ تھانیدار قصبے میں واپس آ گیا ہے تو اس کی بے چینی عروج کو پہنچ گئی۔ ظاہر ہے اسے پریشانی ہوئی کہ میں نرملا یعنی راحت جان کو لے کر سیدھا اس کے پاس کیوں نہیں آیا۔ میرے تھانے پہنچنے کے پون گھنٹہ بعد ہی وہ تھانے میں آ دھمکا۔ چھوٹتے ہی بولا۔

”اوئے باؤ تھانیدار۔ بھئی تُو چندی گڑھ کی سیر کر کے بڑا گورا ہو گیا ہے۔ آنے کی خیر خبر ہی نہیں دی۔“

میں نے رُکھائی سے کہا۔ ”بس ضرورت ہی نہیں سمجھی۔“

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس کی نگاہ میرے سر کے زخم کی طرف گئی اور حیرت سے بولا۔ ”شاوا بھئی شاوا۔ یہ چوٹ بھی لگوا آئے ہو اور وہ چندی گڑھ کہاں ہے؟“

چندی گڑھ سے اس کی مراد راحت ہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”وہ لدھیانے میں ہے۔“

میرا لہجہ اسے شک میں ڈال رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ”یار باؤ! خیر خیریت تو ہے نا؟“

اتنے میں میرے اشارے پر ایک حوالدار زخمی بکرم کو اس کے سامنے لے آیا۔ بکرم کو دیکھ کر دربارے کے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بکرم کو پہچانتا ہے۔

میں نے کہا۔ ”دربارے! اسے پہچانتے ہو؟“

”نن..... نہیں..... نہیں تو۔“ وہ بُری طرح ہکلایا۔

میں نے کہا۔ ”یہ تحفہ تمہارے لئے دولت سنگھ کی حویلی سے لایا ہوں۔“

”کک..... کون دولت سنگھ؟“ دربارے کا رنگ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔

”وہی جس نے تمہیں راحت جان کا تحفہ دیا تھا۔ اتنی جلدی بھول گئے ہو اپنے سجن بیلی کو۔“

”کیا بکواس ہے۔“ دربارا خوفزدہ انداز میں چیخا۔ ”تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔“

میں نے وارنٹ گرفتاری اس کے سامنے رکھ دیئے اور اے ایس آئی سے کہا کہ وہ دربارے کو ہتھکڑی ڈال دے۔ وارنٹ دیکھ کر اور ہتھکڑی کی جھنکار سن کر دربارے نے طوفان کھڑا کر دیا۔ وہ مجھے دھمکیاں دینے لگا اور جو اس کے منہ میں آیا بکنے لگا۔ بڑا شور ہوا۔ بڑی مشکل سے اسے ہتھکڑی لگائی گئی اور لاک اَپ میں دھکیل دیا گیا۔

اگلے روز میں دوبارہ لدھیانے شہر ڈی ایس پی صاحب کے پاس پہنچا۔ ان کی ہدایتوں کے مطابق میں نے انگریز ایس ایس پی کی خدمت میں ایک طویل درخواست لکھی۔ جس میں انہیں راحت جان کیس کی تمام تفصیل بتائی گئی اور ان سے گذارش کی گئی کہ وہ ریاستی پولیس سے رابطہ قائم کر کے بڑے مجرم دولت سنگھ کو گرفتار کرائیں تاکہ انصاف کے تقاضے پورے کئے جا سکیں۔ اس کے علاوہ گلمرگ میں غریب شاکر علی کے گھرانے کو تحفظ فراہم کیا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ بااثر مجرم مغویہ کے والدین کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

اب راحت جان کا مسئلہ تھا۔ وہ میری تحویل میں تھی لیکن ایک جوان سال بے سہارا لڑکی کو میں چوبیس گھنٹے بھی پاس رکھنے کا مجاز نہیں تھا۔ لدھیانہ کے ڈی ایس پی سے مشورہ کر کے میں نے اسی روز راحت جان کو لدھیانہ میں ایک شریف مسلم گھرانے کے سپرد کر دیا اور خود قصبے میں واپس آ گیا..... قصبے میں دربار سنگھ کے بھائی اس کی ضمانت کرانے کی کوششیں شروع کر چکے تھے۔ مجھ پر ہر طرف سے دباؤ پڑنے لگا لیکن میں نے بھی کچا ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ میں نے عدالت میں پیش کر کے دربارے کا ریمانڈ لے لیا اور پوچھ گچھ شروع کر دی۔ دوسری طرف جائنٹ سیکرٹری راہوال نے بھی بھائی کی رہائی اور میرا دماغ ٹھکانے لگانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ چند روز بعد مجھے خوفناک قسم کی دھمکیاں بھی ملنے لگیں۔ بہر حال میں نے اپنا

کام جاری رہا۔

قریباً پندرہ روز بعد اس درخواست کا جواب آ گیا جو میں نے ڈی ایس پی کے ساتھ مل کر انگریز ایس ایس پی کے نام لکھی تھی۔ ایس ایس پی نے ہم دونوں کو امرتسر بلایا ہم سرکاری گاڑی میں وہاں پہنچے تو ایس ایس پی کے کمرے میں راحت جان کا بوڑھا باپ شاکر علی اور اس کی بہو اور بچے موجود تھے۔ میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ شاکر علی کے چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے۔ اس کی بہو کا ایک بازو بھی گلے میں جھول رہا تھا۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر رونے لگے۔ میں نے انہیں تسلی تشفی دے کر صورت حال پوچھی۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے چلے آنے کے ایک گھنٹہ بعد دولت سنگھ کے کارندے ہمارے گھر میں گھس آئے تھے۔ اس وقت تک راحت کی ماں دم توڑ چکی تھی اور وہ سب بیٹھے رو رہے تھے۔ دولت سنگھ کے آدمیوں نے انہیں صرف اتنی مہلت دی کہ وہ راحت جان کی ماں کو دفنا سکیں۔ جونہی شاکر علی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوا۔ دولت سنگھ کے غنڈے اسے اور اس کی بہو کو حویلی لے گئے۔ وہاں علاقے کا مسلمان لیڈر ملک نصیر بھی موجود تھا۔ ملک نصیر سمیت ان تینوں کو خوب مارا پیٹا گیا اور کہا گیا کہ انہوں نے راحت جان کے بارے میں سرکاری لوگوں سے شکایت کی ہے۔ بہت مشکل سے دو دن بعد ان کی جان چھوٹی۔

انگریز ایس ایس پی نے ہمیں بتایا کہ اس نے سری نگر کے ڈپٹی کمشنر سے رابطہ قائم کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دولت سنگھ نامی اس ڈوگرے کا علاقے میں کافی اثر ہے اور اسے کٹہرے میں لانا آسان نہیں۔ ڈپٹی کمشنر کا کہنا ہے کہ اس شخص کا زور توڑنے اور اسے قابو کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ بہر حال ڈپٹی کمشنر نے اس مسلمان گھرانے کو وادی سے نکال کر یہاں پہنچا دیا ہے۔

مجھے جہاں شاکر علی وغیرہ کے بچ نکلنے کی خوشی ہوئی۔ وہاں اس بات پر افسوس بھی ہوا کہ ٹھوس ثبوت اور گواہ موجود ہونے کے باوجود مجرم پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکا۔۔۔ میرے سامنے ہی انگریز ایس ایس پی نے ایک خاص آدمی کے ذمے یہ کام لگا دیا تھا کہ وہ نہ صرف شاکر علی اور اس کے اہل خانہ کی رہائش کا انتظام کرے بلکہ اسے کسی جگہ چپڑاسی وغیرہ کی نوکری بھی دلوا دے تاکہ وہ یہاں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ شاکر علی شہر میں آ کر بے حد سہما ہوا تھا۔ میں نے اسے تسلی تشفی دی اور وعدہ کیا کہ آج شام تک اس کی بیٹی راحت بھی اس کے پاس پہنچ جائے گی۔

سہ پہر کو جب میں لدھیانہ سے واپس اپنے تھانے پہنچا تو ڈاک سے آنے والا ایک

لفافہ میرا منتظر تھا۔ یہ لفافہ گلمرگ کشمیر سے آیا تھا اور بھیجنے والا ڈوگرا سردار دولت سنگھ تھا۔ خط کا مضمون کچھ یوں تھا۔

''انسپکٹر نواز خان! خوش رہو۔ اچھے مہمان اس طرح میزبان کے گھر سے رخصت نہیں ہوا کرتے۔ جلدی تھی تو مجھے بتا دیتے۔ روشن دان کی جالی کاٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ بھگوان نہ کرے چھت سے چھلانگ لگاتے وقت اگر چوٹ ووٹ لگ جاتی تو کیا ہوتا۔ میرا خیال ہے تم اپنی زندگی سے اکتائے ہوئے ہو۔ اب تک مجھے ایک اشارہ بھی ایسا نہیں ملا جس سے پتہ چلے کہ تمہیں زندہ رہنے کا کوئی شوق ہے۔ جو رہی سہی کسر تھی وہ تم نے میرے دوست دربار سنگھ کو گرفتار کر کے اور سری نگر کے ڈپٹی کمشنر کو میرے پیچھے لگا کر پوری کر دی ہے۔ اب اگر اپنے باپ کے ہو تو میدان سے بھاگنا نہیں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ تمہیں اپنے ہاتھوں سے قتل کروں گا۔ یہ خوش نصیبی کسی کسی کے حصے میں آتی ہے۔ ورنہ ایسے کاموں کے لئے دولت سنگھ اپنے نوکروں کے کارندوں کو بھیجا کرتا ہے۔''

دولت سنگھ کا ''محبت نامہ'' پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کی چمکتی دمکتی کھوپڑی، بل کھاتے بالوں کی چوٹی اور شیطانی مسکراہٹ آنکھوں کے سامنے آئی اور اپنا وہ دعویٰ بھی یاد آیا جو میں نے حویلی میں اس کے سامنے کھڑے ہو کر کہا تھا۔ اس دعوے کی یاد دہانی کے لئے میں نے بھی قلم اٹھایا اور اس کے نام یہ چند سطریں لکھیں۔

''دولت سنگھ! خوش رہو۔ میزبان اپنے مہمانوں کو تالوں میں بند کرنے لگیں تو پھر جالیاں تو کٹتی ہی ہیں۔ باقی میری تم سے کوئی دشمنی نہیں کیونکہ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اب تم شاکر علی کے ہونے والے سمدھی اور راحت جان کے ہونے والے سسر ہو، جس گھڑی تمہارا بیٹا ملا میں اسے لدھیانہ لا کر راحت جان سے اس کے دو بول پڑھوا دوں گا اور ان شاء اللہ یہ کام جلد ہوگا۔ اگر تمہارا بیٹا واپس آ گیا ہے تو براہ مہربانی اسے خود ہی میرے پاس بھیج دو۔ میرے وہاں آنے سے وقت ضائع ہوگا اور تمہیں تکلیف بھی بہت زیادہ ہوگی۔ امید ہے تم میری باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرو گے اور خواہ مخواہ کی ہٹ دھرمی چھوڑ دو گے۔''

خیر اندیش

نواز خان

پتہ نہیں کیا بات تھی مجھے اس ڈوگرے سے چڑ سی ہو گئی تھی اور اس سے پھڈا ڈالنے میں مزہ آ رہا تھا۔ یہ خط دولت سنگھ کے پتے پر پوسٹ کرنے کے بعد میں نے اپنے مخبر خاص بلال شاہ کو بلایا۔ وہ کافی دنوں سے بے کار تھا۔ میں نے اسے دولت سنگھ کے گمشدہ بیٹے مریک سنگھ

کے متعلق سب کچھ بتایا اور اسے کہا کہ وہ فوراً سری نگر چلا جائے اور مریک کے کالج اور ہاسٹل سے پتہ چلائے کہ لڑکا کہاں ہے۔ میں نے بلال شاہ کو مریک سنگھ کی ایک تصویر بھی دکھائی۔ یہ تصویر حویلی میں قیام کے دوران میرے ہاتھ لگی تھی۔ بلال شاہ کی مدد کے لئے میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بھی سادہ لباس میں ساتھ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

مجھ سے مکمل ہدایت لے کر یہ دونوں افراد اگلے روز سری نگر روانہ ہو گئے۔ جیسا کہ حالات سے ظاہر تھا مریک سنگھ راحت سے شادی کرنا چاہتا تھا اور ہر قیمت پر کرنا چاہتا تھا۔ راحت کو کھو کر اس نے بڑے عذاب کے دن گزارے تھے۔ اب وہ گم تھا تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس گمشدگی کے پیچھے بھی راحت کی جدائی کا ہاتھ ہے۔

☆======☆======☆

بلال شاہ کو بھیجنے کے بعد میں شدت سے اس کی رپورٹ کا انتظار کرنے لگا۔ یہ رپورٹ مجھے پانچویں چھٹے روز ملی۔ تفصیل بتانے کے لئے بلال شاہ خود ہی سری نگر سے چلا آیا تھا۔ حسب معمول نخرے دکھانے، ہائے ہائے کرنے اور لسی کے تین چار گلاس پینے کے بعد اس کی طبیعت ذرا بحال ہوئی اور اس نے مجھے سری نگر کی کارکردگی سنانی شروع کر دی۔ اس نے بتایا کہ سری نگر کالج میں تو بڑا ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ ہاسٹل کا وہ کمرہ سیل کر دیا گیا ہے جہاں سے چار ہفتے پہلے مریک سنگھ غائب ہوا تھا۔ کچھ جاہل لوگ اس معاملے کو پُراسرار رنگ دے رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مریک سنگھ کو ہوائی چیزیں اٹھا کر لے گئی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ مریک سنگھ قبرستانوں میں پھرتا تھا اور سفلی علم والوں کے پاس بیٹھتا تھا۔ غائب ہونے سے چند روز پہلے اس کے دوست اسے بے ہوشی کے عالم میں ایک شمشان گھاٹ سے اٹھا کر لائے تھے۔ بہرحال کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مریک خود کہیں گیا ہے اور کسی دن خود ہی واپس آ جائے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک دفعہ پہلے بھی وہ اسی طرح دو ہفتے ہاسٹل سے غیر حاضر رہا تھا۔ بلال شاہ نے مزید بتایا کہ دولت سنگھ بیٹے کے غم میں ہلکان ہو رہا ہے۔ اس نے مستقل طور پر سری نگر میں چھاؤنی ڈالی ہوئی ہے اور مریک کی تلاش میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس نے پورے سری نگر کی پولیس کو وخت ڈالا ہوا ہے۔

میں نے بلال شاہ سے پوچھا۔ "انسپکٹر ساجن سے ملے تھے؟"

انسپکٹر ساجن میرے ساتھ ٹریننگ کالج میں رہ چکا تھا اور مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔

بلال شاہ نے میرے سوال کا جواب ہاں میں دیا اور بتایا کہ انسپکٹر ساجن بھی دولت سنگھ کی دھمکیوں اور تڑیوں سے سخت پریشان ہے۔ وہ اپنی طرف سے بہت کوشش کر رہا ہے لیکن لڑکے

کا ابھی کھوج نہیں ملا۔

میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ کوئی اہم بات؟"

بلال شاہ نے اپنے سفر کا واقعہ سنانا شروع کر دیا کہ کس طرح اس نے بس میں ایک شربت بیچنے والے کو سکرین ملانے پر تھپڑ مارنا چاہا تو کس طرح اس نے شربت والی بالٹی بلال شاہ کے سر پر انڈیل دی اور کس طرح جھگڑے کی وجہ سے بس ایک گھنٹہ رکی رہی۔ میں نے حسب دستور بڑے تحمل سے یہ طویل کہانی سنی۔ یہ "اہم بات" ختم ہوئی تو میں نے ایک بار پھر پوچھا۔ "اس کے علاوہ کوئی اہم بات؟"

بلال شاہ کچھ دیر سر کھجانے کے بعد بولا۔ "ہاں یاد آیا..... مریک سنگھ کے کمرے سے ایک دیسی جوتے کا جوڑا بھی ملا ہے مریک سنگھ ایسے جوتے ہرگز نہیں پہنتا تھا۔ انسپکٹر ساجن حیران ہے کہ یہ جوتا کہاں سے آیا ہے..... اور ہاں..... ایک اور بات تو میں بھول ہی گیا۔ تھکاوٹ نے دماغ کے کڑاکے نکال دیئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "دماغ کے کڑاکے تو لسی نے نکالے ہیں۔ خیر بتاؤ کیا یاد آیا ہے۔"

وہ بولا۔ "مریک سنگھ کے علاوہ اس کا ایک گہرا دوست عثمان بھی غائب ہے۔ یہ لڑکا لدھیانے ہی میں رہتا تھا اور مریک سے اس کا بہت ملنا جلنا تھا۔ مریک کے روپوش ہونے کے نو دس روز بعد بھی وہ گھر سے بتائے بغیر کہیں چلا گیا۔ اس کے بوڑھے والدین کا رو رو کر بُرا حال ہے۔"

بلال شاہ سے ساری صورت حال جاننے کے بعد میرا ایک بار پھر پنجاب سے نکلنا ضروری ہو گیا تھا۔ دربارے والے کیس کی ایک تاریخ بھگتانے کے بعد میں نے سری نگر جانے کی تیاری کر لی۔ سری نگر جانے سے پہلے میں شاکر علی کے کرائے والے کوارٹر میں بھی گیا۔ وہ اب سیٹ ہو رہا تھا۔ راحت جان باپ کے پاس آ چکی تھی اور اس کے مسکین چہرے پر بھی خوف کے سائے کچھ سمٹے ہوئے تھے۔ تاہم وہ سب فردوس جمال کے بارے میں سخت پریشان تھے۔ راحت کا بھائی فردوس ابھی تک کشمیر میں ہی تھا۔

وہ اپریل کی ایک گرم شام تھی۔ جب میں لدھیانے سے سری نگر کے لئے روانہ ہوا۔ بس اور ریل کے طویل سفر کے بعد میں اگلے روز رات نو بجے سری نگر پہنچا۔ بس اڈے سے میں نے سیدھا انسپکٹر ساجن کے تھانے کا رخ کیا۔ خوش قسمتی سے اس کی رات کی ڈیوٹی تھی۔ وہ تھانے ہی میں مل گیا۔ کام وام کچھ نہیں تھا۔ نہانے، کھانے اور چائے کے بعد ہم سگریٹ سلگا کر بیٹھ گئے۔ مریک سنگھ کے کیس پر بات ہونے لگی۔ یہ سلسلہ ساری رات چلتا رہا۔ گفتگو

کے دوران میں نے اس جوتے کا پوچھا جو مریک سنگھ کے کمرے سے ملا تھا۔ یہ جوتا انسپکٹر ساجن کی الماری میں رکھا تھا۔ ساجن گیا اور تالا کھول کر نکال لایا۔ ایک طرح سے اس وقت یہ جوتا ہی اس کیس کا واحد سراغ تھا۔ جوتا کچھ بڑا تھا غالباً نو دس نمبر کا تھا۔

میں نے اسے اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ تلوے گھسے ہوئے تھے یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا تاہم اسے استعمال ہوئے دو تین ماہ سے زائد ہو چکے تھے۔ میں نے انسپکٹر ساجن سے پوچھا کہ اس جوتے کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے؟

وہ سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ ”اگر مریک سنگھ کو دیسی جوتے ہی استعمال کرنے کا شوق تھا تو وہ کوئی اچھا سا کڑھائی دار کھسہ لیتا۔ یہ پھٹا پرانا جوتا اس کا کون سا شوق پورا کر سکتا تھا۔ دوسرا قیاس یہ بھی ہے کہ یہ جوتا کسی ایسے شخص کے پاؤں سے نکل گیا ہو جس نے مریک کو اغوا کرنے کی کوشش کی مگر یہ بات دل کو نہیں لگتی۔ جوتوں کا یہ جوڑا بڑے سلیقے سے ایک بیڈ کے نیچے رکھا تھا اور کمرے میں بھی جدوجہد کے کوئی آثار نہیں ملے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ مریک کے زبردستی اٹھائے جانے کا کوئی امکان ہی نہیں۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا دولت سنگھ بیٹے کی طرف سے بے حد ہوشیار رہتا تھا۔ مریک کو بتائے بغیر دولت سنگھ نے اس کی نگرانی کا انتظام کر رکھا تھا۔ تفتیش کے دوران پتہ چلا ہے کہ اس کے دو کارندے سائے کی طرح مریک کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ جس رات مریک ہاسٹل کے کمرے سے غائب ہوا اس رات بھی ایک شخص ہاسٹل کے مین گیٹ پر موجود تھا جب کہ ایک دوسرا نوجوان کارندہ طالب علم کے روپ میں مریک کے ایک قریبی کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اگر مریک کو اغوا کیا جاتا یا وہ رات کو ہاسٹل سے نکلتا تو کم از کم دولت سنگھ کے مخبر بے خبر نہ رہتے۔“

انسپکٹر ساجن سخت الجھا ہوا تھا۔ وہ کالج کے زمانے سے ہی زیادہ محنت کا عادی نہیں تھا۔ کبھی کبھی تو بالکل ہڈحرام ہو جاتا تھا مجھے شک ہونے لگا کہ چند دن اور مریک کا سراغ نہ ملا تو ساجن بھی اسے ہوائی چیزوں کی کارستانی قرار دے کر کیس داخل دفتر کر دے گا۔ وہ ساری رات ہم نے مختلف امکانات پر تبصرہ کرتے ہوئے گزار دی۔ صبح ہوئی تو اسی کمرے میں ہم نے ناشتہ کیا۔ جوتوں کا جوڑا ابھی تک سامنے میز پر رکھا تھا۔ دن کی روشنی میں جوتے زیادہ صاف طور پر نظر آرہے تھے۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے میری نظر بے خیالی میں جوتوں پر جمی ہوئی تھی۔ اچانک ایک چیز دیکھ کر چونک گیا۔ کپ نیچے رکھ کر میں نے جوتے کا ایک پاؤں اٹھایا اور اسے کھڑکی سے آنے والی روشنی کی طرف کر کے غور سے دیکھنے لگا۔ چمڑے

کے اس خاکستری جوتے پر بے شمار کالے ذرے چمٹے ہوئے تھے۔ جیسے نہایت باریک پھوار سی پڑی ہوئی ہو۔ یہ پھوار اتنی مدھم تھی کہ نہایت دھیان سے دیکھنے پر ہی نظر آتی تھی۔ سڑکیں بنانے والے جب پتھروں پر تارکول کا چھڑکاؤ کرتے ہیں تو ہوا کے زور سے یہ پھوار ارد گرد پھیل جاتی ہے۔ یہ ذرے کپڑوں پر آجائیں تو اتنے ڈھیٹ ثابت ہوتے ہیں کہ کئی بار دھلنے کے باوجود نہیں چھوٹتے۔ اب یہی ذرے مجھے جوتوں پر نظر آرہے ہیں۔ ان ذروں کو دیکھ کر میں نے دو اندازے قائم کئے ایک تو یہ کہ ذرے زیادہ پرانے نہیں ہیں اور دوسرے یہ کہ یہ ایک ہی بار جوتے پر نہیں آئے۔ وہ تہہ در تہہ چمڑے پر چڑھے ہوئے تھے۔ میں نے جوتوں کے تلووں کو زیادہ غور سے دیکھا تو ان پر بھی تارکول اور سنگریزوں کے ذرے موجود پائے۔

میں نے انسپکٹر ساجن کی توجہ ان چیزوں کی طرف دلائی اور خیال ظاہر کیا کہ ہوسکتا ہے یہ جوتے کسی ایسے مزدور کے ہوں جو سڑک بچھانے والوں کے ساتھ کام کرتا ہو...... میری بات سن کر ساجن کی آنکھوں میں چمک سی لہرا گئی۔ کہنے لگا۔ ”مجھے تمہاری بات میں وزن محسوس ہو رہا ہے آج کل لدھیانہ سٹیشن کے سامنے والی سڑک کشادہ کی جارہی ہے۔ دو ڈھائی ماہ سے وہاں کام ہو رہا ہے۔ ممکن ہے یہ شخص وہاں مزدوری کر رہا ہو۔“

میں نے انسپکٹر ساجن سے کہا کہ وہ آج ہی اپنے اے ایس آئی کو وہاں بھیجے اور سن گن لینے کی کوشش کرے۔ ممکن ہے کوئی سراغ مل جائے۔

انسپکٹر ساجن نے فوری طور پر ایک اے ایس آئی کو بلایا اور اسے ضروری ہدایات دے کر اسٹیشن کے علاقے میں بھیج دیا۔ انسپکٹر ساجن اب مجھے ہاسٹل کا وہ کمرہ دکھانا چاہتا تھا جہاں سے چار ہفتے پہلے رات کے وقت مریک غائب ہوا تھا۔ کمرہ دیکھنے کا مجھے بھی اشتیاق تھا لیکن اس وقت میں وہاں جا کر دولت سنگھ یا اس کے کارندوں کی نگاہوں میں آنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دولت سنگھ کے کارندے لدھیانے میں ہر طرف منڈلا رہے ہیں۔ میں نے ساجن کو شام تک کے لئے ٹال دیا اور خود خاموشی سے تھانے کی دوسری منزل پر ایک کمرے میں آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا۔ میں نے ساجن سے کہہ دیا تھا کہ کسی کو میری آمد کی خبر نہیں ہونی چاہئے۔ سفر کی تھکاوٹ تھی، گہری نیند آگئی۔ سہ پہر تین بجے کا وقت تھا جب ایک سب انسپکٹر نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ یہ وہی سب انسپکٹر تھا جسے ساجن نے اسٹیشن بھیجا تھا۔ اس نے مجھے سیلوٹ کیا اور کہنے لگا۔

”جناب! میں ایک مشتبہ کو پکڑ کر لایا ہوں۔“

میں نے نیند میں ہچکولے کھاتے ہوئے کہا۔ ”ساجن کہاں ہے اس کے پاس لے

جاؤ۔"

سب انسپکٹر بولا۔"وہ تو جناب گشت پر نکلے ہوئے ہیں۔"

مجھے امید نہیں تھی کہ سب انسپکٹر کا لایا ہوا مشتبہ کارآمد ثابت ہوگا۔ لہٰذا مجھے زیادہ دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ایک بار تو دل میں آئی کہ سب انسپکٹر کو لوٹا دوں مگر پھر ہمت کر کے آنکھیں کھولیں اور اس کے ساتھ چلتا ہوا نیچے آ گیا۔ ساجن کے کمرے میں ایک نوجوان دیہاتی لڑکا بیٹھا تھا۔ اس کی شکل وصورت، ہاتھ پاؤں اور حلیہ بالکل دیہاتی مزدوروں جیسا تھا لیکن اس نے لباس اچھا پہن رکھا تھا۔ سلیٹی رنگ کی پتلون اور سیاہ قمیص تھی۔ قمیص کا پچھلا حصہ پتلون سے باہر نکلا ہوا تھا۔ گریبان کے بٹن الٹے سیدھے لگے تھے اور پتلون کی پیٹی نیچے لٹک رہی تھی۔ فوراً اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لباس اس کا نہیں ہے۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھ گچھ شروع کی۔ پہلے تو وہ کچھ بتانے سے انکار کرتا رہا اور کہتا رہا کہ یہ کپڑے اسے کوٹھی کے مالک نے دیئے تھے۔ پتہ نہیں کون سی کوٹھی اور کس مالک کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے جب اسے ٹھیک ٹھاک آنکھیں دکھائیں تو وہ راہِ راست پر آ گیا۔ تھر تھر کانپتے اور ہاتھ پاؤں جوڑتے ہوئے اس نے یہ انکشاف کیا کہ یہ کپڑے اسے کالج والے باؤ نے دیئے تھے۔

میں نے چونک کر پوچھا۔"کون سا کالج والا باؤ؟"

جواب میں اس نے مریک سنگھ کا حلیہ بتانا شروع کر دیا۔"لمبا قد، گھونگھریالے بال، ہاتھ میں کڑا اور تھوڑی تھوڑی نیلی آنکھیں۔" میرے ساتھ ساتھ سب انسپکٹر اور دوسرا عملہ بھی حیران رہ گیا۔ میں نے سب انسپکٹر سے پوچھا۔

"اسے کہاں سے لائے ہو؟" میرا اشارہ مشتبہ کی طرف تھا۔

سب انسپکٹر نے بتایا۔"یہ سڑک بنانے والے ٹھیکیدار کی لیبر میں کام کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے دیہاتی مزدور وہاں کام کر رہے ہیں۔ مجھے اس کے کپڑوں سے شک ہوا تھا۔ میں نے تھانے چلنے کو کہا تو یہ بُری طرح گھبرا گیا۔"

میں نے نوجوان سے نام پوچھا تو اس نے رام داس بتایا۔ وہ پونچھ کے ایک نواحی گاؤں کا رہنے والا تھا اور مزدوری کے لئے سری نگر آیا ہوا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"رام داس! جو کچھ بھی تمہیں معلوم ہے صاف صاف اور بغیر جھوٹ ملائے بتا دو۔ اسی میں تمہاری خیر ہے اور اسی میں ہمارا بھلا ہے۔"

رام داس نے رُک رُک کر اور گھبرا گھبرا کر جو کچھ بتایا وہ یوں تھا۔"آج سے کوئی چار

پانچ ہفتے پہلے وہ بے کار تھا اور روز صبح اڈے پر بیٹھنے جاتا تھا۔ (اڈے سے مراد وہ جگہ ہے جہاں مزدور پیشہ مزدوری کی تلاش میں بیٹھتے ہیں) ایک روز مریک سنگھ اور اس کا ایک دوست سکوٹر پر سوار وہاں پہنچے۔ وہ مزدوروں کا جائزہ لیتے رہے پھر ان کی نگاہ رام داس پر پڑی۔ انہوں نے کہا کہ ایک دن کا کام ہے۔ دیہاڑی طے کر کے رام داس ان کے ساتھ ہی سکوٹر پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں رام داس کو سیدھا کالج کے ہاسٹل میں لے گئے۔ یہاں ایک کمرے میں پہنچ کر انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور اسے چائے وغیرہ پلائی۔ بعد میں وہ کہنے لگے کہ انہیں مزدور وغیرہ کی ضرورت تو نہیں تھی دراصل وہ کالج میں ایک ڈرامہ کر رہے ہیں جس میں انہیں مزدوروں والا لباس درکار ہے۔ انہوں نے رام داس کو پانچ پانچ روپے کے چار کھڑکتے ہوئے نوٹ دیئے اور اس کا لباس مانگ لیا۔ نوٹ دیکھ کر رام داس فوراً کپڑے دینے پر تیار ہو گیا۔ اس رقم سے تو وہ ایسے بیس جوڑے خرید سکتا تھا۔ مریک نے اسے اپنا ایک پرانا جوڑا الماری سے نکال کر دے دیا۔ اس کے علاوہ ایک چپل بھی کہیں سے منگوا دی۔ رام داس شام تک اس کمرے میں ان کے ساتھ رہا۔ اندھیرا گہرا ہوا تو انہوں نے اسے تنگ سیڑھیوں کے ذریعے بلڈنگ کی پچھلی طرف پہنچایا اور پھر باہر نکال دیا۔"

یہ تھی رام داس کی کل روئیداد۔ یہ روئیداد ہمارے لئے بے حد اہم تھی۔ میں نے رام داس سے مختلف سوال کئے اور یہ نتیجہ نکالا کہ مریک سنگھ کا ساتھی لڑکا اس کا دوست عثمان ہی تھا۔ رام داس نے اپنا وہ جوتا بھی شناخت کر لیا جو وہ مریک سنگھ کو دے آیا تھا۔ اب یہ معمہ بے حد حیران کن تھا کہ مریک سنگھ کو اپنی روپوشی سے صرف ایک دن قبل دیہاتی لباس کی ضرورت کیوں پیش آئی ..... میں اور ساجن نے مل کر اس سوال پر بہت غور کیا اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ مریک سنگھ کو اپنی نگرانی کے بارے میں پتہ تھا۔ اپنے باپ کے مخبروں کو دھوکا دے کر خاموشی کے ساتھ ہاسٹل سے نکلنے کے لئے اس نے ایک دیہاتی لڑکے کا روپ بھرا..... لیکن یہ کوئی آخری نتیجہ نہیں تھا۔ بہت سے سوال ذہن میں اٹھتے تھے۔ جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کیا ہاسٹل سے فرار کے لئے یہ سوانگ رچانا ضروری تھا۔

اب رات ہو چکی تھی۔ ہم نے رام داس کو سب انسپکٹر کی تحویل میں دیا اور خود کالج کے ہاسٹل میں پہنچے۔ ہم دونوں سادہ لباس میں تھے تاہم ہاسٹل کا چوکیدار اور نائب سپرنٹنڈنٹ انسپکٹر ساجن کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ہمیں مریک کے کمرے تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ہاسٹل کے محنتی طالب علم دیر ہوئی سو چکے تھے۔ بس کسی کسی کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور ایسی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ شطرنج، تاش یا بیت بازی کی محفل جمی

ہوئی ہے۔ ہم نے بہ آہستگی کمرے کا تالا کھول اور اندر داخل ہو گئے۔ کھڑکی کے پردے برابر کر کے ساجن نے ہلکی روشنی کا بلب جلا دیا۔ ویسا ہی کمرہ تھا جیسے عام ہاسٹلوں میں ہوتے ہیں۔ دو بیڈ، دو میزیں، دو الماریاں، دو ٹیبل لیمپ، ایک کیلنڈر اور ایک آرام دہ کرسی۔ الماریوں میں اور میز پر مریک سنگھ کی کتابیں اور دوسرا ساز و سامان بکھرا ہوا تھا۔ یہ سب چیزیں جُوں کی تُوں رکھی تھیں۔ انسپکٹر ساجن مجھے بتا چکا تھا کہ مریک سنگھ کے کمرے کا ساتھی پچھلے دو تین ماہ سے بیمار ہے اور جن دنوں مریک غائب ہوا وہ ہاسٹل میں نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ گمشدگی کی رات مریک سنگھ اس کمرے میں اکیلا تھا۔ میں نے طائرانہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ مجھے معلوم تھا انسپکٹر ساجن کمرے کی اشیاء کا کئی کئی بار معائنہ کر چکا ہوگا لہٰذا انہیں دیکھنے بھالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں کالج کے کمرے کے در و دیوار کو دیکھنے لگا۔ اگر کبھی آپ کو کسی کالج کے ہاسٹل میں جانے کا اتفاق ہوا ہو تو سب سے زیادہ دلچسپی آپ کو ہاسٹل کی دیواروں میں محسوس ہوئی ہوگی۔ ان دیواروں پر نوجوان نسل بذریعہ تحریر اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کرتی ہے۔ دروازوں، دیواروں پر ایسے ایسے فقرے لکھے ملتے ہیں کہ پڑھنے والا کبھی سر کو پیٹتا ہے کبھی روتا ہے۔ مریک سنگھ کے کمرے کی دیواریں بھی اس کی داستانِ عشق کی گواہ تھیں۔ جگہ جگہ رومانی شعر لکھے ہوئے تھے۔ کہیں انگریزی کے فقرے تھے کہیں اردو کے۔ ایک کھڑکی کی چوکھٹ پر باریک پنسل سے کوئی ایک ہزار دفعہ راحت کا نام لکھا ہوا تھا۔ ایک جگہ لکھا ہوا تھا۔ ''تُو میری زندگی کی مالک ہے راحی۔ مجھ سے نہ بچھڑنا۔ میں مر جاؤں گا۔'' ایک میز کے تختے پر دھوبی کا حساب لکھا ہوا تھا اور اس کے نیچے مریک سنگھ کی لکھائی میں ایک فقرہ تھا۔ ''بدھ اور سوموار کو مل سکتی ہے۔ رات نو بجے آئے گی۔ صرف آدھ پون گھنٹہ ٹھہرے گی۔''

میں نے اس فقرے پر خاص طور سے غور کیا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ تحریر تازہ تھی اور اسی ہولڈر سے لکھی گئی تھی جو اب بھی میز پر موجود تھا۔ میں نے ساجن کی توجہ تحریر کی طرف دلائی اس نے بتایا کہ وہ پہلے بھی یہ فقرہ پڑھ چکا ہے۔ شاید کسی لڑکی وڑکی کا معاملہ ہے۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''تو کیا یہاں لڑکیاں بھی آتی ہیں؟''

ساجن بولا۔ ''یہ امیر زادے سب کچھ کرتے ہیں نواز صاحب ..... سپرنٹنڈنٹ تو ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے نوٹوں کے سامنے۔ لڑکیاں نہیں آئیں گی تو اور کیا ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن میرا خیال ہے مریک سنگھ ایسا نہیں تھا۔ اسے تو راحت جان کے سوا کچھ اور نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔''

ساجن بولا۔ ''آج کل کے لونڈوں کے بارے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دیکھئے فقرہ پڑھ کر آپ کا دھیان لڑکی کی طرف ہی گیا اور میرا بھی لڑکی کی طرف گیا تھا۔ لڑکی کا ہی چکر ہوگا۔''

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ کچھ دیر کمرے کا جائزہ لینے اور ہاسٹل کے عملے سے ضروری سوالات کرنے کے بعد ہم واپس آ گئے۔ میں نے دیکھا کہ مریک سنگھ کے کمرے کی دونوں طرف کم از کم تین تین کمرے خالی ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ مریک سنگھ کی گمشدگی کے بعد جو افواہیں پھیلی ہیں ان سے خوفزدہ ہو کر لڑکے کمرے چھوڑ کر دوسرے کمروں میں چلے گئے ہیں۔

ہم ہاسٹل سے تھانے واپس آ گئے۔ وہ ساری رات میں نے مریک سنگھ کیس کی فائل دیکھتے ہوئے گزار دی۔ فائل پڑھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ بیچارے انسپکٹر ساجن نے مریک کو ڈھونڈنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس کے باوجود دولت سنگھ ہر وقت اسے لتاڑتا رہتا تھا۔

میں نے سری نگر میں دو دن اور گزارے اور مختلف طریقوں سے تفتیش کو آگے بڑھاتا رہا..... تاہم کوئی قابلِ ذکر کامیابی نہیں ہوئی..... صرف اتنا معلوم ہوا کہ دولت سنگھ اب پولیس سے مایوس ہو گیا ہے اور اس نے گمشدہ بیٹے کا سراغ لگانے کے لئے جرائم پیشہ لوگوں سے رابطے شروع کر دیئے ہیں اور انہیں بڑی بڑی رقموں کا لالچ دے رہا ہے۔ میں سوچنے لگا جھوٹی انا اور ضد انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ جس بیٹے کو وہ اپنے سے بڑا سردار بنانا چاہتا تھا اور جس کی شادی کسی راج کماری یا لارڈ کی بیٹی سے کرنا چاہتا تھا وہ بیٹا ہی نہیں رہا تھا اور اب وہ صرف اس کی صورت دیکھنے کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہا رہا تھا۔

بعض اوقات جو بات بڑے لائق فائق ذہنوں میں نہیں آتی، ایک معمولی شخص کے معمولی سے ذہن میں آ جاتی ہے اور وہ کسی مسئلے کا ایسا حل پیش کرتا ہے کہ عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں۔ ایک ایسا ہی واقعہ میرے سری نگر میں قیام کے دوران پیش آیا۔ میں اس واقعے کو آج تک بھول نہیں پایا۔ صبح دس گیارہ کا وقت تھا۔ میں رات دیر سے سویا تھا اس لئے ابھی تک بستر پر پڑا تھا۔ آج شام مجھے لدھیانے واپس روانہ ہونا تھا۔ اچانک صفائی کرنے والے جمعدار کے قدموں کی آواز آئی۔ وہ تھانے کی دوسری منزل کی صفائی کر رہا تھا۔ اس کا نام راجر مسیح تھا۔ ان تین چار دنوں میں وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ کہنے لگا۔

''انسپکٹر صاحب! میرے دماغ میں ایک بات آئی ہے کل آپ اور انسپکٹر ساجن صاحب میں بڑی بحث ہو رہی تھی۔ وہ کون سا فقرہ تھا جو آپ نے کمرے کی دیوار پر لکھا دیکھا

تھا؟''

میں سمجھ گیا کہ وہ لڑکی والے فقرے کی بات کر رہا ہے۔ صفائی کرتے ہوئے وہ میری اور ساجن کی باتیں سنتا رہا تھا۔ میں نے اسے فقرے کے الفاظ بتائے تو وہ تفتیشی افسروں کی طرح کہنے لگا۔ ''نہیں بادشاہو..... ایسے نہیں ڈائری سے پڑھ کر بتاؤ۔''

میں نے مسکراتے ہوئے ڈائری نکالی اور نوٹ شدہ الفاظ پڑھ دیئے۔ ''بدھ اور سوموار کو مل سکتی ہے۔ رات نو بجے آئی گی......صرف آدھ پون گھنٹہ ٹھہرے گی۔''

وہ جھاڑو کو ٹھوڑی کے نیچے ٹکا کر بولا۔ ''جناب! مجھے لگتا ہے یہ کسی ریل گاڑی شاڑی کی بات ہے۔ بدھ اور سوموار کو مل سکتی ہے۔ رات نو بجے ٹیشن پر آئے گی صرف آدھ پون گھنٹہ ٹھہرے گی اور اللہ بیلی ہو جائے گی۔''

خاکروب راجر مسیح کی مختصر سی بات نے میرے دماغ میں سینکڑوں بلب روشن کر دیئے۔ میں نے کہا۔ ''یار! تو نے بات تو واقعی کمال کی ہے۔'' میں بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور انسپکٹر ساجن کو اوپر بلانے کے لئے آوازیں دینے لگا۔

☆======☆======☆

راجر مسیح کی بتائی ہو لائن پر ہم نے تفتیش کی اور 24 گھنٹے کے اندر اندر ایک سنسنی خیز بات کا علم ہوا۔ سرجیت برادرز نامی ایک پرائیویٹ بس کمپنی ہر بدھ اور سوموار کو اور کبھی کبھی جے کو سری نگر اور لدھیانے کے لئے ایک ڈائریکٹ بس چلاتی تھی۔ اپنے سفر کے دوران یہ بس رات نو بجے کے قریب لدھیانہ پہنچتی تھی اور آدھ پون گھنٹہ رکنے کے بعد آگے روانہ ہو جاتی تھی۔ مریک بھی سوموار کی رات غائب ہوا تھا۔ یہ سوچا جا سکتا تھا کہ اس رات وہ سرجیت برادرز بس سروس کی بس میں بیٹھ میں لدھیانہ روانہ ہو گیا ہو۔ جس وقت وہ لدھیانہ روانہ ہوا اس نے دیہاتی لڑکے کا روپ بھرا ہوا تھا۔ لدھیانہ کا نام ذہن میں آتے ہی حالات کی انگلی ایک خاص طرف اشارہ کرنے لگتی تھی اور یہ اشارہ اتنا سنسنی خیز تھا کہ یقین نہیں آتا تھا۔ مریک سنگھ کے لدھیانہ پہنچنے کا ایک ہی مطلب تھا۔ وہ کسی طرح اس بات سے آگاہ ہو چکا تھا کہ اس کی محبوبہ لدھیانے کے ایک نواحی قصبے میں موجود ہے۔ اگر چند لمحوں کے لئے فرض کر لیا جاتا کہ واقعی ایسا ہوا تھا اور مریک دیہاتی لڑکے کے بھیس میں راحت سے ملنے یا اسے دربارے کی قید سے چھڑانے وہاں پہنچا تھا..... تو اب وہ کہاں تھا؟

میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے فوری طور پر لدھیانے واپس پہنچنا ہے کیونکہ اس کیس کی گمشدہ کڑی سری نگر میں نہیں لدھیانے میں تھی۔ میں نے اسی وقت انسپکٹر ساجن سے اجازت

طلب کی اور بذریعہ بس مظفر آباد روانہ ہو گیا جہاں سے مجھے پنڈی کے لئے بس مل سکتی تھی۔

حتی الامکان تیزی سے سفر کرتا ہوا میں اگلے روز شام کو لدھیانے پہنچا۔ لدھیانے پہنچ کر میں نے شاکر علی کے گھر کا رخ کیا۔ دروازے پر دستک دی تو راحت نے ہی کنڈی کھولی۔ پردے کی اوٹ سے مجھے دیکھنے کے بعد وہ سامنے آ گئی۔ اس کے خوبصورت ہاتھ گیلے آٹے میں لتھڑے ہوئے تھے اور وہ بالوں کی لٹ پیشانی سے ہٹانے کے لئے بار بار کہنی کا استعمال کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

''شاکر علی کہاں ہے؟''

اس نے حسبِ معمول سہمی سہمی آواز میں چند لفظ کہے جن سے مجھے صرف اتنا پتہ چلا کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ غالباً اس کی رات کی ڈیوٹی تھی۔ اتنے میں راحت کی بھابی بھی آ گئی۔ وہ تھوڑی بہت اردو سمجھ لیتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں راحت سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے احترام کے ساتھ اندر لے گئی۔ راحت کی بھابی کے ذریعے میں نے راحت سے چند باتیں کیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا دربارے کے ساتھ کشمیر سے آنے کے بعد کبھی مریک سے اس کی ملاقات ہوئی ہے۔ میرے اس سوال نے راحت کے چہرے کو شرم سے سرخ کر دیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی کہ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس نے کبھی سوچا تھا کہ مریک سنگھ اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچ جائے گا۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ میں چند مزید سوالات پوچھنے کے بعد راحت جان کے پاس سے اٹھ آیا۔ اب میرا رخ لدھیانہ کے پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف تھا۔ میں فوری طور پر دربار سنگھ سے ملنا چاہتا تھا۔ میری اطلاعات کے مطابق وہ اس وقت جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل میں تھا لیکن جب میں پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچا تو ایک اور ہی خبر سننے کو ملی۔ پتہ چلا کہ دربار سنگھ کا بھائی جائنٹ سیکرٹری راہوال سنگھ اسے جیل سے چھڑانے میں کامیاب رہا ہے۔ مجھے اس اطلاع سے شدید صدمہ ہوا۔ میں نے ڈی ایس پی لدھیانہ سے وعدہ لیا تھا کہ ڈیڑھ دو ماہ تک کسی طور دربار سنگھ کی ضمانت نہیں ہو گی۔ میں جھلایا ہوا ڈی ایس پی کے پاس پہنچا تو انہوں نے ایک مختلف خبر سنائی۔ انہوں نے کہا کہ دربار رہا نہیں مفرور ہوا ہے۔ اس کی صرف ایک کیس میں ضمانت ہوئی ہے جب کہ دو اور کیس باقی تھے لیکن وہ عدالت کے اندر سے پولیس اہلکاروں کو دھوکا دے کر نکل گیا۔ اب پتہ چلا ہے کہ وہ کشمیر میں اپنے دوست دولت سنگھ کے پاس چلا گیا ہے۔ اس کی تلاش میں ایک پارٹی کل ہی کشمیر روانہ کی گئی ہے۔

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ تفتیش کے اس مرحلے میں دربار سنگھ کو ہمارے ہاتھ سے نہیں نکلنا

چاہئے تھا۔ پریشانی کے عالم میں مَیں لدھیانے سے اپنے قصباتی تھانے میں پہنچا۔ یہاں دربار سنگھ کے بھائیوں نے بہت سر نکالا ہوا تھا اور سرِ عام مجھے سبق سکھانے کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے حسبِ عادت ایسی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اگلے روز مجھے کشمیر سے سردار دولت سنگھ کا ایک اور ''لو لیٹر'' ملا۔ اس نے دیدہ دلیری کی انتہا کر دی تھی۔ صاف صاف لکھا تھا کہ دربار سنگھ اس کے پاس ہے اور اگر میں نے یا میرے افسروں میں سے کسی نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہے تو وہ دربارے کو اس کی حویلی سے لے جا کر دکھائے۔ اس کے علاوہ ایک بار پھر مجھے ذلیل موت مارنے کی دھمکی دی گئی تھی اور یہ بھی اضافہ کیا گیا تھا کہ شاکر علی اور اس کے گھرانے کو ان کے کیئے کی سزا دی جائے گی۔

مجھے اس خط کی تحریر میں دربار سنگھ کا مسکراتا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے سوچا شاید وہ ابلیس اس وقت شراب کے نشے میں چور کسی اور کشمیری سیب میں اپنے منحوس دانت گاڑے بیٹھا ہوگا... دولت سنگھ کے مہمان خانے میں کوئی اور راحت جان اس کے ستم کا شکار ہوگی۔ میری آنکھیں جلنے لگیں۔ بے خیالی میں مَیں نے اپنا بایاں ہاتھ زور سے میز پر مارا۔ ٹوٹی ہوئی انگلیوں سے لے کر کہنی کے جوڑ تک درد کی ٹیسیں لپک گئیں اور میں تڑپ کر رہ گیا۔ درد چھڑ گیا تو میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ دماغ بدستور کیس کی گتھیوں میں الجھا ہوا تھا۔ ایک بات بالکل صاف تھی کہ اگر مریک سنگھ راحت کی تلاش میں یہاں آیا تھا تو اس قصبے میں ضرور پہنچا ہوگا۔ ہوسکتا ہے اس نے دربارے کے گھر کے آس پاس چکر لگائے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ دربارے سے بھی ملا ہو مگر سوال یہ تھا کہ اب وہ کہاں ہے؟ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ اسی علاقے میں کہیں موجود ہے۔ ممکن ہے اسی قصبے میں کہیں ہو۔ کچھ دیر سوچ بچار کے بعد میں نے ایک فیصلہ کیا اور تھانے کے پورے عملے کی ایک میٹنگ بلائی۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ اس قصبے میں یا قصبے کے اردگرد کسی ڈیرے پر ایک ایسا لڑکا موجود ہے جو یہاں کا رہنے والا نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے وہ کسی کے پاس ملازمت کر رہا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی نے اسے زبردستی روک رکھا ہو۔ اگر وہ حبس بے جا میں ہے تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ دربارے کے بھائیوں یا ان کے کسی جاننے والے کے پاس ہوگا۔ بہر حال جس طرح بھی ہو ہمیں اسے ڈھونڈنا ہے۔ میں نے سب سے کہا کہ وہ اپنے اپنے طور پر اس علاقے میں نگاہ رکھیں۔ اس کے علاوہ تمام کچے اور پکے مخبروں کو ہوشیار کر دیں۔ اس کے بعد میں نے عملے کو مریک سنگھ کی تصویر دکھائی اور اس کی شناخت کے لئے دیگر نشانیاں بتائیں۔ میں نے خاص طور پر ہدایت کی کہ یہ کام راز داری سے کرنا ہے ورنہ لڑکے کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

میری ان کوششوں کا نتیجہ تین روز بعد نکلا۔ جب عنایت تیلی نام کے ایک ہوشیار مخبر نے اطلاع دی کہ دربار سنگھ کے باغ میں روزانہ ایک فالتو آدمی کی روٹی جاتی ہے جس سے شک ہوتا ہے کہ انہوں نے وہاں کوئی بندہ رکھا ہوا ہے۔ کچھ روز پہلے باغ کے اندر سے چیخ و پکار کی آوازیں بھی سنائی دی تھیں جنہیں کھیتوں میں کام کرتی ہوئی چند عورتوں نے سنا تھا۔

میں نے اس اہم اطلاع کی اپنے طور پر تصدیق کرائی تو پتہ چلا کہ یہ واقعات درست ہیں۔ اب شک وشبہے کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ یقیناً باغ کے اندر کوئی گڑ بڑ تھی۔ اسی شام میں نے ڈی ایس پی لدھیانہ کو اپنے ارادے سے باخبر کیا۔ جب انہوں نے کارروائی کی اجازت دے دی تو میں نے قصبے میں واپس آ کر ایک مضبوط چھاپہ مار پارٹی ترتیب دی اور ایکشن کے لئے تیار ہوگیا۔

ہم نے رات قریباً گیارہ بجے نہایت خاموشی سے باغ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ کافی گھنا باغ تھا اور یہاں کے قلمی آموں کی پیٹیاں دربارا دو تین دفعہ میرے لئے بھیج چکا تھا۔ تاہم آج یہ آم، جامن اور امرود اس کے جرم پر پردہ ڈالنے سے قاصر تھے۔ ہم تیزی سے باغ کے اندر داخل ہوئے رکھوالی کرنے والے دو جسیم کتوں نے ہم پر حملہ کیا، جن میں سے ایک کو زخمی اور دوسرے کو ٹھنڈا کر دیا گیا۔ باغ کے رکھوالوں نے کوئی خاص مزاحمت نہیں کی۔ صرف دو آدمیوں نے جوابی فائرنگ کی، جن میں سے ایک بھاگ گیا اور دوسرے کو رستم ہند بلال شاہ نے جن چھما مار کر سر کے بل ایک پودے میں دے مارا۔ باقی تین آدمیوں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ باغ کے عین درمیان تین چار کمروں کا ایک مکان تھا جس کے صحن اور برآمدے میں لاتعداد خشک پتے بکھرے پڑے تھے۔ ہم آگے بڑھے تو اندرونی کمرے سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔ ایک سبز رنگ کے دروازے پر موٹا سا تالا لگا تھا۔ گرفتار ہونے والوں میں سے ایک لمڈھینگ نے چابی نکال کر تالا کھولا۔ اندر لالٹین کی روشنی میں ایک لڑکا نظر آیا۔ اس کے چہرے کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ اس کی ایک کلائی میں لوہے کی زنجیر تھی جس کا دوسرا سرا پلنگ نما چارپائی سے بندھا ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا...... یہ لڑکا مریک سنگھ ہرگز نہیں تھا۔ میرے سینے میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔

☆======☆======☆

ہماری توقعات کے بالکل برخلاف باغ سے برآمد ہونے والا لڑکا عثمان تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں عثمان سری نگر کالج میں مریک کا گہرا دوست تھا اور مریک کی گمشدگی کے چند روز بعد وہ بھی لاپتہ ہوگیا تھا۔ عثمان کے چہرے پر زخموں اور رگڑوں کے بہت سے نشان تھے

اور اس کے دائیں پاؤں کی بڑی پنڈلی سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ غالباً ابھی تک اس لباس میں تھا جس میں کئی ہفتے پہلے گھر سے غائب ہوا تھا۔ برآمد ہونے کے بعد سے وہ مسلسل رو رہا تھا۔ میں نے اس سے مریک سنگھ کے بارے پوچھا تو اس نے زار زار روتے ہوئے کہا۔

''مریک اب کہاں ہے..... مریک کو ان ظالموں نے مار ڈالا۔''

عثمان کی بات سن کر میں سناٹے میں رہ گیا۔ اس کے لہجے میں سچائی چیخ چیخ کر بول رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ کس نے مارا مریک کو؟''

وہ گرفتار شدگان کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ''انہوں نے۔ ان سب نے اسے مار ڈالا۔''

میری آنکھوں میں دولت سنگھ کا چہرہ گھوما جو بیٹے کی تلاش میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ راحت کی معصوم شبیہہ میری آنکھوں میں لہرائی، جو مریک سنگھ کا نام سن کر اب بھی نامعلوم جذبے سے سرخ ہو جاتی تھی اور ہاسٹل کے اس کمرے کا خیال آیا جس میں ابھی تک مریک کی کتابیں بکھری ہوئی تھیں اور جس کی ایک کھڑکی پر سینکڑوں دفعہ راحت کا نام لکھا ہوا تھا... میں نے حیرانی سے سوچا، کیا واقعی مریک مر چکا ہے۔ عثمان مسلسل رو رہا تھا۔ بہت مشکل سے میں نے اسے چپ کرایا اور کچھ بولنے پر آمادہ کیا۔ عثمان نے جو انکشافات کئے، وہ مختصراً اس طرح ہیں۔

''مریک سنگھ، دربارے کے اپنے ہاتھوں ہی قتل ہو چکا تھا اور اس واقعے کا علم دربارے کے چند خاص الخاص کارندوں کے سوا اور کسی کو نہیں تھا۔ مریک سنگھ یہاں کیسے پہنچا اور کیسے موت کے منہ میں گیا۔ اس کی تفصیل بتاتے ہوئے عثمان نے بتایا کہ گلمرگ سے واپس آنے کے بعد سے مریک کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ سارا دن ہاسٹل کے کمرے میں پڑا رہتا تھا یا پاگلوں کی طرح قبرستانوں اور پیروں فقیروں کے ڈیروں پر گھومتا رہتا تھا۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کے باپ نے راحت کو اپنے ایک دوست دربار سنگھ کے حوالے کیا ہے جو اسے لے کر پنجاب کے کسی شہر میں چلا گیا ہے۔

مریک کی حالتِ زار دیکھ کر عثمان نے راحت کا سراغ لگانے کی ٹھانی۔ اس نے دولت سنگھ کے ایک نوکر کو ساتھ ملایا اور کھوج لگایا کہ راحت جان لدھیانے میں یا اس کے آس پاس کہیں ہے۔ لدھیانے پہنچ کر اس نے تن تنہا راحت کی تلاش جاری رکھی اور آخر دربار سنگھ کا کھوج لگا لیا۔ اس کھوج کے بعد وہ خوشی خوشی سری نگر پہنچا اور ہوسٹل میں مریک کو اس کامیابی کی اطلاع دی۔ راحت جان کی خبر پا کر مریک خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اس نے پروگرام بنا

کہ وہ دیہاتی لڑکے کے روپ میں اس گاؤں پہنچے گا جہاں راحت جان رہتی ہے اور کسی طرح اسے وہاں سے نکال لے جائے گا۔ اس کے بعد وہ کسی دور دراز علاقے کے چھوٹے سے گاؤں میں نکل جائیں گے اور خاموشی سے نئی زندگی شروع کر دیں گے۔ اس کے لئے راحت ہی سب کچھ تھی اور اس کی خاطر وہ اپنی زمینیں، اپنا مرتبہ مذہب سب کچھ چھوڑ سکتا تھا۔ اپنا سکوٹر فروخت کر کے وہ ایک معقول رقم پہلے ہی حاصل کر چکا تھا اور اس کا خیال تھا کہ یہ رقم ان کی نئی زندگی کے آغاز کے لئے کافی ہو گی۔ .. اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق مریک اور عثمان نے ایک دیہاتی مزدور سے کپڑے حاصل کئے۔ مریک نے اپنا سر منڈوا کر مکمل دیہاتی کا روپ دھارا اور لدھیانہ روانہ ہو گیا۔ (وہ جوتا جو کمرے سے ملا اس لئے چھوڑ دیا گیا تھا کہ مریک کے ناپ کا نہیں تھا) لدھیانہ پہنچ کر مریک نے بڑی کامیابی سے اپنے منصوبے کو آگے بڑھایا۔ وہ دربار سنگھ کے پاس بطور کھیت مزدور ملازم ہو گیا اور اس کے ڈیرے پر سونے لگا۔

وہ برسات کی ایک تاریک رات تھی جب وہ اپنے تڑپتے مچلتے جذبات پر قابو نہ پا سکا اور اپنی بچھڑی ہوئی محبوبہ کی صورت دیکھنے کے لئے دیوار پھاند کر دربار سنگھ کے گھر میں داخل ہو گیا۔ شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا اور راحت سے اس کی ملاقات ہو جاتی لیکن دربارے کے ایک بھائی نے اسے دیکھ لیا۔ اس کے شور مچانے پر دوسرے دو بھائی بھی جاگ گئے اور انہوں نے مریک کو پکڑ لیا۔ مریک کی شکل وصورت اور لہجے سے دربار سنگھ کو پہلے ہی شبہ تھا کہ یہ لڑکا کشمیری ہے، جب وہ اس کے گھر سے پکڑا گیا تو دربارے کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس کا کوئی نہ کوئی تعلق راحت جان سے ہے۔ تینوں بھائیوں نے مریک کو مارا پیٹا اور پچھلے کمرے میں لے گئے۔ دربار سنگھ حالانکہ ایک سے زیادہ مرتبہ گلمرگ جا چکا تھا اور دولت سنگھ کی حویلی میں ٹھہر چکا تھا مگر ابھی تک مریک سنگھ سے اس کی بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس اجڑے پجڑے دیہاتی لڑکے کو دیکھ کر دربارا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ دولت سنگھ کا بیٹا ہو گا۔ وہ صرف اتنا ہی شک کر سکا کہ یہ راحت جان کا کوئی چاہنے والا ہو گا۔ اس نے مریک سنگھ سے بازپرس کی۔ مریک نے کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا اور اسی دوران ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر بھاگنے کی کوشش کی۔ دربارے کے ہاتھ میں تھری ناٹ تھری رائفل تھی۔ اس نے تاک کر نشانہ مارا اور گولی مریک کی کمر کے اندر سے گزر گئی۔ چند ہی لمحوں میں وہ برآمدے کے کچے فرش پر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس المناک واقعے سے دربارا اور اس کے بھائی بالکل پریشان نہیں ہوئے۔ انہوں نے راتوں رات مریک کی لاش اٹھوائی اور اپنے کھیتوں میں لے جا کر گہرائی میں دفن کرا دی۔''

یہاں تک بتا کر عثمان علی نے چند گہری سانسیں لیں اور اپنی میلی کچیلی آستین سے آنسو پونچھ کر بولا۔ ''اُدھر سری نگر میں مَیں مریک کے لئے سخت پریشان تھا۔ وہ کہہ کر گیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں واپس لوٹ آئے گا۔ مسلسل انتظار اور فکر مندی کے بعد میں نے خود لدھیانے آنے کی ٹھانی۔ ایک طرح سے یہ میری غلطی ہی تھی۔ مجھے احساس نہیں تھا کہ مریک کو قتل کرنے کے بعد دربارا وغیرہ کتنے چوکس ہو چکے ہوں گے۔ لہٰذا یہاں پہنچ کر جب میں نے ایک دن دربارے کے ایک مزارعے سے سن گن لینے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے ایک کوٹھے میں بند کر کے دربارے کے بھائیوں کو اطلاع کر دی۔ انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور باندھ کر اپنے باغ والے ڈیرے پر لے گئے۔ وہاں جا کر تینوں بھائیوں نے مجھے بہت مارا پیٹا۔ آخر مجھے بتانا پڑا کہ یہاں آنے والا لڑکا سردار دولت سنگھ کا بیٹا مریک تھا اور میں اس کا دوست ہوں۔ یہ باتیں سن کر دربارا اور اس کے بھائی کچھ خوفزدہ ہو گئے۔ اسی روز انہوں نے مجھے زنجیر ڈال کر کمرے میں بند کر دیا۔ وہ دو تین روز آپس میں مشورے کرتے رہے۔ کبھی ان کا پروگرام بنتا کہ مجھے مار دیا جائے۔ کبھی وہ سوچتے کہ خواہ مخواہ ایک اور قتل سر پر لینا ٹھیک نہیں۔ آخر وہ اس فیصلے پر پہنچے کہ مجھے کسی باز خان نامی قبائلی کے حوالے کر دیا جائے۔ اس قبائلی کو چند روز تک ان کے پاس آنا تھا اور وہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔''

یہ تھی عثمان کی کُل روئیداد۔ سفاک دشمنوں نے اس کی ایک ٹانگ توڑ ڈالی تھی اور چہرے پر بھی گہرے زخم چھوڑے تھے۔ اگر چند روز اور چھاپہ نہ پڑتا تو شاید مریک کی طرح وہ بھی کبھی اپنے گھر واپس نہ لوٹ سکتا۔ مریک کی موت کی اطلاع نے مجھے سخت دل گرفتہ کیا...... میں نے اسی روز ایک ڈیرے پر چھاپہ مار کر دربارے کے تیسرے بھائی کو گرفتار کر لیا۔ اسی روز دربارے کے ایک کارندے کی نشاندہی پر مریک کی لاش بھی برآمد کر لی تھی۔ اسے لباس سمیت دفن کیا گیا تھا۔ اس کی کمر میں گولی لگی تھی اور پیٹ پھاڑ کر دوسری طرف نکل گئی تھی۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجنے کے بعد میں نے فوری طور پر ایک خط لکھا اور اپنے ایک کانسٹیبل کو دے کر سری نگر بھیج دیا۔ یہ خط سورگ باشی مریک کے باپ سردار دولت سنگھ کے نام تھا۔ خط یوں تھا۔ ''سردار دولت سنگھ! ایک بار پھر تمہاری میزبانی کا لطف اٹھانے کو دل چاہتا ہے۔ تمہاری اور میری دشمنی اپنی جگہ، جب تمہارا دل چاہے دو دو ہاتھ کر لینا مگر اس وقت میں تمہیں ایک ایسے شخص کا چہرہ کرانا چاہتا ہوں جو تمہاری دشمنی کا حق دار مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ مجھے یقین ہے اس سے مل کر تمہیں حیرت ہوگی۔ اگر تمہاری اجازت ہو تو کچھ بتانے کے لئے حاضر ہو جاؤں۔''

میرا آدمی خط لے کر چلا گیا۔ اگلے روز رات کے وقت سری نگر سے اس نے لدھیانے تھانے میں مجھے ٹیلی فون کیا اور بتایا کہ دو گھنٹے پہلے اس نے میرا خط سردار دولت سنگھ کو پہنچا دیا ہے اور سردار نے کہا ہے کہ میں گلمرگ جا رہا ہوں انسپکٹر نواز مجھے وہاں آ کر مل سکتا ہے۔

میرا اس طرح سردار دولت سنگھ کے علاقے میں جانا کسی طرح خطرے سے خالی نہیں تھا۔ تاہم میں یہ خطرہ مول لینے کو تیار تھا۔

☆======☆======☆

وہ کشمیر کی ایک گرم دوپہر تھی۔ ہر طرف سبزہ تھا اور پھول مہک رہے تھے۔ ایک بڑے چشمے کے کنارے دولت سنگھ کی شاندار حویلی نہ کتنے زمانے سے خوبصورت مغرور حسینہ کی طرح سینہ تانے کھڑی تھی۔ ایسی حسینہ جس نے ایک تاریک رات میں مظلوم مسلمانوں کے خون کا پیالہ چڑھا لیا تھا اور اب اسے صدیوں تک بوڑھا نہیں ہونا تھا۔ جس وسیع و عریض گراسی میدان میں گتکا بازی کے مقابلے ہوئے تھے اور جہاں میں نے گتکا باز انیل کی پٹائی کی تھی وہاں اب کیاریاں تھیں، فوارے تھے اور پھولوں کے درمیان سفید مور گھوم رہے تھے۔ میں نے اپنی جیپ حویلی کے دروازے کے سامنے روکی۔ دولت سنگھ کو میری آمد کی اطلاع دی گئی۔ تھوڑی دیر بعد دو مسلح ملازم آئے اور میری تلاشی لینے کے بعد مجھے حویلی کے بڑے دروازے سے اندر لے گئے۔ دربار سنگھ کا ایک گرفتار شدہ ملازم بھی میرے ساتھ تھا۔ حویلی کی مختلف روشوں اور برآمدوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک سوئمنگ پول کے پاس آ گئے۔ سوئمنگ پول کے نیلگوں پانی کے قریب آرام کرسیاں رکھی تھیں اور سردار دولت سنگھ ایک کرسی پر نیم دراز ایک نیم عریاں لڑکی سے کندھے کی مالش کرا رہا تھا۔ یہ لڑکی غیر ملکی تھی۔ کچھ لڑکیاں جل پریوں کی طرح تالاب میں بھی تیر رہی تھیں۔ مجھے یہ منظر دیکھ کر زیادہ حیرت نہیں ہوئی کیونکہ میں پہلے ہی سن چکا تھا کہ دولت سنگھ نے مریک کے دل بہلاوے کے لئے کچھ عرصہ پہلے یہ انتظامات کئے تھے۔ اب وہ ''اداس بیٹا'' دنیا میں نہیں رہا تھا اور باپ اس کی گمشدگی کا غم غلط کرنے کے لئے جل پریوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس وقت میری نگاہ دربار سنگھ پر پڑی۔ وہ بھی تالاب میں موجود تھا۔ اپنے گرد لڑکیوں کی موجودگی نے اسے باغ باغ کر رکھا تھا۔ اس نے تالاب کی سیڑھی پکڑ کر عجیب انداز سے میری طرف دیکھا اور زور سے ست سری اکال کا نعرہ لگایا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی جیسے کہہ رہا ہو ''دیکھو! میں تمہارے سامنے ہوں، ہمت ہے تو آؤ پکڑو مجھے۔'' اس کے بھیگے ہوئے کیس اور بالوں سے اٹا ہوا خوفناک جسم دیکھ کر مجھے وہ منظر یاد آ گیا جب وہ اسی طرح قصبے کے کنوئیں پر نہا رہا تھا اور نازک سی راحت

جان اس کے لئے پانی کھینچ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر نفرت کی ایک لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ دولت سنگھ نے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے مجھے پرنام کیا اور ایک خالی کرسی بیٹھنے کو دی۔ اب دربارا بھی پانی سے نکل کر ہمارے پاس آ بیٹھا۔ اس نے اپنے ملازم کو میرے ساتھ دیکھ لیا تھا اور کچھ الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چند رسمی باتوں کے بعد میں اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ میں نے دولت سنگھ سے کہا۔

''سردار صاحب! جو خبر میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں، اسے تحمل سے سننا ہوگا اور پوری بات سننے سے پہلے کوئی رائے قائم نہیں کرنا ہوگی۔ میں امید کرتا ہوں ہوں کہ آپ اپنے حواس کو قائم رکھیں گے۔'' دولت سنگھ کا چہرہ اس کے گلے میں لٹکتے ہوئے سونے کے لاکٹ کی طرح زرد ہو گیا۔ میں نے بڑے محتاط لفظوں میں اور ٹھہر ٹھہر کر اسے مریک سنگھ کی موت کی اطلاع دے دی۔ چند لمحوں کے لئے تو یوں محسوس ہوا جیسے اس پر نہ ٹوٹنے والا سکتہ طاری ہو گیا ہے۔ پھر اچانک وہ اٹھا اور مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے مجھے مارنے کی کوشش کی تو اس کے ملازموں نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے انہیں بھی دو ہنٹر مارے اور چلانے لگا۔ ''یہ جھوٹ ہے..... یہ سب جھوٹ ہے۔ میرا بیٹا نہیں مر سکتا۔ وہ نہیں مر سکتا۔'' بہت دیر چیخ و پکار کرنے اور دھاڑیں مار مار کر رونے کے بعد وہ اچانک نڈھال سا ہو کر بیٹھ گیا اور پرسکون نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ عجیب سے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ''کون ہے میرا دشمن؟ کس نے مارا ہے میرے بیٹے کو؟'' اس کا انداز خوفناک تھا۔

میں نے دربار سنگھ کے ملازم کو اشارہ کیا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور ٹیپ ریکارڈ کی طرح فرفر بولنے لگا..... چند ہی منٹوں میں اس نے دربارے کا سارا کچا چٹھا دولت سنگھ کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ اب دولت سنگھ کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ حیرت کا سمندر بھی نظر آ رہا تھا۔ دوسری طرف دربارے نے اپنے ملازم کا گریبان پکڑ لیا اور اسے تھپڑ مارنے شروع کر دیئے۔ ساتھ ساتھ وہ چیخ رہا تھا۔ ''یہ سب جھوٹ ہے، بہتان ہے۔ کوئی بڑی گہری سازش ہے۔ کس نے پڑھایا ہے تمہیں؟ کس نے پڑھایا ہے؟'' وہ اپنے ملازم کو بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ میں نے ملازم کا گریبان دربارے کے ہاتھ سے چھڑایا اور گرج کر کہا۔ ''یہ سازش نہیں ہے دربارے۔ سچی اور کھری بات ہے۔ قصبے کی آدھی آبادی تیرے خلاف گواہی دے گی۔'' میں نے اپنے ساتھ آئے ہوئے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا کہ وہ جیپ میں بیٹھے ہوئے عثمان کو اندر لے آئے۔

چند لمحے بعد مریک کا جگری دوست عثمان علی کانسٹیبل کے کندھے پر ہاتھ رکھے اپنی ٹوٹی

ٹانگ کو گھسیٹتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر دربارے کا رنگ فق ہو گیا اور اس کے ہونٹوں پر پپڑی آ گئی۔ دولت سنگھ جلدی سے اٹھا اور عثمان لڑکھڑاتا ہوا اس سے لپٹ گیا۔ ''چاچا جان، چاچا جان۔'' وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اچانک میں نے دربار سنگھ کو بھگٹٹ بھاگتے دیکھا۔ وہ صرف ایک جانگیہ پہنے ہوئے حویلی کے عقبی دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ میری طرح سردار دولت سنگھ بھی اسے دیکھ چکا تھا۔ اچانک دولت سنگھ اتنی زور سے چیخا کہ حویلی کی دیواریں دہل گئیں۔ میرا اندازہ ہے کہ بغیر لاؤڈ سپیکر کے بھی یہ آواز کئی فرلانگ تک سنی جا سکتی تھی۔ دولت سنگھ کا سارا دکھ اور غم و غصہ ان چار لفظوں میں سمٹ آیا تھا۔ ''پکڑو اس کتے کو۔'' یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلتے ہی اس کے بے رحم مسلح کارندے دربارے کے پیچھے بھاگے پھر ایک فائر کی آواز آئی۔ عقبی دروازے کے پاس میں نے دربارے کو لنگڑا کر اوندھے منہ گرتے دیکھا۔ کارندے شکاری کتوں کی طرح اس پر جھپٹے۔ دولت سنگھ بھی کندھوں پر تولیہ رکھے اس کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ پانی میں آگ لگانے والی جرمن حسینائیں چیختی چلاتی تالاب میں سے باہر نکل رہی تھیں...... میں نے افراتفری کے یہ سارے مناظر دیکھے اور اپنے ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ مطمئن قدموں سے چلتا حویلی کے سامنے والے دروازے سے باہر آ گیا تھوڑی ہی دیر بعد ہماری تیز رفتار جیپ گلمرگ سے باہر جانے والی خم دار سڑک پر اڑی جا رہی تھی... مجھے اس امر میں ایک فیصد بھی شک نہیں تھا کہ دربارے کی بے گور و کفن لاش حویلی کے لانوں میں گھسیٹی جا رہی ہوگی۔

☆======☆======☆

دربارے کی عبرت ناک موت کے قریباً چھ مہینے بعد سردار دولت سنگھ بھی اپنے کسی دشمن کے ہاتھوں مارا گیا۔ وہ گھوڑے پر سوار جا رہا تھا کہ کسی نے پہاڑ کے اوپر سے دو فائر کئے۔ جن میں سے ایک فائر دولت سنگھ کے محافظ کی ٹانگ میں لگا جب کہ دوسرا دولت سنگھ کے سر میں روشن دان بنا گیا۔ بعد ازاں وہ ہسپتال میں آپریشن کے دوران چل بسا ایک ظالم کا یہ انجام اس کے ظلم کے عین مطابق تھا... راحت جان اپنے باپ شاکر علی کے ساتھ اب لدھیانہ میں تھی۔ میرے کہنے پر شاکر علی نے باندی پورہ کا رخ کیا اور دوڑ دھوپ کر کے مقبول نامی اس لڑکے کا کھوج لگا لیا جس سے راحت کا نکاح ہوا تھا۔ یہ ایک غریب اور سیدھا سادا دیہاتی لڑکا تھا۔ وہ راحت کے حسن سے مرعوب بھی تھا۔ اس نے سب کچھ جاننے کے بعد بھی راحت کو قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کی اور یوں ان دونوں نے ایک مردہ ازدواجی رشتے کو نئی زندگی بخش دی۔

یہاں ایک چھوٹا سا شرعی مسئلہ بھی پیدا ہوا مگر بالآخر خوش اسلوبی سے طے ہوگیا۔ اس مسئلے کا ذکر میں یہاں زیادہ اہم نہیں سمجھتا..... پرانی یادداشتیں دیکھتے ہوئے جب کبھی میں سوچتا ہوں کہ سردار ڈوگر دولت سنگھ کو کس نے قتل کیا تو میری آنکھوں کے سامنے ایک دھندلا سا چہرہ ابھر آتا ہے۔ راحت کے بھائی فردوس کا چہرہ، جسے میں نے گلے میں کپڑے کا جھولا ڈالے جھاڑ و پھیرتے دیکھا تھا۔ میں سوچتا ہوں شاید پہاڑ کے پیچھے سے گولی چلانے والے ہاتھ اسی کے تھے۔ میں تصور کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں کہ وہ سردار دولت سنگھ کو مارنے کے بعد قہقہے لگاتا پہاڑوں میں گم ہوگیا ہے۔ جب میں یہ قہقہے سنتا ہوں تو دل کو عجیب سا سکون محسوس ہوتا ہے اور یہ یقین پختہ ہونے لگتا ہے کہ ظالم اپنے انجام کو ضرور پہنچتا ہے..... وہ گولی جس نے بھی چلائی تھی وہ کشمیر کا بیٹا تھا اور اس نے ڈوگرے دولت سنگھ کو نہیں مارا تھا اس ظالمانہ نظام کو نشانہ بنایا تھا جس نے برس ہا برس سے سچائی کو زنجیر کر رکھا ہے۔ جب تک سچائی کو رہا نہیں کیا جاتا پہاڑوں کے پیچھے سے گولیاں چلتی رہیں گی اور تنگ گھاٹیوں میں زہریلے قہقہے گونجتے رہیں گے۔

☆======☆======☆

خوبصورت بلا

ایک ایسی لڑکی کی کہانی جس نے کیا جرم کی دنیا کو چھوڑا تھا؟ وہ بالکل بدلی ہوئی نظر آرہی تھی لیکن کیا یہ سب جھوٹ تھا؟ ایک شریف آدمی کیا اس کے چنگل میں پھنس گیا تھا؟ انسپکٹر نواز خان کی ایک نہ بھولنے والی تفتیشی کہانی۔

کنول عرف ونمالا کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اس عجیب وغریب لڑکی نے آخر کار قاری حفیظ احمد سے شادی کا فیصلہ کرلیا تھا اور مکمل طور پر ایک بدلی ہوئی لڑکی نظر آتی تھی۔ چند روز بعد قاری صاحب سے اس کی شادی بھی ہوگئی۔ ولیمہ میانوالی میں ہوا اور اس کے بعد دولہا دلہن واپس امرتسر آ گئے۔

میں نے کنول کی زندگی کے کچھ ڈھکے چھپے گوشوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تحریر پڑھنے کے بعد قارئین کے سامنے کنول کا کردار پوری طرح کھل جائے گا۔ قاری صاحب امرتسر کی ہی ایک مسجد میں امامت کر رہے تھے۔ میرے تھانے سے ان کی مسجد کا فاصلہ ایک ڈیڑھ میل تھا۔ قاری صاحب کی رہائش مسجد کے پاس ہی تھی۔ اکثر آتے جاتے ہماری ملاقات ہوجاتی تھی۔ قاری صاحب اپنی نوبیاہتا بیوی کی طرف سے بالکل مطمئن اور خوش نظر آتے تھے۔ ایک دن وہ مجھے چائے پلانے اپنے گھر لے گئے۔ میں سادہ لباس میں تھا۔ ہم بیٹھک میں بیٹھ کر بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ درحقیقت امرتسر میں ہم دونوں ہی نئے تھے اس لئے ایک طرح کا اپنا پن محسوس ہوتا تھا۔ ویسے بھی مولانا خوش اخلاق آدمی تھے۔

ہماری گفتگو کے دوران کنول نے دروازہ کھٹکھٹایا اور قاری صاحب نے اٹھ کر دروازے کی اوٹ سے چائے کے برتن لے لئے۔ کنول اب مکمل پردہ کرتی تھی۔ میں قریباً ایک گھنٹہ تک قاری صاحب کے گھر رہا اس دوران گاہے بہ گاہے کنول کی چوڑیوں کی جھنکار سنائی دیتی رہی۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ قاری حفیظ سے ان کی گھریلو زندگی کے بارے میں بات چیت کروں اور ان سے کنول کے بارے میں پوچھوں۔

دراصل میرے ذہن میں بار بار یہ بات آ رہی تھی کہ قاری صاحب کو کنول پر ایسے اندھا

دھند بھروسہ نہیں کرنا چاہئے اور اس پر نگاہ رکھنی چاہئے بلکہ میرے خیال میں تو قاری صاحب کو شادی میں بھی اتنی جلدی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ بظاہر کنول میں اب کوئی عیب نظر نہیں آتا تھا اور اپنے خاندان پر بیتنے والے حادثے کے بعد وہ مکمل طور پر شرافت کی پتلی دکھائی دیتی تھی۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے کسی وقت دال میں کالا نظر آتا تھا۔ کنول اب قاری صاحب کی بیوی تھی اور شوہر کے سامنے بیوی کے بارے زبان کھولتے ہوئے ہر بندے کو احتیاط کرنی چاہئے۔ میں بھی ''احتیاط'' سے کام لے کر واپس آ گیا۔ تاہم دل میں یہ ارادہ کرلیا کہ کسی نہ کسی طرح قاری صاحب تک اپنے خیالات ضرور پہنچاؤں گا۔

چند روز بعد عیدالاضحیٰ کا تہوار تھا۔ امرتسر میں بہت کم مسلمان تھے۔ قربانی دینے والوں کی تعداد بھی کم تھی۔ قاری حفیظ صاحب دنبہ ذبح کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے دعوت دی کہ عید کے روز دوپہر کا کھانا ان کے ہاں کھاؤں۔ میں تو شاید انکار کرتا مگر بلال شاہ پاس موجود تھا۔ دنبے اور دعوت کا سن کر وہ پھڑک اٹھا۔ اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور بڑی ہنرمندی سے میرے ساتھ ساتھ اپنی دعوت بھی پکی کرلی...... اگلے روز گیارہ بجے ہم ''دانت وغیرہ تیز کر کے'' قاری صاحب کے گھر پہنچے مگر وہاں دنبہ تھا، نہ دنبے کا گوشت اور نہ گھر والے۔ دروازے پر تالا لگا تھا۔ بلال شاہ بے چارے کو چکر آتے آتے رہ گیا۔ اتنے میں پڑوسی باہر نکلا۔ میں نے مولوی صاحب کے بارے پوچھا۔ وہ بولا۔

''وہ تو عید منانے میانوالی چلے گئے ہیں۔''

پڑوسی نے یہ بات ایسے انداز میں کہی کہ مجھے خواہ مخواہ شک گزر گیا۔ شاید وہ خود بھی یہی چاہتا تھا کہ مجھے شک گزرے اور میں اس سے تفصیل پوچھوں۔ میں نے اسے کریدا تو وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔ اتنے میں دو تین محلے دار بھی آ گئے۔ ان کی آنکھوں میں اَن کہی باتیں تھیں۔ ایک عورت نے ہاتھ نچا کر کہا۔

''اللہ ہی جانے جی کیا بات ہے۔ ہمیں تو یہی پتہ ہے کہ میانوالی گئے ہیں۔''

میں نے قاری صاحب کے پڑوسی کو گھور کر کہا کہ وہ بتاتا کیوں نہیں۔ کیا بات ہے۔ اگر اسے پتہ نہیں تو پھر اور کسے پتہ ہوگا۔ میرا انداز دیکھ کر پڑوسی زبان کھولنے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ مجھے اور بلال شاہ کو لے کر اپنے گھر کی بیٹھک میں آ گیا۔ محلے کے دو معزز افراد بھی ساتھ تھے۔ بلال شاہ بار بار اس بڑے رومال سے پسینہ پونچھ رہا تھا جو وہ ''کچھ گوشت'' ساتھ لے جانے کے لئے لایا تھا۔ پڑوسی بلرام نے کہا۔

''جناب! ہم آپ کے خادم ہیں۔ قاری صاحب بڑے نیک آدمی ہیں۔ ہم سب دل

سے ان کی عزت کرتے ہیں۔ ویسے بھی وہ آپ کے دوست ہیں۔ دل نہیں چاہتا کہ ان کے بارے ایسی بات کی جائے لیکن جناب حقیقت یہ ہے کہ قاری صاحب کی گھر والی..... میرا مطلب ہے اس کا چال چلن کچھ اور طرح کا تھا۔ چار پانچ روز سے ایک لفنگا اس سامنے والے تھڑے پر بیٹھا قاری صاحب کے گھر کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ پتہ نہیں کون تھا؟ کل شام جب قاری صاحب گھر آئے تو ان کی بیوی گھر میں نہیں تھی۔ انہوں نے پہلے ہمارے گھر سے پوچھا۔ پھر آلے دوالے سے پتہ کیا۔ وہ کہیں نہیں ملی۔ اصغر پرچون فروش نے بتایا کہ شام سے پہلے قاری صاحب کی گھر والی کپڑوں کی چھوٹی سی گٹھڑی لئے بڑی سڑک کی طرف گئی تھی۔ کپڑوں کی گٹھڑی سے قاری صاحب کا دھیان دھوبی کی طرف چلا گیا۔ وہ دھوبی کے پاس گئے لیکن معلوم ہوا کہ وہ وہاں نہیں آئی۔ عشاء کے فوراً بعد قاری صاحب نے دنبہ ایک پڑوسی کے سپرد کیا اور خود گھر کو تالہ لگا کر پتہ نہیں کہاں چلے گئے۔"

یہ اطلاعات میرے لئے بہت حیران کن تھیں۔ کنول کا یہاں کوئی بھی جان پہچان والا نہیں تھا۔ اگر کوئی تھا بھی تو وہ شوہر کو بتا کر جاتی۔ اس کا مطلب تھا کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ ممکن تھا ایک بار پھر وہی ڈرامہ اسٹیج ہوا ہو جو اس سے پہلے کئی بار ہو چکا تھا۔ قریباً دو برس پہلے قاری صاحب کے حجلہ عروسی سے وہ حاجی پہلوان کے ساتھ نکل بھاگی تھی اور حاجی کو ریلوے سٹیشن پر چھوڑ کر وہ لائلپور پہنچ گئی تھی۔ دھوکا کرنا اور نکل بھاگنا کنول کی فطرت تھا..... بہرحال میں اتنی جلدی کوئی رائے قائم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شام تک کہیں سے کنول کی خیر خبر آ جاتی اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے نہ گئی ہو۔ اسے کسی وجہ سے جانا پڑا ہو۔ بہت سے امکانات تھے۔

رات گئے قاری صاحب دربدر بھٹک کر واپس آ گئے۔ مجھے ان کی واپسی کا پتہ چلا تو سیدھا ان کے گھر پہنچا۔ ان کا چہرہ اُترا ہوا اور آنکھیں غالباً جاگنے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ مجھے اس شخص پر بے پناہ ترس آیا۔ حالات اشارہ کر رہے تھے کہ کنول انہیں پھر ڈنگ مار گئی ہے۔ مجھے دیکھ کر قاری صاحب کہنے لگے۔

"میں آپ ہی کی طرف آ رہا تھا۔ میری بیوی....."

میں نے کہا۔" قاری صاحب! مجھے سب پتہ چل گیا ہے۔ آپ زیادہ فکر مند نہ ہوں۔ اللہ نے چاہا تو ہم جلد اسے ڈھونڈ لیں گے۔"

قاری صاحب سر جھکا کر خاموش ہو گئے۔ میں نے پوچھا۔" آپ کا کیا خیال ہے۔ میرا مطلب ہے کسی پر شبہ ہے آپ کو؟"

وہ بولے۔" کئی روز سے ایک اجنبی شخص ہمارے گھر کے گرد منڈلا رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ میری اہلیہ کو اغوا کیا گیا ہے۔"

میں نے پرچون فروش کا بیان دہرا کر قاری صاحب کی دل آزاری مناسب نہیں سمجھی۔ پرچون فروش نے بتایا تھا کہ کنول کپڑوں کی گٹھڑی لئے خود گھر سے نکلی تھی۔ میں نے قاری صاحب سے قریباً ایک گھنٹہ مزید گفتگو کی اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ کنول کے بارے میں قاری صاحب کے دلی خیالات کیا ہیں۔ حالانکہ کنول دوسری بار گھر سے غائب ہوئی تھی۔ قاری صاحب کو ابھی تک اس کے بارے میں خوش فہمی تھی۔ لگتا تھا اپنی معصومانہ اداکاری سے اس ڈرامہ باز نے قاری صاحب کے دل پر گہرے نقش چھوڑے ہیں۔ جب میں قاری صاحب کے پاس سے اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ قاری صاحب کی آنکھوں میں امید کی شمع روشن ہوئی۔ وہ چپل پہن کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھلا تو سامنے کنول کی بجائے کوئی اور عورت کھڑی تھی۔ اس عورت کے پیچھے دو مرد بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے غور سے عورت کو دیکھا اور بھونچکا رہ گیا۔ وہ کنول کی ماں رئیسہ تھی۔ قارئین کو یاد ہو گا۔ بیگم رئیسہ کے بارے کنول نے بتایا تھا کہ وہ حیدرآباد جاتے ہوئے کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئی ہے۔ اس حادثے میں کنول نے اپنی دونوں بہنوں اور ڈرائیور کو بھی مار دیا تھا۔ جب کہ وہ خود معجزانہ طور پر بچ گئی تھی۔ غضب کی چکر باز اور جھوٹی لڑکی تھی۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اس کی کوئی نئی فنکاری سامنے آتی تھی۔ اب اس کی مردہ ماں قاری صاحب کے دروازے پر کھڑی تھی اور تیز نظروں سے ہمیں گھور رہی تھی۔ اس کی یادداشت غضب کی تھی۔ وہ مجھے دو سال بعد دیکھنے کے باوجود فوراً پہچان گئی اور اس کے ساتھ اس کی تیوریاں کچھ اور چڑھ گئیں۔ وہ قاری صاحب کو قریباً دھکیلتی ہوئی اندر آ گئی۔ کامدار ساڑھی، کھلے گلے کا بلاؤز، بوٹی بوٹی تھرکتی ہوئی، وہ ڈھلی ہوئی دوپہر تھی لیکن درجہ حرارت چڑھتے سورج کا تھا۔

سامنے آ کر بولی۔" اوہ..... تو..... تم ہو یہاں..... میں بھی کہوں ایک عام مولوی کو اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ رئیسہ کی بیٹی کو اغوا کرے اور گھر میں ڈالے۔"

میں نے کہا۔" بیگم رئیسہ! ذرا زبان سنبھال کر۔ انسان کی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔"

بیگم رئیسہ کے ساتھ آنے والا مرد بولا۔" تم بھی عورتوں سے بات کرنے کا طریقہ سیکھو۔"

یہ ایک لمبا تڑنگا شخص تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی میں جان گیا تھا کہ سادہ لباس میں یہ کوئی پولیس والا ہے لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس رینک کا آدمی ہے۔ رئیسہ نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

''ایس پی صاحب! یہی ہے وہ انسپکٹر جس کا میں نے ذکر کیا تھا۔''

اب اندازہ ہوا کہ میرا واسطہ کسی ایس پی سے پڑا ہے۔ ایس پی کچھ دیر تو مجھے گھورنے میں مصروف رہا پھر اپنے ساتھی کا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ''یہ بیلف ہے۔ کورٹ کے آرڈر پر بیگم رئیسہ کی بیٹی برآمد کرنے آیا ہے...... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''جناب! میں مقامی تھانے کا ایس ایچ او ہوں۔ میں بھی قاری صاحب کی اہلیہ کو تلاش کر رہا ہوں۔''

''کون اہلیہ؟''

''بیگم رئیسہ کی بیٹی۔ کنول بی بی۔''

''یہ غلط ہے۔'' بیگم رئیسہ دھاڑی۔ ''کنول کی شادی کسی سے نہیں ہوئی اس شخص نے میری بیٹی کو ورغلایا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بیگم رئیسہ! آپ کی بیٹی ماشاء اللہ بالغ ہے اور اس نے بہ خوشی قاری صاحب سے نکاح کیا ہے۔ قاری صاحب آپ کو نکاح نامہ دکھا سکتے ہیں۔''

بیگم رئیسہ بازاری انداز میں چیخی۔ ''بک بک مت کرو۔ میں نے بڑے دیکھے ہیں ایسے نکاح نامے۔ سیدھی طرح بتاؤ کہ لڑکی کہاں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہی سوال ہم آپ سے پوچھ سکتے ہیں۔ قاری صاحب کی بیوی کل رات سے غائب ہے اور وہ اس سلسلے میں رپورٹ بھی درج کرا چکے ہیں۔''

بیگم رئیسہ نے ایس پی سے کہا۔ ''راول صاحب! یہ سب ان کی چکر بازی ہے۔ انہوں نے خطرہ دیکھ کر لڑکی غائب کر دی ہے۔''

ہندو ایس پی کا پارہ عروج کی طرف جا رہا تھا۔ تاہم اس نے خود پر قابو پا کر ذرا تحمل سے کہا۔ ''انسپکٹر! میں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''میں حاضر ہوں جناب! اگر آپ مناسب سمجھیں تو تھانے چلے چلتے ہیں۔''

ایس پی نے کہا۔ ''نہیں، باہر میری کار کھڑی ہے، وہاں بیٹھ جاتے ہیں۔''

میں ایس پی کے ساتھ باہر کار میں آ گیا۔ کار کے نمبر سے اندازہ ہوا کہ ایس پی صاحب

ملتان سے تشریف لائے ہیں۔ تنہائی ملتے ہی ایس پی نے بزرگانہ لہجہ اختیار کیا۔ ''دیکھو انسپکٹر! خواہ مخواہ اس معاملے میں ٹانگ مت پھنساؤ۔ لڑکی کا پتہ ہے تو بتا دو۔ ہم نے ہر صورت لڑکی کو یہاں سے لے کر جانا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جناب! یہ صرف اتفاق ہے کہ آپ آئے ہیں تو میں قاری حفیظ کے گھر میں ہوں ورنہ اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ آج سے تین ماہ پہلے قاری حفیظ اور کنول مجھے لاری اڈے پر ملے تھے۔ چونکہ واقفیت تھی اس لئے علیک سلیک ہو گئی۔ کنول کی زبانی پتہ چلا کہ اس کی ماں اور بہنیں ایک حادثے میں ہلاک ہو گئی ہیں۔ وہ بے سہارا ہے اور اس نے قاری صاحب سے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ اس وقت وہ ایک پردہ دار گھریلو عورت نظر آ رہی تھی۔ چند روز بعد قاری صاحب سے اس کی شادی ہو گئی۔ اس بات کو تین ماہ ہو چکے ہیں۔ دو روز پہلے تک میاں بیوی کے تعلقات بالکل ٹھیک تھے۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کوئی ایسا واقعہ ہو جائے گا۔ مگر کل شام کے وقت کنول گھر سے غائب ہو گئی۔''

ہندو ایس پی ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا، جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ میرے بیان میں جھوٹ کتنا ہے اور سچ کتنا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''انسپکٹر نواز! میں جانتا ہوں تم اس قماش کے نہیں جس قماش کا بیگم رئیسہ تمہیں بتا رہی ہے۔ بہرحال تمہیں اس معاملے میں کسی کی طرف داری نہیں کرنی چاہئے۔ قاری حفیظ شکل و صورت سے نیک بندہ لگتا ہے۔ تمہارا شناسا بھی ہے لیکن میں حیران ہوں کہ اس نے کنول جیسی لڑکی پر دوسری بار بھروسہ کیا اور دھوکا کھایا۔''

میں نے کہا۔ ''جناب! شاید آپ نے ابھی تک اس لڑکی کی اداکاری نہیں دیکھی۔ جو کہانی سناتی ہے اس میں ایسا رنگ بھرتی ہے کہ سننے والا بے بس ہو جاتا ہے۔ قاری صاحب ویسے بھی نرم دل کے بندے ہیں۔ انہوں نے دونوں بار اس خیال سے دھوکا کھایا کہ ایک بے سہارا لڑکی کو گناہ کی دلدل سے نکلنے میں مدد دینی چاہئے۔''

ایس پی نے کہا۔ ''پھر تمہارا کیا خیال ہے۔ کہاں گئی ہے وہ لڑکی؟''

میں نے کہا۔ ''کیا کہہ سکتا ہوں جی۔ پتہ نہیں کون کون ہے اس کے پیچھے۔''

☆======☆======☆

بیگم رئیسہ اپنے چمچوں کے ساتھ قریباً ایک ہفتہ امرتسر میں رہی۔ وہ لوگ ہر جگہ کنول کی بُو سونگھتے رہے لیکن اسے پانے میں ناکامی ہوئی۔ ایک بار پھر وہ مداری کے کبوتر کی طرح غائب ہو چکی تھی۔ بیگم رئیسہ کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں ان سے پتہ چلا کہ وہ

اپنی بیٹیوں کے ساتھ کراچی میں مقیم ہے۔ ان کا فیشن ہاؤس قائم دائم ہے اور اس کی آڑ میں وہ تینوں خوب موج اُڑا رہی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے کنول کا اپنی بہنوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ بہنوں نے اسے بُری طرح مارا تھا اور ماں نے بھی ان کی طرف داری کی تھی۔ نتیجے میں کنول گھر سے غائب ہو گئی تھی اور نہ جانے کہاں کہاں گھومتی آخر قاری صاحب کے آنگن میں ٹپکی تھی۔

ملتان والے ایس پی صاحب تو اسی روز واپس چلے گئے تھے۔ بیگم رئیسہ چند روز قاری حفیظ کو خوفناک نتائج کی دھمکیاں دیتی رہی اور بیٹی کو ڈھونڈتی رہی۔ آخر ناکام ہوئی اور منہ لٹکا کر واپس چلی گئی۔ حالات ایک بار پھر پہلی ڈگر پر آ گئے۔ اگر کوئی شے واپس نہیں آئی تو وہ قاری صاحب کے گھر کی رونق تھی۔ کمرہ کمرہ گونجتی چوڑیوں کی جھنکار تھی اور وہ اطمینان تھا جو قاری صاحب کے جوان خوبصورت چہرے پر نظر آیا کرتا تھا۔ ایک اداس فرشتے کی مانند میں نے انہیں مسجد سے گھر اور گھر سے مسجد کی طرف آتے جاتے دیکھا۔ انہیں دیکھ کر ہر بار دل پر چوٹ سی لگی۔ ایسے میں اس حسین بلا کا چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگتا جواب تک نہ جانے کتنے گھروں کو اجاڑ چکی تھی اور کتنے بدنصیب مردوں کے کلیجے چھلنی کر چکی تھی اور یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر اپنے مشن پر تھی۔ اس کے منہ کو بے وفائی کا خون لگ چکا تھا اور وہ کسی جگہ کسی بھی وقت کوئی لاش گرا سکتی تھی۔ میں جب بھی قاری صاحب کو دیکھتا میرے دل میں خیال آتا کہ کسی دوسرے شخص کو ایسے انجام سے بچانے کے لئے کنول کو آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچانا ضروری ہے۔

کنول سے میری اگلی ملاقات قریباً ڈیڑھ ماہ بعد ہوئی۔ یہ ملاقات خاصی ڈرامائی تھی۔ غالباً مارچ کی آخری تاریخیں تھیں۔ طویل سردیوں کے بعد موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ میں اپنے عملے کے ساتھ رات کے گشت پر تھا۔ جیپ میں بلال شاہ بھی میرے ساتھ تھا۔ ہماری جیپ بالکل دھیمی رفتار سے امرتسر سے نولکھا گاؤں کی طرف جا رہی تھی۔ گشت کے دوران یہ ہمارا دوسرا راؤنڈ تھا۔ جب ہم بارہویں میل پر ڈیک نالے کی پلی پر پہنچے میری نگاہ ایک بند دین پر پڑی۔ یہ وین کچھ پُراسرار انداز میں پیپل کے درختوں تلے کھڑی تھی۔ ویگن کا زیادہ تر حصہ جھاڑ جھنکاڑ میں چھپا ہوا تھا۔ گشت کے دوران خالی گاڑیوں کو چیک کرنا ہمیشہ سے میرا دستور رہا ہے۔ میں نے ڈرائیور کو وین کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ جیپ بالکل پاس روک کر میں نے وین کے اندر جھانکا۔ وہ خالی تھی لیکن دوسری طرف کا دروازہ ادھ کھلا تھا جیسے کوئی افراتفری میں اسے چھوڑ کر نکل گیا ہو۔ اس جگہ کے پاس چند فیکٹریاں زیرِ تعمیر تھیں۔ ایک

چھوٹی سی کالونی بھی بنی ہوئی تھی۔ سوچا جا سکتا تھا کہ وین میں سے نکلنے والا یا نکلنے والے کالونی کی طرف گئے ہیں لیکن وہ وین کو مزید آگے لے جا سکتے تھے۔ ان درختوں تلے وین کو روکنا کیا معنی رکھتا تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کہیں نزدیک سے مدھم چیخ سنائی دی۔ چیخ واضح طور پر کسی مرد کی تھی۔ اب ہمارا جیپ میں رکنا غیر مناسب تھا۔ میں دو کانسٹیبلوں کے ساتھ نیچے اُترا اور آواز کی طرف بڑھا۔ ہمارے سامنے ایک زیرِ تعمیر کارخانے کے در و دیوار پھیلے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ سریے، بجری اور اینٹوں کے ڈھیر تھے۔ ہم محتاط قدموں سے چلتے فیکٹری کے اندر داخل ہوئے اور اس وقت دوسری چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ عورت کی تھی اور اس کے ساتھ کسی مرد کی ''ہائے...... ہائے'' بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ریوالور نکال لیا اور مختلف چیزوں کی آڑ لیتا موقعے کی طرف بڑھا۔ ہم فیکٹری کے احاطے میں ذرا اندر تک گئے تو مرد اور عورت کے چیخنے کی آواز بار بار آنے لگی۔ صاف طور پر پتہ چل رہا تھا کہ کچھ افراد ان پر زبردستی کر رہے ہیں۔ آخر لوہے کی ایک بڑی ٹینکی کے پیچھے چند سائے متحرک نظر آئے۔

''خبردار۔'' میں نے اور کانسٹیبل نے اپنی ٹارچیں ایک ساتھ روشن کرنے کے بعد کہا۔

ٹارچوں کی روشنی پانچ افراد پر پڑ رہی تھی۔ ان میں ایک لڑکی تھی جو ریت پر گری ہوئی تھی اور دھوتی قمیص والے ایک توانا مرد نے اسے دبوچ رکھا تھا۔ دو ہٹے کٹے دیہاتی افراد تھے جن کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ پاس ہی ایک مرد مادر زاد برہنہ بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے ایک شخص ہاتھ میں پستول لئے کھڑا تھا۔ یہ سارا منظر ایک ساعت کے اندر اندر میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ ہم چونکہ تاریکی میں تھے، مجرم ہماری صورتیں دیکھ سکے اور نہ یہ اندازہ کر سکے کہ ہم تعداد میں کیا ہیں۔

میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''پولیس نے تمہیں گھیرے میں لے لیا ہے۔ ہتھیار پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا دو۔''

پولیس کا نام سنتے ہی مجرموں میں سے دو ایک دم بھاگ اٹھے۔ میں نے پکار کر ساتھیوں سے کہا۔ ''پکڑو ان کو۔'' خود میں اس شخص کی طرف بڑھا جس نے لڑکی کو دبوچ رکھا تھا۔ وہ اب لڑکی کو ساتھ لے کر کھڑا ہو گیا تھا اور کوئی شے اس کی گردن پر رکھ دی تھی۔ یہ پستول تو ہرگز نہیں تھا۔ میں نے ذرا غور سے دیکھا تو کانپ کر رہ گیا۔ یہ قریباً ایک فٹ لمبا چمک دار چھرا تھا۔ دھوتی قمیص والے شخص کا انداز بتا رہا تھا کہ اپنے ساتھیوں کی طرح اس نے بھی نشہ کر رکھا ہے اور اگر میں نے اس پر قابو پانے کی کوشش کی تو کوئی بڑی بات نہیں کہ وہ لڑکی کو جان سے مار ڈالے۔ یہ عجیب بات ہے کہ میں اس وقت تک اور اس کے بعد بھی کنول کو

پہچان نہ سکا۔ ایک تو اس کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ دوسرے وہ بالکل مختلف لباس میں تھی۔ اس نے میموں کی طرح پینٹ بشرٹ پہن رکھی تھی۔ لڑکی کی گردن پر خوفناک چھرا دیکھ کر میں اپنی جگہ ٹھٹک گیا۔ لمبے تڑنگے شخص نے مجھے اور پولیس کو بے دریغ گالیاں دینا شروع کر دیں۔ لگ رہا تھا جیسے گالیوں کی ٹیپ چل گئی ہے۔ بدزبانی کے ساتھ ساتھ اس شخص نے الٹے پاؤں درختوں کی طرف کھسکنا شروع کر دیا۔ یہاں وین کھڑی تھی اور اس کا ارادہ وین تک پہنچنے کا تھا۔ جونہی میں قدم آگے بڑھاتا، وہ ایک گالی مجھے دیتا اور دوسری ناقابلِ بیان گالی لڑکی کو دے کر اعلان کرتا کہ وہ اس چھمک چھلو کا سر تن سے جدا کر دے گا۔ اس کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ملتان سائیڈ کا کوئی چوہدری یا زمیندار ہے۔

وہ چیختی روتی لڑکی کو کھینچتا آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا گیا۔ وہ جتنے قدم پیچھے ہٹتا، میں اتنے قدم آگے بڑھ جاتا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اس پر جھپٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اس کے پیچھے ایک تالاب کا پانی چمک رہا تھا اور وہ اس پانی سے بے خبر پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ آخر وہی ہوا جس کی امید تھی۔ تالاب کے عین کنارے پر پہنچ کر چوہدری ڈگمگایا اور لڑکی سمیت چھپاک سے پانی میں جا گرا۔ نسوانی چیخ دور تک گونجی اور میں نے بھاگ کر پانی میں چھلانگ لگائی۔ میں اپنے مدِمقابل کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ قصابوں والا چھرا ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہو اور وہ اس کے ذریعے میرا مزاج پوچھ لے۔ ہاتھ میں پکڑے ریوالور کا دستہ میں نے پورے زور سے اس کے سر پر مارا۔ وہ پانی میں سے ابھرنے کی کوشش کر رہا تھا، چوٹ کھا کر اوندھے منہ گر گیا۔ اس دوران بلال شاہ اور ہیڈ کانسٹیبل بھی موقعے پر پہنچ چکے تھے۔ بلال شاہ زور زور سے چلا رہا تھا۔ ''کیا ہوا خان صاحب؟ کیا ہوا؟'' پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اس نے دھڑام سے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ یوں لگا جیسے کوئی بھینس پھسل کر اندر آ گری ہو۔ تاریکی کے سبب پہلے تو بلال شاہ نے مجھے اپنے جن جپھے میں جکڑا لیکن جب میں نے اپنی پہچان کرائی تو وہ مجھے چھوڑ کر چوہدری کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چوہدری زبردست چوٹ کے سبب نیم بے ہوش ہو چکا تھا۔ بلال شاہ نے اسے سر کے بالوں سے پکڑا اور کھینچتا ہوا کنارے کی طرف لے چلا۔ اس ہنگامے میں مَیں چند لمحوں کے لئے لڑکی کو بالکل بھول گیا تھا۔ دفعتاً مجھے اس کا خیال آیا۔ میں نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ لڑکی کہیں نظر نہیں آئی۔ میرا جسم سنسنا اٹھا۔ تالاب خاصا گہرا تھا۔ اگر وہ تیرنا نہیں جانتی تھی تو ڈوب سکتی تھی۔ میں نے پانی میں غوطہ لگا کر اندھا دھند ہاتھ گھمائے۔ اچانک کوئی نرم ریشم جیسی شے میرے چہرے سے مس ہوئی یہ لڑکی کے بال تھے۔ میں نے ان بالوں کے

سہارے لڑکی کا بازو تلاش کیا اور اسے کھینچتا ہوا پانی کی سطح پر لے آیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم اسے تالاب کے کنارے اوندھا لیٹائے اس کے پیٹ سے پانی نکال رہے تھے۔ اس موقع پر میں نے پہلی بار غور سے لڑکی کا چہرہ دیکھا اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ کنول عرف زبیدہ عرف ونمالا المشہور رہری سنگھ کی پوتی ہے۔ میں اسے پہچان کر دنگ رہ گیا۔

☆======☆======☆

میں نے سب سے پہلے تو علاقہ انچارج کو کنول کے بارے اطلاع دی، پھر اسے اپنے گھر لے گیا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں کنول کے سلسلے میں کسی پر اعتبار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر اسے تھانے کی حوالات میں رکھا جاتا تو عین ممکن تھا کہ وہ راتوں رات ہی حوالات کے دونوں سنتریوں کو ایسی پھونک مارتی کہ وہ اس کے ''مرید'' بن جاتے اور بڑی عزت و احترام کے ساتھ اسے حوالات سے رخصت کر دیتے۔ دوسرا طریقہ جو عام طور پر استعمال ہوتا ہے یہ تھا کہ اسے عارضی طور پر محلے کے کسی شریف معزز شخص کے سپرد کر دیا جاتا۔ مگر خدا گواہ ہے کہ مجھے کوئی ایسا شریف معزز نظر نہیں آیا جو کنول جیسی ''بجلی'' کے جھٹکے سہہ سکے اور اس کے ہوتے ہوئے اپنی شرافت پر قائم رہ سکے۔ میں جانتا تھا یہ کڑوا گھونٹ مجھے ہی بھرنا پڑے گا۔ میں دل مضبوط کر کے اسے اپنے رہائشی کوارٹر میں لے گیا۔ اس وقت تک رات کے بارہ بج چکے تھے۔ کنول ابھی تک نیم بے ہوش تھی۔ بلال شاہ کے ساتھ مل کر میں اسے اندر کمرے میں اٹھا لایا۔ اس کے بال گردن سے اور لباس جسم سے چپکا ہوا تھا۔ چارپائی پر سیدھی پڑی وہ بارودی سرنگ کی طرح خطرناک لگ رہی تھی کہ جونہی کسی شریف بندے کا پاؤں الٹا سیدھا پڑا بھک سے اُڑ گیا۔ میں نے بلال شاہ سے کہا کہ وہ پڑوسی رام سنگھ کی بڑی بھاوج کو بلا لائے تاکہ وہ رات اس کے پاس رہے۔ بلال شاہ نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ ادھیڑ عمر عورت آئی تو میں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ یہ عیار لڑکی ہے اس کی طرف سے پوری طرح ہوشیار رہنا۔

بلال شاہ کو رام سنگھ کی بھاوج کے پاس چھوڑ کر میں تھانے واپس آ گیا۔ چوہدری کے سر پر خاصی چوٹ آ گئی تھی وہ ہسپتال میں تھا۔ تاہم اس کے ساتھیوں میں سے ایک حوالات میں موجود تھا۔ اسے میرے کانسٹیبلوں نے موقعہ واردات سے دو فرلانگ دور جا کر پکڑا تھا۔ باقی دونوں افراد فرار ہو گئے تھے۔ ملزمان کی اسٹیشن ویگن بھی قبضے میں لے لی گئی تھی۔ اس کے علاوہ وہ شخص بھی تھانے میں موجود تھا جسے ہم نے برہنہ حالت میں ملزموں کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ اس شخص کا نام مدن لال تھا۔ اب وہ ایک سنتری کی شلوار قمیص پہنے میرے کمرے میں سہا بیٹھا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اسی شخص سے بات کی۔ میرے سوال کے جواب

میں اس نے روتے ہوئے کہا۔

''جناب! ان لوگوں نے ہمارے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا ہے۔ یہ دیکھئے..... میری ٹانگیں .....اور یہ دیکھئے بازو۔ یہ سب سگریٹ سے جلنے کے نشان ہیں۔ وہ تو آپ پہنچ گئے ورنہ پتہ نہیں بی بی جی سے بھی کیا سلوک ہوتا...... میں سیٹھ للت چندر گھی والے کا ڈرائیور ہوں بی بی جی ان کی مہمان ہیں۔ یہ جو اسٹیشن ویگن ہے ہماری ہی ہے۔ میں ساڑھے نو بجے کے قریب بی بی جی کو ہوٹل پیراڈائز سے گھر لا رہا تھا۔ نہر کے دوسرے پل پر ایک بوڑھے نے ہاتھ دے کر گاڑی رکوائی۔ یہ لوگ درختوں میں چھپے ہوئے تھے۔ فوراً دروازہ کھول کر اندر گھس آئے۔ میری گردن پر پستول رکھ دیا اور بی بی جی کو گرا کر ان کے منہ میں گاڑی صاف کرنے والا کپڑا ٹھونس دیا۔ مجھے جالندھر روڈ کی طرف چلنے پر مجبور کیا گیا۔ راستے بھر یہ لوگ ہمیں ننگی گالیاں دیتے رہے اور بی بی جی سے بدتمیزی کرتے رہے۔ وہ بی بی جی کو دغاباز اور فریبی کہہ رہے تھے اور الزام لگا رہے تھے کہ وہ پیسے کھا گئی ہیں۔ ہمیں فیکٹری کے اندر لے جا کر انہوں نے بے تحاشا شراب پی۔ مجھ سے کہنے لگے کہ ۔ کہ ان کے ساتھ مل کر میں بھی بی بی کو ننگی گالیاں دوں۔ جب مجھ سے یہ نہیں ہوا تو وہ مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میرے کپڑے اتار کر ڈھیر کئے اور انہیں ماچس کی تیلی دکھا دی۔ پھر میری ٹانگوں کو جلتے سگریٹوں سے داغنے لگے۔ وہ لمبا شخص جسے سب ''ملک جی'' کہتے تھے بی بی جی پر پل پڑا، وہ ان کی عزت لوٹنا چاہتا تھا..... مگر بھگوان کی کرپا ہوئی اور آپ وہاں پہنچ گئے......

میری ہدایت پر ڈرائیور مدن لال کا یہ بیان قلم بند کر لیا گیا۔ اس کے بعد میں نے چوہدری کے گرفتار شدہ کارندے سے پوچھ گچھ کی۔ اس نے پہلے تو مالک کا وفادار بننے کی کوشش کی لیکن جب چھترول ہوئی تو وہ بکنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ دو تین ماہ پہلے تک کنول ملتان کے ایک ہائی کلاس ہوٹل میں ڈانس کرتی رہی ہے۔ وہیں اس کی ملاقات ملک جی سے ہوئی تھی۔ کنول نے تحفے تحائف کے نام پر ملک جی کے ہزاروں روپے کھائے ہیں۔ ملک جی نے اسے کوٹھی لے کر دی ہوئی تھی۔ وہ ان کے ساتھ گھومتی تھی اور ایک دن میں دس دس ہزار کی شاپنگ کرتی تھی۔ اس نے ملک جی سے شادی کا وعدہ کر رکھا تھا لیکن پھر ایک روز چپکے سے غائب ہو گئی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ کہاں گئی ہے۔ ملک جی اس کی ٹوہ میں تھے۔ آخر انہیں سراغ مل گیا۔

صورت حال اب بہت حد تک واضح ہو گئی تھی۔ ''ملک جی'' کنول کے پرستاروں میں سے تھا۔ کنول جس قسم کی زندگی گزار رہی تھی اس میں ایسے ہی ہنگامے پرورش پاتے ہیں۔

جیسا کہ بعد میں پتہ چلا ''ملک جی'' والا واقعہ کنول کے کراچی سے بھاگنے اور امرتسر میں قاری حفیظ تک پہنچنے کے درمیان وقوع پذیر ہوا۔ یعنی جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے۔ دو تین ماہ کے اندر یہ معاملہ پروان چڑھا اور ٹھپ بھی ہو گیا۔ تھانے کے کام سے فارغ ہو کر میں گھر واپس پہنچا تو صبح ہونے والی تھی۔ بلال شاہ برآمدے میں چارپائی ڈالے بیٹھا تھا اور بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا تھا۔ ایسے کام بس وہی کر سکتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا تھا کہ وہ سائیکل چلاتے چلاتے سو گیا اور نتیجے میں ایک ریڑھی والے پر جا گرا تھا۔ خیر میں اندر پہنچا رام سنگھ کی بھاوج چوکس بیٹھی تھی۔ اس نے بتایا کہ لڑکی ہوش میں آ گئی ہے۔ اب وہ چند لقمے چاولوں کے کھا کر سوئی پڑی ہے۔ میں نے عورت کو ہدایت کی کہ لڑکی کی یہاں موجودگی کا پتہ کسی کو نہیں چلنا چاہئے۔

میں رات بھر کا تھکا ماندہ تھا دوسرے کمرے میں جا کر سو گیا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد کسی نے آواز دے کر جگایا۔ دیکھا تو رام سنگھ کی بھاوج سرہانے کھڑی تھی۔ کہنے لگی۔

''لڑکی جاگ گئی ہے۔ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ بار بار یہی بات کہے جا رہی ہے۔''

میں چپل گھسیٹ کر باہر نکلا۔ برآمدے میں بلال شاہ کلچوں اور لسی کی مدد سے اپنا طوفانی ناشتہ کرنے میں مصروف تھا۔ میں اس کے پاس سے گزر کر کنول والے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بے تکلفی سے چارپائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ بال دو چوٹیوں کی صورت میں اس کے سینے پر بندھے ہوئے تھے۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ وہ کچھ دیر عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''نواز صاحب! رات میں نے آپ کو آپ کی آواز سے پہچان لیا تھا۔ یقین کریں آپ میرے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر آئے۔ ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جاتا.....''

میں نے چبھتے لہجے میں کہا۔ ''جو ہو چکا اس سے زیادہ اور کیا ہو گا۔ میں رحمت کا فرشتہ نہیں اور ہوتا بھی تو کیا کر لیتا۔ اس دنیا میں برائی اتنی زیادہ ہے کہ رحمت کے فرشتے بھی لٹ جاتے ہیں۔ قاری حفیظ ہی کو دیکھ لو۔ انہوں نے کیا برائی کی تھی جس کا صلہ انہیں مل رہا ہے۔''

یکا یک کنول کی آنکھوں میں آنسو برساتی پانی کی طرح امڈ آئے۔ اس نے چند سسکیاں لیں پھر ناک سے سوں سوں کی آواز نکالتے ہوئے بولی۔

''نواز صاحب! آپ نہیں جانتے اس دنیا میں ایک بار بدنام ہونے کے بعد عزت سے زندہ رہنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ مرد لوگ صرف تہمت لگانا جانتے ہیں، آپ کو کیا معلوم کمزور عورت پر کیا گزرتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ”کوئی وجہ تو نہیں کہ تمہاری بات پر یقین کیا جائے۔ بہر حال کہو، کیا کہنا چاہتی ہو۔“

وہ میرا طنز نظر انداز کر کے بولی۔ ”نواز صاحب! آپ نے میری زندگی بچائی ہے اور زندگی بچانا کوئی چھوٹا احسان نہیں ہوتا۔ میرا ضمیر اجازت نہیں دیتا کہ آپ سے کوئی بات چھپاؤں۔“

میں نے پکا منہ بنا کر کہا۔ ”ہاں بولو۔ کیا بتانا چاہتی ہو۔“

وہ دردناک انداز میں رونے لگی۔ اس نے آہوں اور ہچکیوں کے درمیان جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ پچھلے ماہ عید سے ایک روز پہلے اس کے گھر سے غائب ہونے کی وجہ یہی ”ملک جی“ اور اس کے غنڈے تھے۔ وہ بے خبر تھی کہ وہ اس کے ارد گرد گھوم رہے ہیں۔ وہ اپنے چند کپڑوں پر گوٹہ کناری لگوانے بازار گئی۔ راستے میں انہوں نے اس کے قریب گاڑی روکی اور کھینچ کر اندر بٹھا لیا۔ وہ اسے ایک ہوٹل میں لے گئے۔ وہاں ”ملک جی“ اور اس کے ساتھیوں نے کئی روز اس کی عصمت دری کی۔ بعد ازاں وہ اسے جگہ جگہ لئے پھرتے رہے۔ وہ اسے کوئی نشہ آور دوا پلا دیتے تھے جس سے وہ نیم جان رہتی تھی۔ ایک روز وہ اسے گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہے تھے۔ گاڑی اشارے پر رکی تو اسے فوجیوں سے بھرا ہوا ایک ٹرک نظر آیا۔ ہمت کر کے اس نے ایک دم شور مچا دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ ملک اور اس کے ساتھی گھبرا کر بھاگ نکلے۔ موقعے پر بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ان میں مشہور سیٹھ للت چندر گھی والے بھی تھے۔ وہ ترس کھا کر اسے اپنے ساتھ گھر لے گئے اور بڑی عزت کے ساتھ رکھا لیکن چند روز پہلے ملک جی اور اس کے شکاری کتے وہاں تک بھی پہنچ گئے۔ کل شام وہ ایک پارٹی میں شرکت کے بعد گھر واپس آ رہی تھی کہ انہوں نے اسے پھر اغوا کر لیا اور قتل کی نیت سے اس ویران علاقے میں لے گئے۔ ابھی کچھ دن اور زندگی کا عذاب سہنا تھا اس لئے وہ میرے ہاتھوں بچ گئی۔

گھڑی گھڑائی فلمی کہانی تھی۔ مگر اداکاری ایسی تھی کہ پتھر سے پتھر دل بھی پسیج جائے...... وہ کہہ رہی تھی۔ ”ملک جی اور اس کے کارندوں نے قریباً ڈیڑھ ماہ پہلے اس کا سراغ لگا لیا تھا۔ جب کہ میں پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ ملک اپنے ساتھیوں کے ہمراہ صرف ایک ہفتہ پہلے ملتان سے امرتسر پہنچا تھا۔ اس بات کا ثبوت ریلوے کے وہ ٹکٹ تھے جو ملک کے گرفتار شدہ کارندے کی جیب سے برآمد ہوئے تھے۔ میری تحقیق کے مطابق یہ سات روز پرانے ٹکٹ تھے۔ اس کے علاوہ میں نے اس ہوٹل سے بھی معلومات حاصل کی تھیں جس کی

رسید کارندے کی جیب سے نکلی تھی۔ اس ہوٹل میں سات روز پہلے ملک جی اور اس کے کارندوں نے دو کمرے بک کرائے تھے۔ انہوں نے ہوٹل کے منیجر سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ یہاں کسی مفرور لڑکی کو تلاش کرنے آئے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ کسی ہوٹل میں ڈانس وغیرہ کرتی ہو، لہٰذا انہیں ایسے ہوٹلوں کے پتے درکار ہیں۔ جواب میں منیجر نے انہیں چند ہوٹلوں کے پتے لکھوائے تھے۔

ان سارے بیانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ کنول کے آنسو مگرمچھ کے ہیں اور وہ اپنی فطرت کے عین مطابق مجھے جھوٹی داستان سنا رہی ہے۔ اپنے اس خیال کی مزید تصدیق کے لئے میں نے کنول سے پوچھا۔

”ملک جی سے تمہاری شناسائی کیسے ہوئی؟“

وہ بولی۔ ”میں ملتان کے ایک ہوٹل میں موسیقی کا پروگرام کرتی تھی۔ وہیں سے یہ بدمعاش میرے پیچھے پڑ گیا۔“

میں نے پوچھا۔ ”یہ تمہاری امی کی وفات سے پہلے کا واقعہ ہے یا بعد کا؟“

”یہ بعد کی بات ہے۔“ وہ بڑی روانی سے بولی۔

اب شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ کنول کو معلوم نہیں تھا کہ اس کی غیر حاضری میں اس کی ماں قاری صاحب کا دروازہ کھٹکھٹا چکی ہے۔ لہٰذا وہ بڑے دھڑلے سے مجھے اُلو بنا رہی تھی۔ میں نے بھی اُلو بننا ہی بہتر سمجھا اور اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔ میرے چہرے پر نرمی کے آثار دیکھ کر وہ کچھ اور کھل گئی۔ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

”نواز صاحب! میں بہت دکھی ہوں۔ لوگوں نے قدم قدم پر مجھے دھوکا دیا ہے اور میری بے چارگی کا مذاق اُڑایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی مجھے سمجھ ہی نہیں سکا۔ سب نے میرا خوبصورت جسم دیکھا ہے، کسی نے میرے دل میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ عورت سے مرد کا صرف ایک ہی رشتہ ہے...... ہوس کا...... خدا گواہ ہے مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ آپ کے گھر رات گزارنے کے باوجود ابھی تک میری عزت محفوظ ہے۔ کسی نے میرے جسم کو بھنبھوڑا نہیں۔ کسی نے اپنے احسان کی قیمت وصول نہیں کی۔ سچی بات یہ ہے انسپکٹر صاحب کہ......“ کچھ کہتے کہتے وہ چپ ہو گئی۔

میں نے کہا۔ ”کیا بات ہے چپ ہو گئی ہو۔“

وہ بولی۔ ”نواز صاحب! بد سے بدنام بُرا ہوتا ہے۔ آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گے کیونکہ آپ کی نگاہ میں مَیں دھوکے باز ہوں لیکن...... لیکن سچی بات یہ ہے نواز صاحب......

میں آپ کی شرافت کو دل سے مان گئی ہو۔ مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ دنیا ابھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی۔''

اپنی بات میں اور زور پیدا کرنے کے لئے وہ تھوڑا سا آگے کو جھک گئی۔ بوشرٹ کا ادھ کھلا گریبان پنکھے کی ہوا میں پھڑپھڑانے لگا اور دایاں گھٹنا میرے بائیں گھٹنے کو چھونے لگا۔ یہ سب کچھ اس نے اتنی بے ساختگی سے کیا کہ بس کمال کر دیا۔

میں نے ٹانگ سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''پھر اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟''

اس نے سر جھکایا اور اپنے ریشمی بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ کر بولی۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا نواز صاحب...... کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ میں خودکشی کرلوں گی۔ آپ...... آپ ہی مجھے بتائیں میں کیا کروں۔ کیا میں اس قابل ہوں کہ قاری صاحب کو اپنا چہرہ دکھا سکوں۔ ان کے گھر میں بیوی بن کر رہ سکوں۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے جو کچھ بتایا ہے اگر وہ صحیح ہے تو پھر مذہب اور معاشرہ تمہیں گناہگار نہیں سمجھتا۔ تم سچے دل سے توبہ تلہ کر چکی ہو اور اس کے بعد تم نے اپنی مرضی سے کوئی برائی کا کام نہیں کیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ سارے حالات جاننے کے بعد قاری صاحب تمہیں قصوروار ٹھہرائیں گے۔ انہوں نے سب کچھ جانتے بوجھتے تمہیں قبول کیا تھا اور میرا خیال ہے اب بھی کرلیں گے۔''

وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''نہیں نواز صاحب! میں اس نیک بندے کو بار بار دکھ دینا نہیں چاہتی۔ میری بدقسمتی اسے بھی زندہ درگور کردے گی۔''

میں نے کہا۔ ''اگر بدقسمتی سے تمہاری مراد ملک جی ہے تو اس کا میں ٹھیک ٹھاک انتظام کر رہا ہوں۔ دو تین برس تک وہ جیل سے باہر نہیں آئے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

''نہیں نواز صاحب۔ میں آپ کو کیا بتاؤں۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''میں اتنی جلدی یہ فیصلہ نہیں کرسکتی۔ پلیز آپ مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیں۔''

''پھر کہاں جاؤ گی اب؟'' میں نے گہری سانس لے کر پوچھا۔

''مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہی۔'' وہ بولی۔ ''جتنا سکون مجھے اس چاردیواری میں ملا ہے کبھی کہیں نہیں ملا لیکن میں جانتی ہوں میرا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی سیٹھ صاحب بہت پریشان ہوں گے۔ مجھے بیٹی بیٹی کہتے ان کا منہ سوکھتا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں اخباروں میں خبر ہی نہ چھپ گئی ہو۔''

میں نے کہا۔ ''آج تو نہیں چھپی۔ کل کا پتہ نہیں۔''

وہ میرا بازو تھام کر عاجزی سے بولی۔ ''پلیز نواز صاحب۔ مجھے جلدی سے سیٹھ صاحب تک پہنچا دیجئے۔ وہ بے چارے ویسے بھی دل کے مریض ہیں۔''

میرے بازو پر اس کی گرفت بڑی مقناطیسی تھی۔ جیسے صرف ہاتھ نہیں پورا جسم میرے بازو سے لپٹا ہوا ہو۔ میں نے ذرا لگاوٹ سے کہا۔ ''میرا تو خیال تھا یہ چاردیواری تمہارے لئے زیادہ محفوظ ہے۔'' اس کے حسین چہرے پر قوسِ قزح کا رنگ لہرا گیا۔ اپنی بھیدوں بھری آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ کر بولی۔

''میرا اپنا دل بھی یہی چاہ رہا ہے نواز جی لیکن اب مجھے جانے دیں۔''

اس نے ''اب'' ایسے انداز میں کہا تھا کہ مستقبل کے لئے بے شمار سہانے سپنوں کی کھڑکیاں کھل گئی تھیں۔ عجب معمہ لڑکی تھی یہ۔ لگتا تھا اس نے اپنے حسن و جمال کی ''سبیل'' لگا رکھی ہے۔ جس کے ہونٹوں پر بھی پیاس نظر آتی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں کے کٹورے اس کے سامنے کر دیتی تھی۔ صرف بارہ گھنٹے پہلے وہ پانی میں غوطے کھا کر نیم بے ہوش پڑی تھی اور اب آنکھوں آنکھوں میں مجھے یہ بات سمجھا رہی تھی کہ میں بھی اس کی ''تابڑ توڑ جوانی'' کے امیدواروں میں شامل ہوسکتا ہوں اور ممکن ہے کسی وقت میرا انکا بھی لگ جائے۔

سیٹھ للت چندر کا خیال آتے ہی وہ بے قرار ہوگئی تھی۔ اس نے اٹھ کر بے تکلفی سے بشرٹ کو پتلون کے اندر گھسیڑنا شروع کیا اور پھر پتلی کمر کے گرد پٹی کسنے لگی۔ اس دوران بلال شاہ اندر آگیا۔ اس نے کڑی نظروں سے مجھے گھورا پھر کنول کی حرکات نوٹ کرنے لگا۔ ایسے موقعوں پر وہ کوئی جلی کٹی بات کہہ دیا کرتا تھا۔ میں نے اس کے بولنے سے پہلے ہی کہا۔

''بلال شاہ! کنول بی بی ستارا روڈ جائیں گی۔ تم جلدی سے کوئی رکشا لے آؤ۔''

وہ دندناتا ہوا باہر نکل گیا اور جاتے جاتے کمرے کا دروازہ پورا کھول گیا۔ میں اس کی حرکت پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

☆======☆======☆

اسی روز خاموشی سے میں کنول کو سیٹھ کے پاس چھوڑ آیا۔ وہ سیٹھ کی رہائش گاہ کے قریب ہی تین کمرے کے ایک آرام دہ فلیٹ میں رہتی تھی۔ سیٹھ نے اسے ایک ملازمہ اور آنے جانے کے لئے اسٹیشن ویگن بھی دے رکھی تھی۔ میں اس کے ٹھاٹھ باٹھ پر حیران ہوا۔ اس موقع پر سیٹھ للت چندر سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ مختصر جسم کا دبلا پتلا شخص تھا۔ چہرے پر عینک، بال گچھوں کی صورت ٹوپی کے نیچے سے نکلے ہوئے۔ ماتھے پر قشقہ کھینچتا تھا اور دھوتی قمیص پہنتا تھا۔ پہلی نظر ہی میں وہ مجھے بڑا گھاگ لیکن بے حد بزدل شخص لگا۔ وہ کنول کو مار

بار پتری یعنی ”بیٹی“ کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ ”پتری تم کہاں چلی گئی تھیں۔ پتری میں تو سخت پریشان تھا پتری میں تو رپورٹ درج کرانے جا رہا تھا......“ سیٹھ کا رویہ دیکھ کر میں الجھ سا گیا۔ ایک طرف تو وہ کنول پر اندھا دھند دولت لٹا رہا تھا، دوسری طرف اسے پتری بھی کہہ رہا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سیٹھ للت جیسا شخص بغیر لالچ کے کسی پر دھیلا خرچ کر سکتا ہے۔ ایسے لوگ کسی کو بے سہارا تو کر سکتے ہیں، بے سہارا کو سہارا نہیں دے سکتے۔ نہ جانے سیٹھ کا کنول سے کیا مفاد تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ پتری کا لفظ صرف اس کی زبان پر ہو، دل میں اس کے بھی وہی شعلے ہوں جو کنول کو دیکھ کر ہر مرد کے دل میں بھڑک اٹھتے تھے...... لیکن سیٹھ میں کوئی ایسا دم خم بھی نظر نہیں آتا تھا۔ پیسہ کما کما کر وہ چوسے ہوئے آم کی طرح ہو چکا تھا۔ نہ گودا نہ گٹھلی۔ مجھے فوری طور پر سمجھ نہیں آئی کہ اس چلتے پھرتے مُردے کو کنول پر پیسہ خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک امکان یہ تھا کہ ہوسکتا ہے کنول سے سیٹھ للت کا کوئی خفیہ رشتہ ہو۔ میں قریباً ایک گھنٹہ سیٹھ للت اور کنول کے پاس بیٹھا رہا اور اس انجانے رشتے کی ٹوہ لگانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر ان دونوں کے درمیان اس کے سوا کوئی رشتہ ثابت نہیں ہوا کہ کنول، سیٹھ للت کی منہ چڑھی منظورِ نظر ملازمہ تھی۔ کاروبار کے سلسلے میں جو لوگ بیرونی شہروں سے سیٹھ للت سے ملنے آتے تھے وہ انہیں خوش آمدید کہتی تھی۔ ان کے قیام و طعام کا بندوبست کرتی تھی۔ انہیں دربار صاحب، ٹھنڈی کھوئی، جلیانوالہ باغ اور کمپنی گارڈن کی سیر کراتی تھی۔ قہقہے بکھیرتی تھی اور انگریزی جھاڑ جھاڑ کر ان پر سیٹھ للت کا رعب بٹھاتی تھی۔ میرے ذہن میں آیا، ہوسکتا ہے وہ اس کے علاوہ بھی کچھ کرتی ہو۔ خاص مہمانوں کی ”خاص قسم“ کی خاطر تواضع بھی کی جاتی ہو۔ سیٹھ قسم کے لوگ کاروبار پھیلانے کے لئے عموماً ایسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ بزنس لینے کے لئے بہت کچھ پیش کر دیا جاتا ہے۔ کاروباری دوستوں سے کہا جاتا ہے، آپ تشریف لائیے ہمارے ہاں آپ کو گھر جیسا آرام ملے گا اور واقعی اتنا آرام دیا جاتا ہے کہ وہ ”گھر والیوں“ کو بھول جاتے ہیں۔

میں کنول کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا اس لئے سیٹھ کی گھی مل سے واپس آتے ہی میں نے اپنے ایک ہوشیار اے ایس آئی کو کنول کے پیچھے لگا دیا اور ہدایت کی کہ وہ اس لڑکی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرے اور یہ دیکھے کہ ملنے جلنے والوں سے کنول کے تعلقات کس نوعیت کے ہیں۔ ایک طرح سے میں نے مچھلی کو پکڑ کر پھر تالاب میں چھوڑ دیا تھا تاکہ دیکھ سکوں کہ وہ کتنا گند پھیلاتی ہے اور کہاں کہاں جاتی ہے۔ قاری حفیظ کو میں نے ان تمام معاملات سے بے خبر ہی رکھا تھا۔ میرے خیال میں انہیں بتانے کی

ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی بہت صدمے سہہ چکے تھے۔ ڈیڑھ دو ماہ جلنے کے بعد انہوں نے خود کو کسی حد تک پُرسکون کر لیا تھا اور اب اپنی زندگی کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کا سوچ رہے تھے۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ محلے داروں نے ان کے لئے کوئی نیک غریب لڑکی ڈھونڈ لی ہے اور اس کے وارثوں سے رشتے کی بات چلا رہے ہیں۔

اے ایس آئی نے دس پندرہ روز بعد مجھے اپنی مفصل رپورٹ دی۔ اس نے بتایا کہ وہ کنول کے بارے خاصی چھان بیان کرتا رہا ہے۔ وہ سیٹھ للت کے کاروباری دوستوں سے ملتی ہے۔ مگر یہ میل ملاقات عام سی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی ایسی خاص بات نظر نہیں آئی جس پر انگلی اٹھائی جا سکے۔ کئی دوسری فرموں اور اداروں نے بھی اس طرح کی ملازمائیں رکھی ہوتی ہیں۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں آنے جانے والے مہمانوں کو ڈیل کرتی ہیں۔ اے ایس آئی نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”میں نے اس سلسلے میں کنول کے ایک ساتھی ملازم ریکوری منیجر راجندر سنگھ سے بھی بات کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ فرم کے عملے میں کنول بی بی کی عزت ہے۔ زیادہ تر لوگ اسے میڈم کہہ کر بلاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ سیٹھ صاحب سے کہہ کر کوئی بھی آسان یا مشکل کام کرا سکتی ہے۔ سیٹھ اسے ”پتری“ کہتا ہے اور عام ملازموں سے بہتر سلوک کرتا ہے۔“

میں نے اے ایس آئی عظمت سے کہا۔ ”تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کنول فرم کی ایک ملازمہ ہے اور اس کے علاوہ اس کا وہاں کوئی کردار نہیں۔“

وہ بولا۔ ”بظاہر تو یہی لگ رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے۔ کنول جیسی ملازمہ کی تنخواہ کیا ہونی چاہئے؟“

وہ میری بات سمجھ کر بولا۔ ”یہی تو الجھن ہے جی۔ ایسی جاب کے لئے تنخواہ دوسرے الاؤنس وغیرہ ملا کر چار پانچ سو سے زیادہ نہیں ہوتی۔ سیٹھ للت کنجوس شخص ہے، شاید اس سے بھی کم دے۔ مگر اس نے تو کنول پر مہربانیوں کی بارش کر رکھی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”کم از کم دو سو روپیہ فلیٹ کا کرایہ ہے۔ نئے ماڈل کی اسٹیشن ویگن بمعہ پٹرول و ڈرائیور کنول کے استعمال میں ہے۔ اس کے رہن سہن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ نہیں تو ہزار روپیہ ماہانہ ضرور خرچ کرتی ہوگی۔ آخر کوئی بات تو ہوگی جو سیٹھ یوں روپیہ اس پر بہا رہا ہے۔“

اے ایس آئی نے کہا۔ ”پھر جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ اگر ضروری ہے تو میں کنول کی نگرانی جاری رکھتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ''ہاں...... فی الحال تم نگرانی جاری رکھو اور سیٹھ کے بارے بھی کھوج لگاؤ کہ اس کا کام کہاں کہاں پھیلا ہوا ہے۔''

...... یہ پانچویں چھٹے روز کی بات ہے۔ اے ایس آئی عظمت نے مجھے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ کنول اس وقت ہوٹل پیراڈائز میں موجود ہے۔ وہ اپنی ویگن کی بجائے ٹیکسی پر سفر کر کے یہاں پہنچی ہے اور ایک میز پر اکیلی بیٹھی کوک پی رہی ہے۔

ہوٹل پیراڈائز کے نام پر مجھے پہلے بھی حیرت ہوئی تھی۔ یاد رہے کہ یہ وہی ہوٹل ہے، جہاں سے واپسی پر کنول اپنے ڈرائیور مدن سمیت ملک جی کے ہاتھوں اغوا ہوئی تھی۔ سیٹھ للت کے کاروباری دوست جن دو ہوٹلوں میں ٹھہرتے تھے وہ اچھے معیار کے صاف ستھرے ہوٹل تھے۔ جب کہ پیراڈائز ایک دوسرے درجے کا پُر ہنگام ریستوران تھا۔ منگل اور ہفتے کی شب یہاں ڈانس وغیرہ ہوتے تھے اور قمار بازی کا چسکا بھی پورا کیا جاتا تھا۔ یہ بات سوچنے کی تھی کہ کنول پیراڈائز میں کیا کرنے گئی ہے۔ میں نے اے ایس آئی سے کہا وہ وہیں رہے، میں کچھ دیر بعد سادہ لباس میں وہاں پہنچتا ہوں۔

ٹھیک نصف گھنٹے بعد میں بھی ہوٹل میں موجود تھا۔ ہوٹل میں ناچ گانے کا شغل عروج پر تھا۔ نیم تاریک فضا، کان پھاڑ دینے والی موسیقی، دھوئیں کے مرغولے اور شراب کی بُو، دو منزلہ ہال کے فرش اور گیلریوں میں اَن گنت میزوں پر سامان خورد و نوش پڑا تھا اور فلور پر جوڑے ڈانس کر رہے تھے۔ تقسیم ہندوستان سے پہلے اس قسم کے مناظر عام ہوٹلوں میں دیکھے جا سکتے تھے۔ جونہی میں اندر داخل ہوا اے ایس آئی عظمت مجھے ساتھ لے کر گیلری کی ایک میز پر جا بیٹھا۔ ''رسم دنیا'' نبھانے کے لئے اس نے بھی میز پر کاجو اور شراب کی چھوٹی سی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ نیچے فلور کی جانب اشارہ کر کے اس نے مجھے کنول کی صورت دکھائی۔ وہ ایک لحیم شحیم شخص کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ڈانس کر رہی تھی۔ یہ شخص صورت سے ہی خطرناک غنڈہ نظر آتا تھا۔ سر کے بال بہت چھوٹے تھے۔ غالباً مشین پھروا رکھی تھی۔ کھلا سا کوٹ، نیلے رنگ کی بے ڈھنگی پتلون۔ کنول اس کی دیوہیکل بانہوں میں قریباً چھپ کر رہ گئی تھی۔ وہ نشے میں مست تھا اور رقص کرتے ہوئے بار بار دوسروں سے ٹکرا رہا تھا۔ چند لمحے بعد موسیقی اپنے عروج پر پہنچ گئی اور پھر زبردست چھناکے کے ساتھ رقص ختم ہو گیا۔ جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے اپنی میزوں کی طرف بڑھے۔ دفعتاً میری نگاہ کنول کے ساتھی پر پڑی وہ اسے کندھے پر لادے تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ لوگ ان دونوں کی طرف دیکھ کر ہنس رہے تھے اور کئی تالیاں بجا رہے تھے۔ کنول کی حرکات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے

اپنے ساتھی کا یہ جذباتی پن بالکل پسند نہیں آیا۔ وہ اس کے کندھے سے اُترنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر ایسا ہونا آسان نہیں تھا۔ کوٹ والا شخص کنول کو لے کر دوسری منزل پر آیا اور ایک راہداری میں داخل ہو کر رہائشی کمروں کی طرف بڑھا۔ عظمت کو میز پر چھوڑ کر میں ان دونوں کے پیچھے لپکا۔ ایک کمرے کے دروازے پر میں نے ان دونوں کو جا لیا۔

''اعجازی...... چھوڑو بھی اعجازی۔'' کنول بار بار کمزور آواز میں احتجاج کر رہی تھی۔

''رک جاؤ۔'' میں نے ان کے پیچھے پہنچ کر بھاری آواز میں کہا۔

کوٹ والے شخص نے تیزی سے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ وہ کرخت چہرہ شخص نشے کی وجہ سے اور بھی خوفناک لگ رہا تھا۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے مجھے سرتاپا گھور کر سرد لہجے میں کہا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' میں نے بھی اسی لہجے میں پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں دیوانگی ناچی۔ ایک قدم میری طرف بڑھا کر بولا۔ ''اوئے...... تُو کون ہے یہ پوچھنے والا؟''

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا پیچھے سے کنول نے مجھے اشارہ کیا۔ مطلب صاف طور پر یہی تھا کہ میں انسپکٹر کے طور پر اپنا تعارف نہ کراؤں۔

میں نے بات بدل کر کہا۔ ''تم اس سے زبردستی کیوں کر رہے ہو؟''

''نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔'' کنول نے کوٹ والے کی صفائی پیش کی۔ ''آپ جائیے۔''

غنڈے نے اپنی چھوٹی چھوٹی مکار آنکھیں مجھ پر گاڑیں۔ ''کیوں کچھ تسلی ہوئی یا بتاؤں تمہیں کہ ''زبردستی'' کسے کہتے ہیں۔'' وہ خطرناک انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''اوہ چھوڑو بھی اعجازی۔'' کنول نے بےزاری سے کہا اور اس کا بازو پکڑ لیا۔ غنڈہ اعجازی کچھ دیر مجھے تاؤ دلانے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔ تب اس نے جھک کر ایک بار پھر کنول کو کندھے پر لادا اور دروازہ کھول کر شڑاپ سے اندر چلا گیا۔

☆======☆======☆

اگلے روز علی الصبح میں نے کنول کو اس کے فلیٹ میں جا پکڑا۔ اتوار کی چھٹی تھی اس لئے وہ آرام سے پڑی سو رہی تھی۔ ادھیڑ عمر ملازمہ نے بتایا کہ رات وہ کسی ''شادی'' میں شریک تھی۔ تھوڑی دیر پہلے واپس آئی ہے اور سوئی پڑی ہے۔ یعنی ملازمہ چاہتی تھی کہ میں در دولت پر حاضری دینے پھر آؤں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ میں نے اسے سخت لہجے میں کہا کہ

وہ مالکن کو جگائے اور بتائے کہ انسپکٹر نواز خان ملنے آیا ہے۔ ''انسپکٹر'' کا لفظ سنتے ہی ملازمہ کی سستی دور ہوگئی اور وہ مالکن کو جگانے لپکی قریباً دو منٹ بعد کنول میرے سامنے تھی۔ ''یہ اُڑی اُڑی سی رنگت، یہ کھلے کھلے سے گیسو'' والا معاملہ تھا۔ میں نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔ وہ گڑبڑا کر بولی۔

''سوری نواز صاحب! آپ کو انتظار کرنا پڑا۔''

میں نے ملائمت سے کہا۔ ''سوری تو مجھے کہنا چاہئے۔ تمہیں اس وقت جگایا۔ کچی نیند سے اٹھنا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔''

اس کے چہرے پر سرخی سی لہرا گئی۔ بات بدل کر بولی۔ ''اپنوں کے لئے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ آپ مجھے صرف پانچ منٹ اور دیجئے۔ میں ابھی حاضر ہوتی ہوں۔''

پھر اس نے ملازمہ سے کہا کہ وہ میرے لئے تازہ اخبار لائے اور چائے کا پانی رکھے..... خود غالباً وہ باتھ روم میں گھس گئی تھی۔

قریباً پندرہ منٹ بعد جب میں خوشبودار چائے کی چسکیاں لے رہا تھا، وہ ہوا کے جھونکے کی طرح اندر آئی۔ تروتازہ اور بنی سنوری ہوئی۔ اس کے ساڑھی میں کسے ہوئے جسم پر نگاہیں جمانا دل گردے کا کام تھا۔ درحقیقت وہ اپنی دونوں بہنوں سے پُرکشش تھی کیونکہ اپنی ماں پر گئی تھی..... وہ ماں جو اب بھی کسی عاشق مزاج کا خانہ خراب کرسکتی تھی۔

کنول نے مجھے بے باکی سے مسکرا کر دیکھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ کل رات جو منظر میں دیکھ چکا تھا اس کے بعد کوئی لگی لپٹی رہ ہی نہیں جاتی تھی..... کنول اب صاف طور پر محسوس کررہی تھی کہ میں اس کے تیرِ نظر کا شکار ہوچکا ہوں اور وہ مجھ سے وہی سلوک کرنے جارہی تھی جو ایسی عورتیں اپنے چاہنے والوں سے کرتی ہیں۔ وہ بدذات اس بات کو بھی فراموش کرچکی تھی کہ میں اس کے شوہر کا دوست ہوں اور شوہر بھی وہ جو دامن نچوڑے تو فرشتے وضو کریں۔

اسے ذرہ بھر خوف نہیں تھا کہ میں اس کی کسی پیش قدمی کا جواب ایک زناٹے دار تھپڑ سے دے سکتا ہوں۔ اس کا حسن لوہے کا جال تھا اور وہ جانتی تھی اس جال میں پھنس کر کوئی پھڑ پھڑا نہیں سکتا۔ پھر اسے اندیشے پالنے کی کیا ضرورت تھی..... میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ دروازہ بند کرکے میرے پاس یوں آ بیٹھی جیسے کوئی سہیلی دوسری سہیلی کے پاس بیٹھتی ہے، چند روز پہلے اس کا گھٹنا میرے گھٹنے سے چھوا تھا اور آج پورا جسم چھو رہا تھا۔ میں یہ سب اس لئے لکھ رہا ہوں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو کہ خوبرو عورت جب برائی پر اُتر آئے تو وہ کتنی بے باک اور دلیر ہوجاتی ہے۔ رات میں نے اسے کسی دوسرے کے ساتھ دیکھا تھا لہٰذا اس کا خیال تھا

کہ میں رقابت کے انگاروں پر سلگ رہا ہوں۔ ان انگاروں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے وہ مہربان گھٹا کی طرح برسنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ میں نے اسے خود سے بمشکل دور رکھا لیکن بے تکلفی کا ماحول تباہ نہیں ہونے دیا۔ اشاروں کنایوں میں مَیں نے اسے یقین دلایا کہ اندر خانے میرا بیڑہ غرق ہوچکا ہے اور میں اب ہر طرح اس کے قابو میں ہوں۔ وہ مجھے بڑے شوق سے اُلو کا پٹھا سمجھ سکتی ہے اور کوئی کام بھی مجھ سے لے سکتی ہے۔ جب اسے ان باتوں کا یقین آگیا تو وہ کسی حد تک کھل گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ کوٹ والا اعجازی چندی گڑھ کا مشہور ومعروف بدمعاش ہے۔ وہ قتل کرچکا ہے اور دس بارہ سال جیل بھی کاٹ چکا ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''لیکن تمہارا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟''

وہ بولی۔ ''میرا تعلق اس سے نہیں سیٹھ للت سے ہے اور سیٹھ للت کا تعلق اعجازی سے ہے۔''

''کیا تعلق؟''

''وہی جو ایک سیٹھ اور خطرناک بدمعاش میں ہوسکتا ہے۔ اعجازی بہت دیر سے سیٹھ کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور اسے تنگ کرتا رہتا ہے۔ ایک مرتبہ تو وہ کسی بات پر غضب ناک ہوکر سیٹھ کی کوٹھی کو ہی آگ لگا دینے لگا تھا۔ سیٹھ، اعجازی سے بہت دبتا ہے۔ وہ پیسے سے محبت کرنے والا ایک بزدل شخص ہے۔ نہیں چاہتا کہ اعجازی سے اس کی دشمنی بڑھے اور کسی دن اعجازی یا اس کا کوئی کارندہ اس کے پیٹ میں خنجر گھونپ دے۔ خنجر کھانے سے وہ اتنا ڈرتا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیں۔ عجیب خبطی شخص ہے۔ پولیس کی مدد اس لئے نہیں لیتا کہ پولیس ناکام ہوجائے گی اور نتیجے میں اعجازی اس کی مزید بدبختی لے آئے گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''لیکن تم اعجازی کے پاس کیوں جاتی ہو؟''

''اس لئے کہ میرا جانا ضروری ہے۔ اعجازی میری بات مانتا ہے اور یوں سیٹھ للت اعجازی کی غنڈہ گردی سے بچا رہتا ہے۔''

اب پوری بات میری سمجھ میں آگئی اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ سیٹھ للت کنول پر اتنا مہربان کیوں ہے۔ کنول اپنے حسن اور اپنی ذہانت کی طاقت سے سیٹھ للت کے سر آنے والی ایک بڑی مصیبت ٹال رہی تھی۔ اس نے اعجازی کی منہ زوری کو اپنی محبوبانہ اداؤں کا اسیر کرلیا تھا اور اب سیٹھ للت سے منہ مانگی قیمت وصول کررہی تھی۔

میں نے کنول سے کہا۔ ''سیٹھ ایک طرف تمہیں اپنی بیٹی کہتا ہے اور دوسری طرف چارے کے طور پر تمہیں ایک بدمعاش کے سامنے ڈال رہا ہے۔''

وہ مسکرائی۔ ''نواز صاحب! آپ لفظوں سے کھیل رہے ہیں۔ یہاں کوئی چارہ ہے نہ چارہ ڈالنے والا اور نہ کھانے والا۔ یہ تو ایک سمجھوتہ ہے۔ میں اعجازی کے لئے آسانی پیدا کرتی ہوں۔ وہ سیٹھ کے لئے آسانی پیدا کرتا ہے اور سیٹھ میرے لئے آسانی پیدا کرتا ہے۔''

''کیا سیٹھ نے تمہیں خود کہا تھا کہ اعجازی سے رابطہ کرو۔''

وہ زیر لب مسکرائی۔ ''ہر بات کہی تو نہیں جاتی نواز صاحب۔ میں نے اپنے طور پر حالات دیکھ لئے تھے اور نتیجہ نکالا تھا کہ مجھے یہ سب کرنا پڑے گا۔''

''کتنی دیر سے تم یہ سب کچھ کر رہی ہو؟''

''قریباً ڈھائی ماہ سے۔''

''میں تمہیں اب یہ نہیں کرنے دوں گا۔'' میں نے ذرا گردن پھلا کر ایک کھرے عاشق کے لہجے میں کہا۔ ''سیٹھ للت کو اعجازی سے بچانے کے لئے اب تم نہیں میں پیرا ڈائز جاؤں گا۔''

وہ ایک دم چونک گئی۔ چہرے پر شگفتگی کی جگہ گہری سنجیدگی نے لے لی۔ ''آپ وہاں کیا کریں گے؟''

''میں گھاس نہیں کھودتا، پولیس انسپکٹر ہوں۔ میں دیکھوں گا کتنا بڑا بدمعاش ہے وہ۔''

وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''نواز صاحب! آپ ایس پی جگدیش سیٹھی کو جانتے ہیں ہیں ناں۔ جنہوں نے مجھے لائکپور سے گرفتار کیا تھا اور پھر حوالات بھیجنے کی بجائے اپنے گھر مہمان بنا لیا تھا؟'' میں نے کنول کے سوال کا جواب ''ہاں'' میں دیا۔ اس نے پوچھا۔

''جگدیش صاحب آج کل کہاں ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''شاید دہلی میں ہیں۔ ڈی آئی جی ہو چکے ہیں۔''

وہ بولی۔ ''آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ان سے آج بھی میرے بڑے اچھے مراسم ہیں۔ میں دو سطروں کا رقعہ لکھ کر بھیج دوں تو وہ سر کے بل چلے آئیں گے...... میں نے اعجازی کے مزاج درست کرانے ہوتے تو ان سے کراتی اور وہ اب تک پنجاب چھوڑ گیا ہوتا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تو پھر اس نیک کام میں دیر کاہے کی ہے؟''

وہ مسکرائی اور آپ سے تم پر اُترتے ہوئے بولی۔ ''نواز جی! اس میں بھی ایک راز ہے تمہیں کسی وقت بتاؤں گی۔''

میں نے کہا۔ ''اب بتانے میں کیا حرج ہے؟''

وہ بڑے انداز سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ''نواز جی! سچ پوچھتے ہو تو میں نے تمہیں دل ہی دل میں اپنا ہیرو بنا لیا ہے اور تمہیں پتہ ہے جو ہیرو ہوتا ہے ناں اس کی کوئی بات ٹالی نہیں جاتی۔ پتہ نہیں کیوں جی کرتا ہے کہ کلیجہ چیر کر تمہارے سامنے کر دوں۔''

میں نے دل میں سوچا، تمہارے جیسے چند جھوٹے دنیا میں اور پیدا ہو جائیں تو سورج طلوع ہونا چھوڑ دے۔ وہ جھوٹی ہی نہیں نہایت دیدہ دلیر بھی تھی۔ جس خود اعتمادی اور بے خوفی سے وہ مجھے قابو کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اپنی مثال آپ تھا۔ اپنے حسن اور نوخیز شباب پر اسے اتنا بھروسہ تھا کہ وہ ''ناکامی'' کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں بھی جان بوجھ کر اس کے رنگ میں رنگتا چلا جا رہا تھا۔ ایک سرد آہ کھینچ کر میں نے کہا۔

''میرا تو دل چاہ رہا ہے، اس حرامی کو آٹھ دس سال کے لئے اندر کرا دوں۔'' میرا اشارہ اعجازی کی طرف تھا۔

وہ دلربائی سے مسکرائی۔ ''نواز جی! کبھی تو برف کی طرح ٹھنڈے لگتے ہو اور کبھی بالکل گرما گرم۔ میں جانتی ہوں اعجازی کا خیال تمہارے دل پر آرے چلا رہا ہے مگر...... تمہیں کچھ دیر یہ سب کچھ برداشت کرنا ہی پڑے گا۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ جب تم اس سے پیچھا چھڑا سکتی ہو تو پھر کیوں نہیں چھڑا رہی ہو۔''

وہ کچھ اور قریب آ گئی۔ بے تکلفی سے بولی۔ ''نواز جی! سیٹھ للت ایک کمینہ آدمی ہے۔ تمہیں پتہ ہی ہے ایسے لوگ دولت پر سانپ بن کر بیٹھے رہتے ہیں اور بغیر ضرورت کے ایک پائی خرچ نہیں کرتے۔ سیٹھ مجھ پر اسی وقت تک مہربان ہے جب تک اسے اعجازی کا خوف ہے۔ اعجازی کو گرفتار کرانے پر سیٹھ مجھ سے بہت خوش ہوگا اور ممکن ہے چار پانچ ہزار روپیہ انعام بھی دے ڈالے لیکن اس کے بعد کیا ہوگا۔ اسے میری ضرورت نہیں رہے گی اور وہ میری جگہ دو تین سو روپے ماہوار کی لڑکی رکھ لے گا۔ میں اعجازی کو سیٹھ سے دور رکھنا چاہتی ہوں لیکن اتنا نہیں کہ سیٹھ مجھ سے دور ہو جائے......''

میں حیرانی سے کنول کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پچھلے دو ڈھائی برسوں میں کنول کی سوچ ایک جہاندیدہ عورت کی سوچ بن گئی تھی۔ ڈھائی برس پہلے وہ صرف ایک شریر لڑکی تھی جو راہ چلتے مردوں کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ جوان ہوگئی ہے۔ اسے روپے پیسے کا لالچ تھا اور نہ ہی کسی مرد کو پھانس کر رکھنا چاہتی تھی۔ بس ایک تند بگولے کی طرح وہ چکراتی پھر رہی تھی اور دوسروں

کو بھی چکرا رہی تھی، لیکن اب جو لڑکی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھی تھی وہ بلا کی شاطر اور چابک دست تھی۔ وہ پیسے بنانا جانتی تھی اور اس کے ارادے اونچی ہواؤں میں اُڑنے کے تھے۔ میں نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھا۔

''بھئی! بڑی دور دور کی سوچ رہی ہو تم۔ اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ ویسے ماہانہ کتنا چھلکا اتارتی ہو سیٹھ کا۔''

''کیا مطلب؟''

''یعنی کیا تنخواہ مل جاتی ہے۔''

''دیکھو..... دیکھو نواز جی۔'' وہ بڑے نخرے سے انگلی اٹھا کر بولی۔ ''اب تم زیادہ ہی لفٹ لیتے جا رہے ہو۔''

اتنے میں دروازے پر گھنٹی ہوئی۔ وہ چونک کر تیزی سے اٹھی اور جاتے جاتے کمرے کا دروازہ بند کر گئی۔ تھوڑی دیر بعد ملازمہ نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ میں بظاہر اخبار پڑھنے میں مصروف تھا لیکن میری توجہ برآمدے سے آنے والی آہٹوں پر لگی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی مرد گھر میں آیا ہے جسے بڑی خاموشی کے ساتھ قریبی کمرے میں لے جایا گیا ہے۔ ملازمہ اب باورچی خانے کی طرف چلی گئی تھی کیونکہ وہاں برتن بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اٹھا اور دبے قدموں چلتا کمرے کے بغلی دروازے تک پہنچ گیا۔ کہیں نزدیک ہی نلکا تھا جس کا پانی ٹپ ٹپ بالٹی میں گر رہا تھا۔ میں ہاتھ دھونے کے بہانے نلکے تک جا سکتا تھا۔ آہستگی سے دروازہ کھول کر میں ایک باتھ روم میں آ گیا اور ہاتھوں کو صابن لگانے لگا۔ نزدیکی کمرے سے کنول کی مدھم آواز آ رہی تھی وہ کسی مرد سے مصروفِ گفتگو تھی۔

''وڈے سائیں۔ آپ بیٹھیں تو سہی۔ کوئی چائے شربت، کوئی خدمت۔''

ایک بھاری بھرکم آواز آئی۔ ''او نہیں شہزادی۔ میں پھر آؤں گا.....'' چند لمحے خاموشی رہی پھر اسی آواز نے پوچھا۔ ''یہ ساتھ والے کمرے میں کون ہے؟'' میں فوراً جان گیا کہ اشارہ میری طرف ہے۔''

کنول نے کہا۔ ''کوئی نہیں..... چھوٹا سا تھانیدار ہے۔ عادت سے مجبور ہو کر کبھی کبھی رعب جمانے آ جاتا ہے۔''

بھاری آواز نے کہا۔ ''او بادشاہ زادی ایسے لوگوں کو زیادہ منہ نہ لگایا کرو۔ یہ لو اس کے بوتھے پر مارو اور دفع کرو یہاں سے۔''

اس کے ساتھ ہی مدھم آواز آئی۔ جیسے کسی نے نوٹوں کی گڈی لاپروائی سے میز پر پھینکی ہو ساتھ ہی قدموں کی چاپ گونجی۔ وڈا سائیں واپس جا رہا تھا لیکن اس دفعہ وہ سامنے والے دروازے سے نہیں نکلا۔ کنول نے اسے کسی دوسرے راستے سے رخصت کر دیا تھا۔ میں ہاتھ دھوئے بغیر صابن تولیے سے پونچھ کر واپس کمرے میں آ بیٹھا۔ چند لمحے بعد کنول لٹکتی مٹکتی اندر داخل ہوئی۔

''ایک تو یہ اخباروں والے چین نہیں لینے دیتے۔''

''کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''اخبار والا تھا۔ بس وہی انٹرویو۔ ملک جی کون تھا؟ کہاں سے آپ کے پیچھے لگا؟ آپ اب ڈانس کیوں نہیں کرتیں؟ وغیرہ وغیرہ۔''

وہ زبردست اداکارہ تھی۔ خوبصورتی سے بات ٹال رہی تھی۔ اگر میں نے خود اس کی باتیں نہ سنی ہوتیں تو ذرہ بھر شک نہ ہوتا۔ کنول کے اطوار سے ظاہر تھا کہ وہ کھل کر کھیل رہی ہے۔ ایک سیٹھ للت ہی اس کا شکار نہیں ہے اور بھی کئی آسامیاں اس نے گھیر رکھی ہیں جن میں ڈی آئی جی جگدیش سیٹھی بھی شامل ہے۔ وہ اپنی ہوشربا جوانی کے ایک ایک لمحے کی قیمت وصول کرتی نظر آتی تھی..... میں تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھ کر تھانے واپس آ گیا۔

یہ دوسرے روز کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ سچے عاشق کا پارٹ ادا کرتے ہوئے میں ایک بار پھر کنول کے فلیٹ پر حاضری دینے روانہ ہوا۔ میں سادہ لباس میں موٹر سائیکل پر سوار تھا۔ ابھی فلیٹ سے قریباً تین فرلانگ دور تھا کہ ایک ٹویوٹا کار مجھے اوورٹیک کرتی ہوئی تیزی سے نکل گئی۔ میں نے کار میں بیٹھے ہوئے افراد کی صرف ایک جھلک دیکھی اور مجھے شک گزرا کہ یہ بیگم رئیسہ کے آدمی ہیں۔ مجھے معلوم تھا بیگم رئیسہ اتنی آسانی سے کنول کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں۔ جس طرح یہ بھری پُری کار کنول کے فلیٹ کی طرف گئی تھی میرا ماتھا ٹھنکنا یقینی تھا۔ میں نے کچھ فاصلہ دے کر کار کا پیچھا کیا۔ یہ دیکھ کر میرے جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی کہ سرخ کار عین کنول کے فلیٹ کے سامنے جا رکی ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے کار کے چاروں دروازے کھلے۔ سیاہ چادر والی ایک عورت اندر سے نکلی۔ اس کے ساتھ ایک لمبا تڑنگا سکھ تھا۔ سکھ کی کمر سے بندھی ہوئی کرپان دور سے چمک رہی تھی۔ ایک تیسرا شخص گاڑی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اس کے کندھے سے ریوالور لٹک رہا تھا۔

چادر پوش عورت لمبے سکھ کے ساتھ فلیٹ کی سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ مجھے خطرے کی بُو آ رہی تھی۔ اس موقع پر میرا یہاں کھڑا رہنا ٹھیک نہیں تھا لیکن میں چادر پوش عورت کے پیچھے

فلیٹ میں بھی نہیں گھس سکتا تھا کیونکہ گاڑی کے پاس دو آدمی چوکس کھڑے تھے۔ اچانک مجھے اس عقبی راستے کا خیال آیا جہاں سے کل کنول نے وڈے سائیں کو اتارا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل کو کک لگائی اور فلیٹس کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ کنول کے فلیٹ کے نیچے مجھے ایک تنگ دروازہ نظر آیا۔ یقیناً یہ دروازہ خاص ضرورتوں کے لئے بعد میں بنوایا گیا تھا۔ میں نے قریب جا کر دروازے کو دھکیلا وہ اندر سے بند تھا۔ یہ ایک سنسان گلی تھی۔ ارد گرد کوئی نہیں تھا۔ بیرونی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں نے تمام اندیشوں کو بالائے طاق رکھا اور دیوار پھاند کر اندر چلا گیا۔ ایک تنگ زینے کے ذریعے میں کنول کے فلیٹ میں پہنچا تو اندر زبردست بحثا بحثی ہو رہی تھی۔ میں اس کمرے میں دبک گیا جہاں کل وڈے سائیں نے کنول کو پیسے دیئے تھے۔ یوں اس کمرے میں چھپ کر بیٹھنا ایک خطرناک کام تھا لیکن ایسے معاملوں میں رسک تو لینا ہی پڑتا ہے۔ ایک کھڑکی کا پردہ سرکا کر میں نے ساتھ والے کمرے میں جھانکا تو ڈرامائی منظر نظر آیا۔ کالی چادر میں بیگم رئیسہ کالی ماتا کی طرح غضب ناک نظر آ رہی تھی۔ اس کی آواز پورے فلیٹ میں گونج رہی تھی۔ وہ کنول سے مخاطب تھی۔

''ٹکڑے کر دینے چاہئیں تیرے جیسی بیٹی کے۔ کلموہی! تجھے کیا پتہ کتنے دکھ جھیل کر میں نے پالا ہے تمہیں۔ کیسے کیسے صدمے سہے ہیں۔ میں کہتی تھی میری بیٹی ایئر ہوسٹس بنے گی۔ عزت پائے گی، نام پیدا کرے گی۔ یہ پتہ نہیں تھا ماں کے منہ پر کالک مل کر گھر سے بھاگ جائے گی اور ٹکے ٹکے پر بکتی پھرے گی۔ حرام زادی اگر بکنا ہی تھا تو میرے پاس رہتی۔ میں تجھے بیچتی اور تجھے پتہ چلتا خریدا کیسے جاتا ہے۔''

کنول زہرخند سے بولی۔ ''یہ آخری بات تیرے منہ سے خوب نکلی ہے ماں...... تیرے منہ پر سجتی بھی ایسی ہی بات ہے...... کس نے ایئر ہوسٹس بننا تھا اور کس نے بنانا تھا یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ میں نے بھی وہی کچھ کرنا تھا جو باجیاں کر رہی ہیں اور جب دھندا کرنا ہی ٹھہرا تو پھر کیوں نہ میں خود سے کروں۔ کیوں تیری محکوم بنی رہوں اور دھیلے دھیلے کے لئے تیری طرف دیکھوں۔ میں بچی نہیں ہوں۔ سوچ سمجھ سکتی ہوں۔ اپنا اچھا بُرا جانتی ہوں۔''

بیگم رئیسہ غرا کر بولی۔ ''ہاں۔ تُو بچی نہیں ہے لیکن تجھے جوان کس نے کیا ہے؟ میں نے...... اور تیری بہنوں نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر تیری پرورش کی ہے۔ تجھے اچھے سکولوں میں پڑھایا ہے۔ تجھے ہر آسائش دی ہے اور اس کے بدلے کیا دیا ہے تُو نے ہمیں۔ بدنامی اور در در کے دھکے۔''

کنول نے کہا۔ ''ماں! تم دھکے میرے لئے نہیں اس رقم کے لئے کھاتی ہو، جو تم نے میرے اوپر لگائی ہوئی ہے۔ ایک ایک پائی کا حساب رکھا ہوا ہے تم نے۔ میں بھی تمہارا کوئی احسان نہیں لوں گی۔'' وہ تیزی سے الماری کی طرف بڑھی۔ چابی نکال کر کوئی دروازہ کھولا اور نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر ماں کی طرف بڑھا دی۔ ''یہ لو..... دس ہزار ہیں۔ چار پانچ ماہ بعد اتنے ہی اور لے لینا۔ میرا خیال ہے تمہارا گھر پورا ہو جائے گا۔''

بیگم رئیسہ حیرت سے نوٹوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ کنول اسے اتنی بڑی رقم پیش کرے گی۔ اس وقت کا دس ہزار آج کے چار لاکھ سے کم نہیں تھا۔ بیگم رئیسہ کی آنکھوں میں ان نوٹوں کے لئے بھوک نظر آ رہی تھی لیکن چہرے پر ہچکچاہٹ تھی۔ لگتا تھا بیگم رئیسہ کی مالی حالت ان دنوں کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر نوٹ کنول کی طرف واپس دھکیل دیئے۔ ''نہیں نہیں کنول! مجھے نہیں چاہئیں تیرے یہ نوٹ۔ یہ نوٹ میری آنکھوں کو ٹھنڈک نہیں دے سکتے۔ مجھے ان کی نہیں... تیری ضرورت ہے۔''

بیگم رئیسہ کے لہجے سے غصے کی جگہ اب عیاری جھلکنے لگی تھی۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ بیٹی ''کماؤ'' ہے۔ اس سے دور رہ کر بھی وہ اچھا خاصا مال بنا رہی ہے۔ جب اس کے سایہ شفقت میں آ جائے گی تو نوٹوں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لئے اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ (آخر ماں کس کی تھی)

''بیٹی! تجھے کیا پتہ تیرے بعد تیری ماں پر کیا گزرتی رہی ہے۔ تُو نے تو ان آٹھ مہینوں میں پلٹ کر خبر نہ لی اور وہاں مجھ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹتے رہے۔ تیری بڑی باجی طائفے کے ساتھ کینیڈا گئی تھی۔ وہاں سے واپسی پر کسی نے اس کے اٹیچی میں حشیش رکھ دی۔ کراچی ہوائی اڈے پر وہ پکڑی گئی۔ چھ مہینے سے اندر ہے۔ اس کے مقدمے پر روپیہ پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔ کئی ہزار کا قرض لے چکی ہوں۔ بُرے وقت میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ فیشن ہاؤس کی بلڈنگ سانگھڑ والے پیر بخش صاحب کی تھی۔ دو مہینے ہوئے انہوں نے وہ بلڈنگ خالی کرا لی ہے۔ اب تین کمرے کے چھوٹے سے مکان میں پڑے ہوئے ہیں۔ جس دن سے مکان بدلا ہے اسی روز سے رفعت بیمار ہے۔ کلب والوں نے نئی ڈانسر رکھ لی ہے۔ کلب سے جو تھوڑی بہت آمدن تھی وہ بھی ختم ہو گئی ہے۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی کیا کروں؟ میری بنو۔ میرے لئے تو دو روٹیاں اور ایک چھوٹی سی کٹیا بہت ہے۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں، تمہارے لئے ہی کر رہی ہوں ناں۔ میں تمہیں سکھی اور خوشحال دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے

تمہارے پیسوں کی ضرورت نہیں۔ مجھے بس تم تینوں کی خوشی عزیز ہے......"

کسی تجربہ کار نائیکہ کی طرح بیگم رئیسہ بیٹی کو قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ بھی رئیسہ کی بیٹی تھی۔ اُڑتے پرندوں پر ڈورے ڈالتی تھی۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ماں کی اداکاری کا زیادہ اثر نہیں لے رہی۔ ملکہ جذبات بیگم رئیسہ کافی دیر اپنے ترکش کے تیر چلاتی رہی لیکن بیٹی ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اتنے میں ٹیلی فون آ گیا۔ کنول اپنے دلکش جسم کو ہلکورا دے کر اٹھی اور فون سننے لگی۔ گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ سیٹھ للت کا فون ہے۔ وہ اعجازی کی کسی حرکت سے بہت پریشان تھا اور کنول کو فیکٹری بلا رہا تھا۔ کنول اسے تسلیاں دے رہی تھی۔

"آپ ناراض نہ ہوں سیٹھ جی...... بالکل بے فکر رہیں۔ میں اسے سنبھال لوں گی۔ آج میں ملوں گی اس سے۔ کوئی اور گھنٹا نہیں ہوگی...... وہ مان جائے گا میری بات۔" سیٹھ کو تسلی تشفی دے کر کنول نے فون بند کر دیا۔ پھر کاروباری لہجے میں ماں سے بولی۔

"ماں۔ ایک مہمان نے آنا تھا۔"

"کس مہمان نے؟"

"جیسے مہمان ہمارے، ہاں آیا کرتے ہیں۔" کنول نے ترت جواب دیا۔ "اگر کوئی بات کرنے کی رہ گئی ہو تو پھر کسی وقت آ جانا۔ میرے دروازے تمہارے لئے کھلے ہیں۔"

بیگم رئیسہ نے "کماؤ بیٹی" کے چہرے پر سختی محسوس کی تو بولی۔ "اچھا تو کہتی ہے تو چلی جاتی ہوں، لیکن یہ میں ہی جانتی ہوں کل تک کا وقت کیسے گزاروں گی۔"

"کل نہیں پرسوں...... کل میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔" کنول نے بے رخی سے کہا۔

بیگم رئیسہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اٹھتے اٹھتے اس نے ایک بار پھر للچائی نظروں سے نوٹوں کی گڈی کو تاڑا لیکن اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ وہ بہت گہری عورت تھی۔ معمولی فائدے کے لئے وہ بے بہا فائدے کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ کرپان والا خطرناک صورت سکھ اس تمام گفتگو کے دوران کمرے کے ایک گوشے میں خاموش کھڑا رہا۔ بیگم رئیسہ کمرے سے نکل گئی تو کنول نے ماں کو سنا کر اونچی آواز میں سکھ سے کہا۔

"رنگوار سنگھ! یہ پیسے اٹھا کر ماں کو دے دو۔"

سکھ باہر نکلتے نکلتے واپس مڑا اور رقم اٹھا کر لے گیا۔

وہ دونوں چلے گئے تو کنول نے ملازمہ سے کہا کہ وہ دروازہ اندر سے بند کر دے۔ ملازمہ دروازہ بند کرنے چلی گئی اور کنول ناک سے سُوں سُوں کی آواز نکالتی اس کمرے میں

چلی گئی جہاں میں چھپا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ مجھے باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ میں نے خود کو ایک الماری کی اوٹ میں کر لیا لیکن یہ اوٹ بالکل ناکافی تھی۔ کنول مجھ سے صرف ایک گز کے فاصلے پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کمر صوفے کی پشت سے ٹکائی اور آنکھوں پر بازو رکھ کر زار و قطار رونے لگی۔ تاریکی کے سبب وہ مجھے دیکھ نہیں سکی تھی۔ لہٰذا میں آج پہلی بار اس کا اصلی رونا دیکھ رہا تھا۔ دو تین منٹ تک ہچکیوں سے رونے کے بعد اچانک اسے احساس ہوا کہ کوئی کمرے میں موجود ہے۔ اس نے سنبھل کر پورے غور سے الماری کی طرف دیکھا۔ میں سینے پر ہاتھ باندھے دیوار سے کندھا ٹکائے بااطمینان کھڑا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی۔

"تت...... تم...... نواز...... کب آئے؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "بہت دیر ہوئی۔"

"کک...... کتنی دیر؟"

"قریباً پون گھنٹہ...... تمہاری مرحومہ والدہ صاحبہ کے ساتھ ہی یہاں آیا تھا۔"

میرے انکشاف پر کنول کا چہرہ زرد ہوا۔ پھر اس زردی کی جگہ غصے کی سرخی نے لے لی۔ وہ خود سری سے بولی۔ "نواز...... تم...... بغیر اجازت کیوں اندر آئے؟"

"تمہیں کسی حادثے سے بچانے کے لئے۔ میں نے تمہارے فلیٹ کے سامنے کار کو رکتے اور مسلح لوگوں کو اندر آتے دیکھا تھا۔ میں نے عقبی سیڑھیاں استعمال کیں اور اس کمرے میں آ گیا۔"

"لیکن دروازہ تو بند تھا۔"

"نہیں کھلا ہوا تھا۔" میں نے بے ضرر جھوٹ بولا۔

وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ چہرہ رونے کی وجہ سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ عجیب سی آواز نکال کر بولی۔ "اس کا مطلب ہے تم نے سب سن لیا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

ایک لمحے کے لئے لگا کہ وہ مجھ پر جھپٹ پڑے گی اور خونخوار بلی کی طرح منہ نوچ لے گی۔ مگر پھر اس نے خود پر قابو پایا اور گہری سانس لے کر بولی۔ "تم خطرناک آدمی ہو نواز خان۔"

میں نے کہا۔ "میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہے لیکن اگر میں ایسا ہوں بھی تو صرف مجرموں کے لئے۔"

☆======☆======☆

تھوڑی دیر بعد ہم ایک کمرے میں صوفے پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ آج پہلی بار مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کنول مجھ سے جھوٹ نہیں بولے گی۔ اس احساس کی ایک وجہ یہ تھی کہ آج کنول نے سچ بولنے کی ایک بہت بڑی قسم کھائی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ اس قسم کو توڑ نہیں سکے گی۔ یہ قسم کھانے کے بعد کنول کی آنکھوں کے شیشے بالکل صاف و شفاف ہو گئے تھے اور ان کے آر پار دور تک نظر آ رہا تھا۔ کنول نے کہا۔

''نواز صاحب! میں بچپن سے ضدی ہوں۔ نوعمری میں میری شرارتیں بھی اسی ضد کا نتیجہ تھیں۔ میں اپنے گھر میں اجنبی مردوں کے قہقہے سنتی تھی اور اپنی باجیوں کے ٹھاٹ باٹ دیکھتی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر میرے اندر بھی اپنا آپ منوانے کی خواہش پیدا ہوئی اور میں گھر سے نکل بھاگی۔ میں نے چند ماہ میں درجنوں مردوں کو بے وقوف بنایا اور ان کی بے وقوفی سے لطف اٹھایا لیکن اپنی ہوشیاری اور ذہانت کے سبب میں نے اپنی عزت کبھی داؤ پر نہیں لگنے دی اور ایسی صورتِ حال پیدا ہونے سے پہلے ہی نیا ٹھکانہ ڈھونڈ لیا۔ میرا یہ شغل درحقیقت اس نفرت کا اظہار تھا جو مجھے اپنی ماں اور بہنوں کے پیشے سے تھی۔ مردوں کی للچائی ہوئی نظروں کو ناکام بنانے اور انہیں کنارے پر لا کر پیاسا رکھنے میں مجھے سکون ملتا تھا۔

میں مسلسل دو ڈھائی برس تک اسی کام میں مصروف رہی۔ میں بہت مطمئن تھی لیکن دل میں ایک کانٹا سا چبھا ہوا تھا۔ یہ ''پہلی محبت'' کا کانٹا تھا۔ دن بدن مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ واقعی عورت کی زندگی میں ایک مرد ایسا ضرور آتا ہے جو اس کے دل کے تار چھیڑتا ہے اور ایک نہ ختم ہونے والی بازگشت چھوڑ جاتا ہے۔ عموماً یہ وہی مرد ہوتا ہے جو پہلی بار عورت کی زندگی میں آتا ہے۔ میری زندگی میں آنے والا یہ مرد قاری حفیظ تھا۔ میں نکاح سے تھوڑی دیر پہلے قاری حفیظ کی سیج سے اٹھ کر بھاگ گئی تھی اور پھر مدت تک میں نے انہیں اپنی صورت نہیں دکھائی۔ دو ڈھائی برس میں اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتی رہی لیکن جہاں بھی گئی پہلی محبت کا یہ کانٹا میرے دل پر ترازو رہا۔ میں نہایت دولت مند، خوبصورت اور شاطر مردوں کو چٹکیوں میں اُڑا دیتی تھی لیکن جب رات کو بستر پر تنہا ہوتی تھی تو ایک سیدھے سادے خاموش طبع غریب شخص کی یاد مجھے گھیر لیتی تھی اور بے بس کر دیتی تھی۔ میری ماں اور بہنیں مجھے اپنے راستے پر رواں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ میری نتھ اُتروا کر اپنے بٹوؤں اور میرے بستر کی بے رونقی کو ختم کرنے کی آرزومند تھیں لیکن مجھے ان نصیحتوں

سے وحشت ہوتی تھی۔ میں ان کے کہنے پر کلب میں تو ناچ گا لیتی تھی مگر رات کی تنہائی میں کسی خریدار مرد کے اشاروں پر ''ناچنا'' مجھے منظور نہیں تھا۔ اس مسئلے پر ماں اور بہنوں کے ساتھ میری کئی لڑائیاں بھی ہوئیں۔ یہاں تک کہ مجھے مارا پیٹا گیا۔ کمرے میں قید کیا گیا اور اذیت پہنچائی گئی۔ آخر ایک روز میں کراچی میں ماں کے ''فیشن ہاؤس'' سے بھاگ نکلی۔

میں ملتان پہنچی اور وہاں ایک غیر ملکی کے ہوٹل میں ڈانس کرنے لگی۔ یہیں پر میری ملاقات ملک جی سے ہوئی اور وہ عورتوں کا رسیا مجھ پر نوازشوں کی بارش کرنے لگا۔ میں ڈھائی تین ماہ ملتان میں رہی۔ اس دوران آہستہ آہستہ میرے اندر ایک زبردست تبدیلی آ گئی۔ مجھے ناچ گانے اور ملک جی جیسے ہوس کاروں سے مرنے کی حد تک نفرت ہو گئی۔ برائی کے ہر کام سے میرا دل اچاٹ ہو گیا اور میرے دل و دماغ پر اس شخص کی تصویر روشن ہوتی چلی گئی جس کی سیج سے میں ڈھائی برس پہلے اٹھ بھاگی تھی اور اس کے نیک چہرے پر رسوائی کی کالک مل آئی تھی۔ ایک روز میں ملتان سے میانوالی پہنچی اور قاری حفیظ کو ڈھونڈتی ڈھونڈتی امرتسر آ گئی۔ قاری صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے اپنے مقدر پر فخر کیا اور یہ سمجھنے لگی کہ میری برباد زندگی کا رخ بدلنے والا ہے۔ میں نے قاری صاحب کو اپنانے کی خاطر ایک آخری جھوٹ کا سہارا لیا اور انہیں بتایا کہ میری ماں اور بہنیں مر چکی ہیں اور اب مجھ بے آسرا کو ان کے سہارے کی ضرورت ہے۔ قاری صاحب آنکھوں والے شخص ہیں انہوں نے محسوس کر لیا کہ میں پچھلے گناہوں سے تائب ہو چکی ہوں اور اب سچے دل سے شرافت کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے مجھ سے شادی کر لی اور ہم امرتسر میں تمہارے تھانے کے پاس اطمینان و سکون کے دن گزارنے لگے لیکن یہ اطمینان و سکون دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ میں بھول چکی تھی کہ بدنام عورت کے لئے شریفوں کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہوتی اور نہ اس کی ''توبہ'' کے لئے آسمانوں پر۔ جیسے اس کی توبہ فضاؤں میں بھٹکتی رہتی ہے، ویسے ہی اس کی شرافت بھی گلی گلی خوار ہوتی ہے۔ میری ماں اور بہنوں نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔ ان کا ایک ہرکارہ اس مکان تک پہنچ گیا جہاں میں قاری صاحب کے ساتھ رہتی تھی۔ ہمارے گھر کے سامنے تھڑے پر بیٹھا رہنے والا شخص وہی غنڈہ تھا۔ وہ ایک نہایت خبیث شخص تھا اور اس نے میری جیسی لڑکیوں کے پَر اس طرح کاٹے تھے کہ وہ ساری زندگی خاک میں پھڑ پھڑاتی رہی تھیں، لیکن وہ ظالم بدکار شخص میرے ساتھ بہت بڑی نیکی کر گیا۔

ایک روز اس نے میرے گھر میں ایک خط پھینکا۔ اس خط میں اس نے بتایا کہ بیگم رئیسہ نے مجھے کراچی واپس لے جانے اور قاری حفیظ کو ذلیل و خوار کر کے جیل میں سڑانے کا

منصوبہ تیار کرلیا ہے۔ اگر میں قاری صاحب کو ذلت اور رسوائی سے بچانا چاہتی ہوں تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔ قاری صاحب کو چھوڑ کر خاموشی سے نکل جاؤں۔ میں نے اپنی ماں اور بہنوں کے منصوبے پر غور کیا، ان کے اثر و رسوخ کا اندازہ لگایا اور آخر اس نتیجے پر پہنچی کہ انہوں نے میرا سراغ لگالیا ہے تو اب چین سے نہیں بیٹھنے دیں گی۔ میں جہاں جہاں جاؤں گی وہ میرے پیچھے آئیں گی اور میری زندگی کو بدتر سے بدتر بناتی چلی جائیں گی۔ میرے ساتھ ساتھ وہ شخص بھی ذلیل و رسوا ہوگا جو شرافت کا پتلا ہے اور جو کسی سے اونچی آواز میں بات بھی نہیں کرتا۔ آخر میں نے ''قاری صاحب کے لئے'' قاری صاحب کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ پورے آٹھ پہر میں رو رو کر اپنی قسمت کا ماتم کرتی رہی اور پھر عید کے پُرمسرت تہوار سے ایک روز پہلے قاری صاحب کا گھر چھوڑ آئی۔ وہ گھر میری جنت تھا۔ اس جنت سے نکلتے ہوئے مجھ پر جو بیتی وہ میں ہی جانتی ہوں۔ ایک چھوٹا سا قدم اٹھا کر میں نے قاری صاحب کی دہلیز پار کرلی۔ بظاہر یہ ایک چھوٹا سا قدم تھا لیکن میری زندگی کے لئے بہت بڑا قدم تھا۔ میری زندگی ایک بار پھر طوفانوں کے حوالے ہو چکی تھی۔ میری اس تباہی کی ذمے دار میری ماں اور بہنیں تھیں۔ وہ مجھے اپنے گھناؤنے راستے پر چلانے میں کامیاب رہی تھیں۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں اس راستے پر چلوں گی اور اس پر چل کر ان سے یادگار انتقام لوں گی......اور میں اپنے ارادوں میں بہت حد تک کامیاب ہو چکی ہوں۔''

میں پوری محویت سے کنول کی رُوداد سن رہا تھا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھوں میں آگ سی بھڑکی ہوئی تھی۔ بڑی بے تکلفی سے اس نے ایک مہنگا سگریٹ نکال کر سلگایا اور دھواں فضا میں چھوڑ کر بولی۔ ''تم سب کچھ سن چکے ہو۔ میری ماں جسے ماں کہتے ہوئے شرم آتی ہے میری بڑی بہن کی گرفتاری کا رونا رو رہی تھی۔ معلوم ہے اسے سلاخوں کے پیچھے پہنچانے والا کون ہے؟''

''کون ہے؟''

''جگدیش سیٹھی۔ میری ہی مخبری پر اس نے بڑی باجی کو رنگے ہاتھوں پکڑوایا تھا۔ میرا خیال ہے تم یہ بات اپنے تک رکھو گے، لیکن نہ بھی رکھو تو کوئی بات نہیں۔ تم یا کوئی دوسرا کبھی یہ بات ثابت نہیں کرسکتا کہ جمیلہ کی گرفتاری میں میرا ہاتھ ہے۔ دو سال پہلے تک میری عمر کچی ضرور تھی مگر کچے کام میں اس وقت بھی نہیں کیا کرتی تھی۔ اب تو بے رحم دنیا نے ہر بل فریب میری گھٹی میں ڈال دیا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کراچی والا فیشن ہاؤس خالی ہونے میں بھی تمہارا ہاتھ ہے؟''

''ہاں۔'' وہ عجیب جذباتی لہجے میں بولی۔ ''جو شخص فیشن ہاؤس کی عمارت کا مالک تھا، اب میں اس کے دل کی مالک ہوں۔ جو چاہوں اس سے کراسکتی ہوں۔ وہ سانگھڑ سے چل کر یہاں میری دہلیز پر آتا ہے اور میرے پاس دو گھڑی بیٹھ کر فخر محسوس کرتا ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ یہ وہی شخص ہے جسے کل دوسرے کمرے میں ''شربت دیدار'' پلایا گیا تھا۔ کنول اسے وڈا سائیں کہہ رہی تھی اور رئیسہ نے اس کا نام پیر بخش لیا تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں پتہ چلا پیر بخش عرف وڈا سائیں کراچی میں کنول کی دونوں بہنوں کا زبردست پرستار تھا۔ خاص طور پر منجھلی بہن پر تو وہ جان چھڑکتا تھا اور ماہانہ ہزاروں روپے اس پر قربان کرتا تھا۔ کنول نے اپنے نوخیز شباب کا جادو چلا کر بڑی فراست سے پیر بخش کو اپنا گرویدہ کرلیا تھا۔ یوں بیگم رئیسہ کے لئے آمدن کا سب سے بڑا ذریعہ اچانک ختم ہوگیا تھا۔ کنول نے یہاں پر ہی بس نہیں کی تھی وہ ان دونوں کلبوں میں بھی رقص کرنے کا ارادہ رکھتی تھی جہاں اس سے پہلے دونوں بڑی بہنوں کے نام کی بجلیاں چمکتی تھیں اور بیگم رئیسہ کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ رفعت کی بیماری کے بعد اس نے دونوں کلبوں سے معاہدہ کرلیا تھا اور اب جلد ہی وہاں رقص کا آغاز کرنے والی تھی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے کنول کے جسم کا سارا خون اس کے سر کو چڑھا ہوا ہے۔ جیسے آدمی بخار میں الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے وہ بھی بلا تکان بولے جارہی تھی۔ کہنے لگی۔

''نواز خان! بے شمار مردوں سے میرا واسطہ رہا ہے اور میں ان میں سے کئی ایک کی چھت کے نیچے بھی رہی ہوں لیکن یہ جان کر تمہیں حیرانی ہوگی کہ قاری صاحب سے شادی تک کسی ایک شخص کا ہاتھ بھی میری عزت تک نہ پہنچ پایا تھا۔ قاری صاحب کی زندگی سے نکلنے کے بعد بھی صرف دو مرد مجھ تک پہنچ پائے ہیں۔ ایک اعجازی اور دوسرا جگدیش سیٹھی......وہی تمہارا اصول پسند افسر لیکن اب میں جس زندگی کا آغاز کرنے جارہی ہوں اس میں ہر رات ایک ''نئے دولہے'' کے قدموں کی چاپ سنوں گی اور ہر صبح چہرے پر بیوگی کی پھٹکار لے کر اٹھوں گی۔ مجھے اس حال تک پہنچانے والا کون ہے نواز خان؟...... مجھے اس حال تک پہنچانے والی میری ماں ہے اور ماں جائیاں ہیں۔ میں انہیں کیسے معاف کرسکتی ہوں۔ جو شعلے مجھے چاٹنے والے ہیں میں ان کی تپش ان کے جسموں تک بھی پہنچاؤں گی۔''

وہ بڑی ادیبانہ اردو بول رہی تھی اور مناسب جگہوں پر انگریزی کے الفاظ بھی استعمال کرتی جارہی تھی۔

میں اسے کچھ نصیحت کرنا چاہتا تھا لیکن اس وقت وہ بہت بھڑکی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا

میرا لیکچر رائیگاں جائے گا۔ کچھ دیر اس کی جوشیلی باتیں سننے کے بعد میں وہاں سے اٹھ آیا۔

☆======☆======☆

میں جانتا تھا کنول نے مجھے اپنے بارے میں آج جو کچھ بتایا ہے وہ سو فیصدی سچ ہے۔ اس نے اپنے محبوب ترین شخص کی قسم کھا کر کہا تھا کہ آج وہ جو کہے گی سچ کہے گی۔ قارئین سمجھ گئے ہوں گے۔ میرا اشارہ قاری حفیظ کی طرف ہے۔ وہ قاری حفیظ کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی۔ وہ انوکھی لڑکی تھی۔ اس نے پیار بھی انوکھا کیا تھا۔ وجیہہ اور فیشن ایبل پرستاروں کو چھوڑ کر ایک خاموش طبع، مذہبی نوجوان کو دل کی گہرائیوں میں اتار لیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ لاکھ بُری سہی اس کے اندر کہیں گہرائی میں نیکی کی روشنی موجود ہے۔ حالات کی تاریکی میں یہ روشنی دب گئی ہے لیکن ختم نہیں ہوئی۔ میرا دل کہتا تھا کہ اگر کوشش کی جائے تو وہ خطرناک راستوں سے واپس پلٹ سکتی ہے۔

میں کچھ وقت نکال کر کنول کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن اگلے چھ سات روز اتنا مصروف رہا کہ یہ کام نہ کر سکا۔ ایک روز میں کمرے میں بیٹھا ایک فائل دیکھ رہا تھا کہ بلال شاہ آ دھمکا۔ وہ آج کل مجھ سے کچھ ناراض تھا۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ اس کی ناراضگی کنول کی وجہ سے ہے۔ جہاں کوئی عورت اچھی یا بُری نیت سے میرے قریب آتی تھی۔ بلال شاہ کا منہ ٹیڑھا ہونا شروع ہو جاتا تھا۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ چند روز پہلے بلال شاہ، کنول کے فلیٹ پر جا دھمکا تھا اور اسے سمجھانے بیٹھ گیا تھا کہ وہ میرا پیچھا چھوڑ دے ورنہ میرے گھر میں زبردست جنگ شروع ہو جائے گی اور والدین مجھے عاق کر دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ کنول جیسی جہاندیدہ لڑکی پر بھلا ایسی باتوں کا کیا اثر ہوتا' اس نے بلال کو کھری کھری سنا کر واپس بھیج دیا تھا۔ بلکہ بعض اطلاعات کے مطابق اپنا کتا بھی اس پر چھوڑ دیا تھا۔ بس اسی روز سے بلال شاہ نے بول چال بند کر رکھی تھی۔ آج وہ میرے سامنے آیا تھا تو یقیناً کوئی خاص اطلاع تھی۔

طنزیہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''خان صاحب! میں کہتا تھا ناں، وہ اسی کنجر خانے میں جائے گی جہاں کی پیدائش ہے۔ کل چلی گئی ناں......''

''کون چلی گئی؟''

''وہی کنول بی بی۔''

''تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''جیسے میں آپ کے لئے مخبری کرتا ہوں، ویسے کچھ لوگ میرے لئے بھی کرتے

ہیں۔'' وہ زیر لب مسکرایا۔

میں نے اسی وقت فون اٹھایا اور فلیٹ کے نمبر ملائے۔ دوسری جانب سے کنول کی ملازمہ بولی۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ کنول فلیٹ میں ہی ہے۔ بلال شاہ کی اطلاع غلط ثابت ہوئی تھی لیکن دال میں کچھ کالا نظر آ رہا تھا۔ میں نے بلال شاہ کو کچھ نہیں بتایا اور فوراً ہی اٹھ کر فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

قریباً نصف گھنٹے بعد میری موٹر سائیکل فلیٹ کے سامنے رکی اور میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ فلیٹ کے سامنے ہی ایک شاندار مرسڈیز کار کھڑی تھی اور اس میں ایک باوردی ڈرائیور بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ مجھے شک گزرا کہ یہ گاڑی وڈے سائیں کی ہے۔ میں اندر کمرے میں پہنچا تو کنول ایک صوفے پر اوندھی لیٹی رو رہی تھی۔ اس کے گرد جو سامان بکھرا ہوا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کہیں جانے کے لئے تیار ہے۔ غالباً بلال شاہ کی اطلاع درست تھی۔ کنول کل جانے کا ارادہ کر چکی تھی لیکن پھر کسی وجہ سے رک گئی تھی۔ مجھے اپنے قریب پا کر اس کے رونے میں اور تیزی آ گئی۔ وہ کافی دیر ہچکیاں لیتی رہی پھر آزردگی سے بولی۔

''نواز خان! تم ہی بتاؤ۔ میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی۔''

......میں سمجھ گیا کہ یہ کنول کے اندر کی ''نیکی'' بول رہی ہے۔ برائی کا راستہ اس کے سامنے ہے۔ وہ اس راستے پر چلنے کی پوری پوری قدرت رکھتی ہے۔ ماں اور بہنوں سے عبرتناک انتقام لینے کا خواب بھی پورا کر سکتی ہے، مگر اس کے جھوٹے جسم میں دبی ہوئی سچائی اس کا راستہ روک رہی ہے۔ میں نے قریب بیٹھ کر کنول کا چہرہ ہاتھوں میں لیا اور محبت سے کہا۔

''کنول واپس آ جاؤ۔''

''کس لئے واپس آ جاؤں؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''اپنے شوہر کے لئے۔''

''میں ان کے لئے مر چکی ہوں۔ زندگی بھر انہیں اپنی صورت نہیں دکھاؤں گی۔''

میں نے کہا۔ ''تم انگریزی بہت اچھی بول لیتی ہو۔ انگریزی کا ایک مقولہ ہے کہ جو کام جس وقت بھی شروع کر لیا جائے ٹھیک ہے۔ تم بھی اپنی نئی زندگی کی ابتدا آج سے کر سکتی ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر تم نے مضبوط ارادہ کر لیا تو ہر رکاوٹ دور ہو جائے گی۔''

وہ بولی۔ ''نہیں نواز خان۔ میں اس فرشتے کے قابل نہیں۔ میں بہت بُری عورت ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''تم بُری نہیں ہو۔ کل رات سے جو کار نیچے کھڑی تمہارا انتظار کر رہی ہے اور یہ سامان جو تمہارے اردگرد بکھرا ہوا ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ تمہارے اندر کش مکش ہے۔ تم ایسی عورت بننا نہیں چاہتی جو نوٹوں کی سیج پر بیٹھ کر ہر رات ایک نئے دولہے کی چاپ سنتی ہو......''

میں کنول کے پاس بیٹھا بہت جذباتی انداز میں اور بہت دیر تک اسے سمجھاتا رہا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ آخر میں اس کے پاس سے اٹھ آیا۔ میں جو اونچ نیچ اسے سمجھا سکتا تھا سمجھا دی تھی۔ اب آخری فیصلہ اسی کو کرنا تھا۔ جب میں کنول کے پاس سے واپس آیا مجھے کچھ معلوم نہیں تھا وہ کیا فیصلہ کرے گی۔ وہ ایسی لڑکی تھی کہ کوئی فیصلہ بھی کر سکتی تھی۔ اس کے بارے میں پیش گوئی کرنا ناممکن تھا۔ ہوسکتا تھا کہ وہ کل وڈے سائیں کی بھیجی ہوئی کار میں بیٹھ کر کراچی چلی جائے اور ماں کے فیشن ہاؤس پر قبضہ کر کے ناچ گانے کی دنیا میں دھومیں مچانے لگے اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ واپس پلٹ آئے اور اس کے واپس پلٹنے سے کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ ٹوٹے رشتے جڑ جائیں۔ ان دونوں امکانات کے درمیان بھی بہت سے امکان تھے۔ کئی راستے نکلتے تھے اور کئی صورتیں پیدا ہوتی تھیں......لیکن فلیٹ سے واپس آنے کے صرف تین گھنٹے بعد یعنی رات نو بجے مجھے جو خبر ملی وہ خاصی حیران کن تھی۔ معلوم ہوا کہ کنول کسی کو بتائے بغیر ایک بار پھر اپنے فلیٹ سے غائب ہوگئی ہے۔ اس نے گھر سے نکلنے کے لئے عقبی راستہ استعمال کیا تھا اور فلیٹ کے سامنے انتظار کرتی ہوئی مرسڈیز کار کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

☆======☆======☆

قریباً تین ماہ اور گزر گئے۔ کنول کا کوئی کھوج کھرا نہیں ملا۔ جن لوگوں سے کنول کا تعلق واسطہ تھا وہ اس کی تلاش میں دربدر بھٹکتے رہے۔ سیٹھ للت چندر، اعجازی کی دست درازیوں سے بچنے کے لئے بھٹکتا رہا۔ بیگم رئیسہ اپنی گری ہوئی ساکھ کو سنبھالا دینے کے لئے بھٹکتی رہی، وڈا سائیں اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لئے اسے تلاش کرتا رہا اور ملک جی کے کارندے اپنی رسوائی کا انتقام لینے کے لئے اس کی ٹوہ میں رہے لیکن وہ کسی کے ہاتھ نہیں آئی۔ وہ ایک ایسے خواب کی طرح تھی جو ایک ہی رات کئی لوگوں نے ایک ساتھ دیکھا تھا۔ اب وہ دن کی روشنی میں اس کی تعبیر ڈھونڈتے پھر رہے تھے......مگر تعبیر کہیں نہیں تھی۔

ایک روز تھانے کے پتے پر مجھے ایک چھوٹا سا پارسل اور رجسٹری خط موصول ہوا۔ یہ دونوں اشیاء برمنگھم، انگلستان سے آئی تھیں۔ بھیجنے والے کا نام پڑھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ چیزیں کنول نے بھیجی تھیں۔ میں نے جلدی سے لفافہ کھول کر خط نکالا۔ لکھا تھا۔

''ڈیئر نواز خان! میں تم لوگوں کی دنیا سے بہت دور آگئی ہوں۔ یہاں ایک چھوٹی سی گلی کے چھوٹے سے سٹور میں سیلز گرل ہوں۔ میرے چاروں طرف اجنبی چہرے اور اداسیاں ہیں لیکن یہ اداسیاں مجھے بھاتی ہیں کیونکہ ان اداسیوں میں ایک رات کے دولہوں کی مکروہ چاپ نہیں۔ خدا کرے یہ اداسیاں کبھی مجھ سے جدا نہ ہوں۔ تمہیں ایک انگوٹھی بھیج رہی ہوں۔ یہ قاری صاحب نے مجھے منہ دکھائی کے موقع پر دی تھی۔ سنا ہے دس تاریخ کو قاری صاحب کی شادی ہے۔ میری طرف سے یہ انگوٹھی دلہن کو تحفے میں دے دینا۔ اس انگوٹھی پر اب اسی کا حق ہے۔ ایک آخری پیغام قاری صاحب کے لئے ہے۔ پتہ نہیں تم یہ پیغام پہنچا سکو گے یا نہیں......اگر پہنچا سکو تو کہہ دینا، قاری صاحب! کنول آپ سے محبت کرتی تھی۔

ہمیشہ کے لئے خدا حافظ۔''

☆======ختم شد======☆